دو ہجرتوں کے اہلِ قلم

پروفیسر ہارون الرشید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دو ہجرتوں کے اہلِ قلم

پروفیسر ہارون الرشید

میڈیا گرافکس، کراچی

دو ہجرتوں کے اہلِ قلم

پروفیسر ہارون الرشید

سالِ اشاعت: ۲۰۱۳ء

کمپوزنگ: میڈیا گرافکس، کراچی

سرورق: سونیا

طابع: احمد برادرز پرنٹرز، ناظم آباد، کراچی

ناشر: میڈیا گرافکس، ۱-اے-۷، ۹۹، سیکٹر ۱۱-اے، نارتھ کراچی-۷۵۸۵۰

فون: ۳۶۹۸۶۰۹۱

قیمت: ۸۰۰ روپے

دو ہجرتوں کے اہلِ قلم

فہرست

باب سوم۔ نثر نگار ۳۹۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

''دو ہجرتوں کے اہلِ قلم''

ابتدائیہ

''محفل جو اجڑ گئی'' (مطبوعہ ۲۰۰۲ء) میں مرحوم مشرقی پاکستان کی محفلِ شعر و ادب کی روداد پیش کی گئی تھی۔ یہ کتاب تاریخ ادب بھی ہے اور تذکرہ بھی۔ میں نے اس کتاب میں وہاں کے چھوٹے بڑے تمام اہلِ قلم کو سمیٹ لینے کی کوشش کی تھی۔ اختصار کے مدِ نظر اس میں شعرا کے کلام کے نمونے درج نہیں کیے گئے تھے۔ خیال تھا کہ اس کے دوسرے حصے میں ممتاز شعرا کے تفصیلی جائزے کے ساتھ نمونہ کلام بھی پیش کر دیا جائے گا۔ زیرِ نظر کتاب میں اس تفصیلی جائزے کو دو ہجرتوں کے اہلِ قلم تک محدود کر دیا گیا ہے۔

''دو ہجرتوں کے اہلِ قلم'' محض ایک ادبی جائزہ یا اہلِ قلم کا تذکرہ ہی نہیں، اس عہد کی تاریخ بھی ہے اور المیۂ عظیم (سقوطِ ڈھاکا) کو اس کے درست پس منظر میں پیش کرنے کی کوشش بھی۔ اس میں غیر بنگالیوں کے قتلِ عام کی روداد بھی پیش کی گئی ہے، جس کی تاریخِ اسلام میں مثال نہیں ملتی۔ ''محفل جو اجڑ گئی'' اگر ''داستانِ بزم'' تھی تو زیرِ نظر کتاب ''داستانِ رزم'' ہے۔

یہ کتاب ان لٹے پٹے، زخم خوردہ اور دل شکستہ اہلِ قلم کی داستانِ الم ہے جو سقوطِ ڈھاکا کے نتیجے میں دوسری ہجرت پر مجبور ہوئے۔ لیکن اس سرزمین پر ان کی پذیرائی اور دل داری کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ایک درد اور کسک ہے جو ان شعرا و ادبا کے کلام میں مشترک ہے۔ یہ بھی ایک حیرت انگیز بات ہے کہ سابق مشرقی پاکستان میں ان اہلِ قلم نے پانچ، دس سال گزارے ہوں یا بیس

بائیس سال، وہ اس دور کو اپنی ادبی زندگی کا بہترین دور قرار دیتے ہیں۔

اس کتاب کے مضامین کے اندازِ تحریر میں یکسانیت یا ہم آہنگی کی کمی نظر آئے گی۔ تیسرا باب جو نثر نگاروں سے متعلق ہے، سب سے آخر میں ضبطِ تحریر میں آنے کی وجہ سے، اس میں بڑی حد تک ہم آہنگی ہے۔ لیکن بقیہ دو ابواب جو شعرا سے متعلق ہیں، ان کے اکثر مضامین دس، پندرہ برسوں میں وقتاً فوقتاً لکھے گئے۔ بعض کتابوں پر تبصرے تھے جو اختصار کے ساتھ شامل کر لیے گئے۔ تفصیلی تذکرہ انھیں اہلِ قلم کا پیش کیا گیا ہے جو صاحبِ کتاب ہیں۔ باقی شعرا کا صرف نام درج کر دیا گیا ہے، اس لیے کہ ان کا اجمالی تذکرہ "محفلِ جو اُجڑ گئی" میں کیا جا چکا ہے۔ اس کے باوجود جن شعرا کا نمونہ کلام دستیاب ہوا ہے، آخر میں ان کا مختصر ذکر کر دیا گیا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اکثر و بیشتر شعرا نثر نگار بھی ہیں۔ ان میں بعض شعرا اعلیٰ درجے کے ادیب، ناقد اور متعدد کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ لہٰذا ہر شاعر کے تذکرے میں اس کی نثر نگاری کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے۔ اس طرح ان کی دونوں حیثیتوں کی ترجمانی ہو گئی ہے۔ نثر نگاری کے باب میں صرف انھیں ادیبوں کو شامل کیا گیا ہے جو شاعر نہیں۔

زیرِ نظر کتاب ایک ابتدائیہ، ایک مقدمہ، تین ابواب اور ایک اختتامیہ پر مشتمل ہے۔ اسے "محفلِ جو اُجڑ گئی" کا دوسرا حصّہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ امید ہے کہ "محفلِ جو اُجڑ گئی" کی طرح یہ کتاب بھی پسند کی جائے گی اور تاریخ کا ایک حصّہ بن جائے گی۔

محبی اے خیام صاحب، محبی انور فرہاد صاحب، برادرم فرقان ادریسی صاحب، برادرم رضی صدیقی صاحب، برادرم مشرق صدیقی صاحب اور محبی شبیر انصاری صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مواد کی فراہمی میں میری مدد کی۔ جن شعرا نے اپنے مجموعے بھجوائے، ان کا بھی شکر گزار ہوں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبولیتِ عام سے نوازے! آمین۔

الحمد للہ رب العالمین

L-74، سیکٹر 5C/2، نارتھ کراچی۔
فون: 3699 6404

ہارون الرشید
۲۳ نومبر ۲۰۱۱ء

مقدمہ

ایک عظیم المیہ

ایک بے مثل محفلِ شعروادب

وہ بے مثل محفلِ شعروادب جو رنگ و نور کا مجموعہ یا مظہر تھی، اس کے بارے میں راقم نے "محفل جو اجڑ گئی" (مطبوعہ ۲۰۰۲ء) کے دیباچے میں لکھا تھا:

"یہ ایک ایسی محفلِ شعروادب کی داستان ہے جو ۱۴راگست ۱۹۴۷ء کو گل و نغمہ کی سرزمین مشرقی پاکستان میں وجود میں آئی اور صرف ۲۴ سال اپنی رعنائیاں دکھا کر ۱۶ردسمبر ۱۹۷۱ء کو عین عالمِ شباب میں اجڑ گئی۔ جن حضرات کو اس محفل میں شرکت کا موقع نہ مل سکا، وہ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ یہ محفل کتنی بارونق اور کتنی دل کش تھی۔ پورے برِ صغیر سے کھنچ کر کیسے کیسے شاعر، کیسے کیسے ادیب، کیسے کیسے اصحابِ علم و فن یہاں چلے آئے تھے۔ مختلف مسلک و مشرب کے اہلِ قلم کا ایسا حسین اجتماع بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ پروفیسر اقبال عظیم سقوطِ ڈھاکا سے کچھ پہلے (جولائی ۱۹۷۰ء) کراچی آگئے تھے۔ خوش قسمتی سے انھوں نے اس محفل کے اجڑنے کا سماں اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ بہرحال یہاں آنے کے بعد اس کی یاد انھیں تڑپاتی رہی۔ دیکھیے، اپنی ایک نظم "شہرِ ڈھاکا" میں وہ اس محفل کو کس طرح یاد کرتے ہیں:

شہرِ ڈھاکا چھوڑ کر محسوس ہوتا ہے ہمیں
اپنے پیچھے ایک پوری زندگی چھوڑ آئے ہم

عمر بھر یاد آئیں گی وہ بے تکلف محفلیں
جن میں اک بے لوث رسمِ دوستی چھوڑ آئے ہم
شعر ڈھلتے تھے جہاں، نغمے بکھرتے تھے جہاں
وہ شبستانِ عروسِ شاعری چھوڑ آئے ہم

کسی مملکت کے قائم ہونے اور اتنی جلدی ختم ہو جانے کی مثال، تاریخ میں نہیں ملتی، جس کے نتیجے میں اس محفلِ شعر و ادب کی بساط بھی الٹ گئی۔ اس کتاب میں، میں نے کسی قسم کی سیاسی یا نظریاتی بحث چھیڑنے سے قطعی طور پر احتراز کیا ہے۔ اس لیے کہ:

بزمِ ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رُلانا ہرگز

اس کے باوجود ہماری قومی اور ملی تاریخ کا یہ اتنا بڑا المیہ ہے کہ اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اہلِ بصیرت کے لیے اس میں عبرت کا بڑا سامان ہے۔ لہٰذا یہ داستانِ شعر و ادب بھی ایک مرقعِ عبرت سے کم نہیں۔ فاعتبروا یااولی الابصار۔"
اس داستانِ عبرت و حسرت کو سمجھنے کے لیے ہمیں تاریخ کے اوراق پلٹنے ہوں گے۔

تاریخی و سیاسی جائزہ

موجودہ بنگلہ دیش پہلے پاکستان کا حصہ تھا اور مشرقی پاکستان کہلاتا تھا۔ بنگالی مسلمانوں نے تحریکِ پاکستان میں نمایاں حصہ لیا اور اس کے لیے بڑی قربانیاں دیں۔ بنگال کے مسلمان ہمیشہ اسلام کے شیدائی رہے۔ انھوں نے سید احمد شہیدؒ کی تحریک میں بھی حصہ لیا اور ہزاروں کی تعداد میں جہاد کے لیے سرحد پہنچ گئے۔ بنگال میں تیتو میر شہید کی تحریک بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ وہاں دینی علوم کا چرچا بھی زیادہ رہا۔ تحصیلِ علم کے لیے طلبہ دیوبند، کانپور، سہارنپور، لکھنؤ اور دہلی جاتے

رہے۔ دینی مدرسوں، علماء اور مساجد کی تعداد بھی وہاں ہندوستان کے دوسرے خطوں سے زیادہ تھی۔ پاکستان بنانے والی جماعت مسلم لیگ بھی ڈھاکے میں نواب سر سلیم اللہ کی سرکردگی میں ۱۹۰۶ء میں قائم ہوئی۔

مشرقی پاکستان میں دینی مدرسوں اور مساجد کا جال بچھا ہوا تھا۔ مدرسوں میں اُردو زبان ذریعۂ تعلیم تھی۔ وہاں کے عوام سادہ مزاج اور ارکانِ اسلام کے پابند تھے اور انھیں پاکستان سے بڑی محبت تھی۔ قیامِ پاکستان کے وقت وہاں کی سب سے بڑی اور اہم جماعت مسلم لیگ تھی۔ صوبائی حکومت اسی نے بنائی۔ پہلے وزیرِ اعلیٰ خواجہ ناظم الدین تھے۔ قائدِ اعظم کی وفات کے بعد جب خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل بنا دیے گئے تو ان کی جگہ نور الامین وزیرِ اعلیٰ مقرر کیے گئے۔ اس دور میں فیروز خاں نون وہاں کے گورنر تھے۔ یہ مشرقی پاکستان کا بہت اچھا دور تھا۔ لیکن حالات زیادہ دنوں تک پُرسکون نہ رہے۔

مسلم لیگ عوام میں اپنا اثر کھوتی چلی گئی اور نئی نئی پارٹیاں وجود میں آتی گئیں، جن میں بعض پارٹیوں پر ہندوؤں (جو کثیر تعداد میں مشرقی پاکستان میں موجود تھے) اور بھارت کے اثرات بھی تھے۔ بھارت کی سازش شروع سے وہاں اپنا کام کرتی رہی۔ سب سے پہلے زبان کا مسئلہ کھڑا کیا گیا اور قومی زبان اُردو کے خلاف تحریک چلائی گئی۔ اس کے بعد وفاقی حکومت کے خلاف شکایات، تلخیوں اور تعصبات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۱۹۵۴ء میں صوبائی اسمبلی کا الیکشن ہوا جس میں مسلم لیگ کو شکستِ فاش ہوئی۔ مخالف سیاسی پارٹیوں کی متحدہ جماعت "جگتو فرنٹ" نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ یہ حکومت بھی زیادہ عرصہ نہ چل سکی اور مشرقی پاکستان میں گورنر راج قائم کر دیا گیا۔ اسکندر مرزا گورنر بنائے گئے۔ جنرل ایوب خاں کے دور میں مسلم لیگ دوبارہ منظرِ عام پر آ گئی۔ جنرل اعظم خاں نے گورنر کی حیثیت سے وہاں بڑی مقبولیت حاصل کی۔ جنرل اعظم خاں کے بعد مسلم لیگی رہنما منعم خاں ایک عرصے تک وہاں کے گورنر رہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عوامی لیگ کے اثرات بڑھتے گئے اور یہ مشرقی پاکستان کی

سب سے بڑی جماعت کی حیثیت سے نمایاں ہوگئی۔ پہلے یہ جماعت "جناح عوامی لیگ" کے نام سے قائم ہوئی تھی۔ جس کے سربراہ پرانے مسلم لیگی رہنما اور متحدہ بنگال کے سابق وزیرِاعلیٰ حسین شہید سہروردی تھے، جو بعد میں پاکستان کے وزیرِاعظم بنے۔ بعد میں یہ جماعت "عوامی لیگ" کے نام سے مشہور ہوئی۔ سہروردی کی وفات کے بعد جب شیخ مجیب الرحمٰن اس کا سربراہ بنا تو اس جماعت نے کھل کر بنگالی قومیت کا پرچار اور وفاقی حکومت اور غیر بنگالیوں کے خلاف تعصب، نفرت اور عداوت کا اظہار شروع کر دیا۔ اسے مقامی ہندوؤں کا بھرپور تعاون اور بھارت کی آشیرباد حاصل تھی۔ اس دوران مغربی پاکستان کے لیڈروں اور مشرقی پاکستان میں متعین اعلیٰ سرکاری افسروں کا کردار بھی کچھ قابلِ تعریف نہ رہا۔ ان کی رعونت اور وفاقی حکومت کی بعض غلط پالیسیوں نے اس رجحان کو اور فروغ دیا۔

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات تک پہنچتے پہنچتے عوامی لیگ کی بنگالی قومیت کی تحریک نے پورے مشرقی پاکستان کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ یہ تحریک ایک سیلاب بن کر اٹھی جو اپنی راہ میں آنے والی ہر چیز کو تہس نہس کرنے پر آمادہ تھی۔ مذہبی جماعتیں مثلاً مسلم لیگ، جماعتِ اسلامی اور نظامِ اسلام پارٹی وغیرہ اور مشرقی پاکستان کے لاکھوں علماء اس کے سامنے بے دست و پا نظر آنے لگے۔ یہ حالات تھے کہ دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں عوامی لیگ کو صوبائی اور قومی اسمبلی میں بھرپور اکثریت حاصل ہوگئی۔

مشرقی پاکستان، بنگلہ دیش بن گیا

عام انتخابات میں نمایاں کامیابی کے باوجود عوامی لیگ کو حکومت بنانے نہ دی گئی۔ اس میں فوجی حکمراں جنرل یحییٰ خاں کے علاوہ جن لوگوں کا ہاتھ تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باغیانہ رجحان رکھنے والی اس پارٹی نے ۲۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو آزادی اور خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ اس بغاوت کو کچلنے کے لیے فوجی کارروائی کی گئی۔ عوامی لیگ کے لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کر لیا گیا۔

باقی سب لیڈر راتوں رات بھاگ کر مغربی بنگال (بھارت) چلے گئے جہاں انھیں خوش آمدید کہا گیا۔ ان کے علاوہ لاکھوں عوامی لیگی کارکن بھی بھارت پہنچ گئے۔ مفرور عوامی لیگیوں نے بھارت کی مدد سے مکتی باہنی (آزادی دہندہ فوج) بنائی اور مغربی بنگال کو مرکز بنا کر اپنی آزاد حکومت کا اعلان کر دیا۔ ایسٹ بنگال رجمنٹ اور ایسٹ پاکستان رائفلز نے بھی بغاوت کر دی۔ ان سپاہیوں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔ ان باغی سپاہیوں نے مکتی باہنی کے ساتھ مل کر پورے مشرقی پاکستان میں تخریب کاری اور غیر بنگالیوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ پاکستانی فوج ان سے نپٹنے کے لیے کافی نہ تھی اور ٹکڑیوں میں پورے خطے میں پھیلی ہوئی تھی۔ چند ہزار بہاری نوجوان ای پی آر میں شامل ہو کر ان کے شانہ بشانہ لڑ رہے تھے۔ جماعتِ اسلامی کی رضا کار تنظیمیں البدر اور الشمس بھی ساتھ دے رہی تھیں۔ آخر کار ۳؍دسمبر ۱۹۷۱ء کو بھارت نے مکتی باہنی اور باغی فوجیوں کے ساتھ مشرقی پاکستان پر باقاعدہ حملہ کر دیا۔ چند دنوں کی جنگ میں پاکستان کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ ۹۰ ہزار پاکستانی فوج نے جنرل نیازی کی قیادت میں بھارتی فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ اس طرح ۱۶؍دسمبر ۱۹۷۱ء کو مشرقی پاکستان، بنگلہ دیش بن گیا۔ پاکستان کے لیے اور ملّتِ اسلامیہ کے لیے یہ ایک سانحۂ عظیم تھا۔ لیکن پاکستان کے اربابِ اقتدار کی آنکھ تک نم نہ ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ پاکستانی فوج اور بہاریوں کی طرف سے بعض علاقوں میں کچھ زیادتیاں بھی ہوئیں، جس کا کوئی جواز نہیں پیش کیا جا سکتا۔ غلطی چھوٹی ہو یا بڑی، بہر حال غلطی ہوتی ہے۔ لیکن یہ جو کہا جاتا ہے کہ پاکستانی فوج نے بیس یا تیس لاکھ بنگالیوں کو مار ڈالا، بالکل جھوٹا پروپیگنڈہ ہے۔ حمود الرحمٰن کمیشن کے مطابق صرف ۲۵ ہزار بنگالی مارے گئے۔ سقوطِ ڈھاکا سے پہلے اور اس کے بعد مکتی باہنی نے جو کئی لاکھ غیر بنگالیوں کو قتل کیا، اس کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ کیوں؟ نہ بنگلہ دیشی حکومت اس کا ذکر کرتی ہے نہ پاکستانی حکومت۔ (انڈیا کے پروپیگنڈوں سے پریشان ہو کر یحییٰ خاں کی حکومت نے اگست ۱۹۷۱ء میں ایک قرطاسِ ابیض (White Paper) شائع کیا تھا جس میں مارچ، اپریل ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے مختلف علاقوں میں جو غیر بنگالی مارے گئے تھے، اس

کی تفصیل تھی)۔

بہاریوں کا قتلِ عام

بنگلہ دیش کے قیام کے ساتھ ہی وہاں کے اُردو بولنے والے مہاجروں پر، جو بہاری کہلاتے تھے، قیامت ٹوٹ پڑی۔ مارچ کے مہینے ہی سے پورے ملک میں ان کا قتلِ عام شروع ہو گیا تھا۔ ایسی خوں ریزی اور غارت گری ہوئی کہ چنگیز و ہلاکو کی روحیں بھی شرما گئی ہوں گی۔ پاکستان کے نام پر سب کچھ لٹا کر مشرقی پاکستان کو اپنا وطن بنانے والوں کے لیے زمین سخت ہو گئی اور آسمان دور ہو گیا۔ ان کا کوئی یار و مددگار نہ تھا۔ لاکھوں قتل ہوئے، ہزاروں عورتیں اغوا ہوئیں۔ ان کی املاک لوٹ لی گئیں، ان کے گھروں پر قبضہ کر لیا گیا اور انھیں کیمپوں میں رہنے پر مجبور کر دیا گیا۔ عقل حیران ہے کہ کیا مسلمان بھی مسلمان کے ساتھ ایسا سلوک کر سکتا ہے؟ لیکن چشمِ فلک نے یہ بھی دیکھ لیا۔

ع آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

سوال یہ ہے کہ ان بہاریوں کا قصور کیا تھا؟ ان کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے عوامی لیگ اور بنگالی قومیت کا ساتھ کیوں نہیں دیا؟ وہ پاکستان اور نظریۂ پاکستان کی حمایت سے دست بردار کیوں نہ ہوئے اور پاکستان کی مدافعت میں پاکستانی فوج کے شانہ بشانہ کیوں رہے؟

پاکستانی محصورین

تقریباً چالیس سال گزر گئے، بنگلہ دیش کے مختلف کیمپوں میں تقریباً تین لاکھ محصورین غیر انسانی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ انھیں ہزار وعدوں کے باوجود پاکستان لانے سے گریز کیا گیا۔ ان کے یہاں لانے کے خلاف تحریک چلائی گئی۔ ایک سابق وزیرِ داخلہ نے بیان دیا کہ ان لوگوں کا پاکستان پر کوئی حق نہیں۔ کیا اس سے زیادہ بے مروتی، بے انصافی اور بے بصیرتی کی بات کچھ اور ہو سکتی ہے؟

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

قدرت کا انتقام

یہ کتنی عبرت کی بات ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن جس نے بنگالی قومیت کی تحریک چلائی اور بھارت کی مدد سے بنگلہ دیش بنایا اور اپنی قوم سے ''جاتیو پتا'' (بابائے قوم) کا لقب پایا صرف چار سال کی حکومت کے بعد ۱۹۷۵ء میں ۱۴ر اور ۱۵ر اگست کی درمیانی رات کو اپنے ہی فوجی افسروں کے ہاتھوں وزیر اعظم ہاؤس میں مع اہل و عیال قتل کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے بڑے بھائی اور اس کے بیوی بچے جو وہاں بحیثیت مہمان آئے ہوئے تھے، وہ بھی مارے گئے۔ اسی رات اس کی بہن کے اہلِ خاندان بھی جو قریب ہی سکونت پذیر تھے، قتل کر دیے گئے (شیخ مجیب کی دو بیٹیاں جو لندن میں تھیں، وہ بچ گئیں)۔ عوامی لیگ کے سب نمایاں قائدین، جو بنگالی قومیت کے علم بردار، بنگلہ دیش کے بانی حکمراں اور بہاریوں کے قتلِ عام کے ذمہ دار تھے، ڈھاکا سینٹرل جیل میں پہلے قید کیے گئے اور ایک رات سب ایک ساتھ ہلاک کر دیے گئے۔ ایک رات ہیلی کاپٹر میں چند نوجوان فوجی افسر ڈھاکا سینٹرل جیل کے گراؤنڈ میں اُترے، تمام عوامی لیگی لیڈروں کو ایک صف میں کھڑا کیا اور گولیوں سے بھون ڈالا۔ پھر جس طرح آئے تھے اسی طرح ہیلی کاپٹر میں واپس چلے گئے۔ جیل کا عملہ حیرت سے یہ تماشا دیکھتا رہا۔ ہے کوئی عبرت حاصل کرنے والا؟

مکتی باہنی کے غنڈے جو مہینوں بہاریوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کرتے رہے، بہت جلد مہلک انجام کو پہنچے۔ کچھ آپس میں لڑ کر ہلاک ہوئے اور کچھ فالج اور اس قسم کی دیگر بیماریوں میں مبتلا ہو کر معذور ہو گئے۔ ع حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں۔

اہلِ نظر کو اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ شیخ مجیب الرحمٰن اور اس کے ساتھیوں کے علاوہ جن لوگوں نے بھی پاکستان کو توڑنے میں کردار ادا کیا، قدرت کی طرف سے انھیں عبرت ناک سزا ملی۔

خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی، بس دیکھنے والی نگاہ چاہیے:

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

(اقبال)

مہلک ہتھیار

پاکستان کے مشرقی بازو کو کاٹنے میں جو مہلک ہتھیار استعمال کیا گیا وہ بنگالی قومیت اور لسانیت تھی جو تمام تر نسل پرستی پر مبنی تھی۔ اسلام نے ایسی نسل پرستی اور قوم پرستی کو حرام قرار دیا ہے اور یہ چیز دین وایمان کے سراسر منافی ہے۔ لہٰذا اسے اختیار کرنے کے بعد نہ مسلم اخوت برقرار رہ سکتی ہے نہ ملی یک جہتی۔ اس کے بعد ہی دشمنوں کو مداخلت کا موقع ملتا ہے اور ملک وملت کی رسوائی مقدر بن جاتی ہے۔ لیکن ایک بازو کے کٹ جانے کے بعد بھی بقیہ پاکستان کے عوام اور حکمرانوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ صوبائی عصبیت اور نسلی قوم پرستی عروج پر ہے، جس کی زہرناکی میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مذہبی جماعتیں بھی اب اس کی مذمت نہیں کرتیں۔ ہمارا انجام کیا ہوگا!

کچھ علاج اس کا بھی

گزشتہ چند عشروں سے نام نہاد جہادی تنظیموں کی دہشت گردی اور تخریب کاری بھی جاری ہے۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو کہ پاکستان کے کسی علاقے میں دہشت گردی کا واقعہ نہ ہوتا ہو اور بے قصور لوگوں کی جانیں تلف نہ ہوتی ہوں۔ یہ سب کچھ اسلام کے نام پر کیا جاتا ہے۔ حیرت ہے کہ اسلام اتنا خونخوار مذہب کب سے ہو گیا۔ اسلام تو جہاد کے دوران بھی بچوں، بوڑھوں اور

عورتوں پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ اگر کسی نے ایک انسان کو بھی قتل کردیا تو گویا اس نے پوری نوعِ انسان کو قتل کردیا۔ ایسے دینِ رحمت کے نام پر دہشت گردی اور تخریب کاری بڑی حیران کن بات ہے۔ اللہ کی پناہ! اب تو یورپ، امریکہ اور پوری دنیا میں ہر پاکستانی کو دہشت گرد سمجھا جانے لگا ہے۔ ع کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گرو ہے کہ نہیں۔

امریکہ یا یورپ کے مظالم کو دہشت گردی کے لیے جواز بنانا درست نہیں۔ اسلام نے جن باتوں کو ناجائز قرار دیا ہے وہ ہر حال میں ناجائز ہیں۔ اسلام میں دہشت گردی اور تخریب کاری کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔

ہمیں ہر کام حکمت و تدبر سے کرنا چاہیے اور اپنے اعمال کا احتساب خود کرتے رہنا چاہیے۔ بقول اقبالؔ:

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

—— ہارون الرشید

بابِ اوّل

شعرا (الف)

علّامہ تمنّا عمادی

(استادِ گراں مایہ، گراں پایہ تمنّا)

علّامہ تمنّا عمادی (۱۸۸۸ء-۱۹۷۲ء) جیسی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ برِّصغیر کے مسلمانوں میں بے شمار بلند پایہ عالم، مفسّر، محدّث، فقیہ، مجتہد، محقق، ناقد، مختلف زبانوں کے ماہر، شاعر، ادیب، مصنف، مبلّغ، واعظ اور صاحبِ اخلاق و تقویٰ پیدا ہوئے لیکن کوئی ایک شخص جو ان صفات و کمالات کا جامع ہو سوائے علّامہ تمنّا عمادی کے اور کوئی نظر نہیں آتا۔ یہی نہیں کہ وہ مختلف علوم و فنون کے جامع تھے بلکہ وہ ہر علم و فن میں بے مثال و منفرد بھی تھے۔ لیکن افسوس کہ ایسے جامع العلوم اور جامع الصفات شخصیت کی جیسی قدر ہونی چاہیے تھی ویسی نہ ہوئی۔ انھوں نے سو سے زیادہ نہایت اہم اور گراں قدر کتابیں لکھیں جن میں سے تقریباً نصف غیر مطبوعہ رہ گئیں۔ اور جو کتابیں مطبوعہ تھیں وہ بھی اس طویل عرصے میں نایاب ہو گئی ہیں۔

سرِ دست ہم علّامہ کی زبان دانی اور ان کی شاعری پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

بے مثل زبان داں

علّامہ تمنّا عربی، فارسی اور اُردو پر یکساں ماہرانہ قدرت رکھتے تھے۔ ان تینوں زبانوں کے قواعد، صرف و نحو اور علمِ عروض پر انھیں جیسا عبور حاصل تھا، اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ زبان و

بیان اور قواعد سے متعلق اگرچہ انھوں نے بہت کچھ لکھا لیکن ان کی کتاب ''ایضاحِ سخن'' (طبع ثانی ۱۹۶۱ء، ڈھاکا۔ صفحات: ۲۷۶) نے زبان و بیان اور علمِ عروض و بلاغت کے ماہرین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی اور وہ حیرت زدہ رہ گئے کہ ایک خرقہ پوش اور گوشہ نشیں عالم کیا شعروشاعری اور زبان کا اتنا بڑا رمز شناس بھی ہوسکتا ہے!!

عروض و قواعد پر علامہ کی حسبِ ذیل کتابیں شائع ہوئیں:

عروضِ جدید۔ قدیم عروضیوں کی غلطی۔ افعالِ مرکبہ۔ کو اور نے کا استعمال۔

ردیف پر ایک رسالہ۔ قوافی پر ایک رسالہ۔

اُردو کے مشہور و معروف شاعر شوقؔ سندیلوی نے محض تفننِ طبع کے طور پر اپنی ایک ہی غزل پر اس دور کے سترہ مشہور و مستند اساتذہ سے اصلاح لی اور ان اصلاحوں کو اساتذہ کے خطوط کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کردیا۔ علامہ تمناؔ کی نظر سے جب یہ کتاب گزری تو انھوں نے اساتذہ کی اصلاحوں پر تنقید و تبصرہ کیا اور ''ایضاحِ سخن'' کے نام سے اسے شائع کردیا۔ انھوں نے اس کتاب میں زبان و بیان اور عروض و بلاغت کے ایسے ایسے نکتے بیان کیے کہ پورے برِّصغیر میں اس کتاب کی دھوم مچ گئی اور مشاہیرِ ادب علامہ کو خراجِ تحسین پیش کیے بغیر نہ رہ سکے۔ چند تبصرے ملاحظہ ہوں۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی فرماتے ہیں:

''ایضاحِ سخن'' بظاہر شوقؔ سندیلوی کی 'اصلاحِ سخن' پر تبصرہ ہے لیکن درحقیقت یہ دلچسپ کتاب تخلیقی ادب کا مرتبہ رکھتی ہے۔ فنِ شعروادب کے کتنے ہی مسائل اس خوبی اور شرح و بسط کے ساتھ معرضِ تحریر میں آئے ہیں کہ بے اختیار آفریں کہنے کو جی چاہتا ہے۔''

(''ایضاحِ سخن''، طبع ثانی)

نیازؔ فتح پوری رقم طراز ہیں:

''شوقؔ سندیلوی کی 'اصلاحِ سخن' تو محض ایک تفنن تھا لیکن مولانا تمناؔ عمادی نے جو اپنے

فضل وکمال وجامعیتِ علوم کے لحاظ سے اس وقت اپنا جواب نہیں رکھتے، ایضاحِ سخن لکھ کر اسے فن میں تبدیل کر دیا۔ نہ شوق کی غزل میں کوئی خاص بات تھی نہ اس کی اصلاحوں میں، لیکن مولانا تمنا عمادی نے بہ سلسلہ تشریح وتنقید سیکڑوں لغوی، لسانی، فنی نکات ایسے پیش کر دیے کہ کتاب ایک عالمانہ تصنیف بن گئی۔ سچ ہے اگر پارس پتھر کو چھو لے تو وہ بھی سونا بن جاتا ہے۔"

("ایضاحِ سخن۔" طبع ثانی)

جوشؔ ملیح آبادی فرماتے ہیں:

"حضرت مولانا تمنا عمادی کی کتاب "ایضاحِ سخن" کے سرسری مطالعے سے میں جس تعجب انگیز مسرت سے دوچار ہوا اس کی شرح نہیں کی جا سکتی۔ یہ فیصلہ کر کے میں بہت اداس اور مایوس تھا کہ اب شعروادب اور لسانیات کے مقامات ونکات سے یہ عصر یک سر خالی اور بیگانہ ہو چکا ہے...... لیکن جس وقت اس کتاب کو کہیں کہیں سے پڑھا تو میری آنکھیں روشن ہو گئیں اور نہایت خوشی کے ساتھ کہنا پڑا کہ ع ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔"

("ایضاحِ سخن۔" طبع ثانی)

شاعری

علامہ تمنا عمادی عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں نظم ونثر لکھنے پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ اس لحاظ سے بھی وہ پوری اُردو شاعری میں بے مثل ومنفرد ہیں۔ اُردو کے بے شمار شاعر ایسے گزرے ہیں جو اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کے باکمال شاعر تھے۔ لیکن اُردو فارسی کے ساتھ عربی کے نہیں۔ عربی کے چند اشعار کہہ لینے یا صرف عربی کا شاعر ہونے کی بات الگ ہے۔ علامہ کی اس خوبی کا اعتراف داغؔ دہلوی کے ایک ممتاز شاگرد اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے استاد پروفیسر احسن مارہروی نے اپنے اس قطعہ میں کہا ہے:

تازی و فارسی و اُردو میں
قدرتِ شعر ہو یکساں جس کو
اک تمنائے عمادی کے سوا
میں بتاؤں تو بتاؤں کس کو

عربی شاعری

علامہ عربی شعر اسی سہولت اور فراوانی سے لکھتے تھے، جس طرح اُردو اشعار۔ وہ عربی شعر اہلِ زبان کی طرح لکھتے تھے۔ وہ عربی کے بھی زود گو اور پُر گو شاعر تھے۔ انھوں نے متعدد طویل عربی قصائد اور نظمیں لکھیں۔ انھوں نے جنرل محمد ایوب خاں کے متعدد عربی اور اُردو قصائد لکھے جو "ارمغانِ انقلاب" کے نام سے شائع ہوئے۔ یہاں قارئین کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ انھوں نے کسی ذاتی فائدے کے لیے یہ قصائد لکھے تھے۔ اس لیے کہ علامہ جیسے "خدا مست و خود آگاہ" درویش کسی حکمراں سے اپنی کوئی توقع وابستہ نہیں کرتے۔ یہ تو صرف اسلام اور عوام کی محبت ہوتی ہے جو ان سے کبھی کبھی ایسے قصائد لکھوا دیتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ حکمراں اسلام اور مسلمانوں کی کوئی بہتر خدمت انجام دے دے۔

علامہ کے عربی اشعار اور قصائد اگر جمع کیے جائیں تو ایک ضخیم دیوان تیار ہو جائے۔ بلکہ اس کا امکان زیادہ ہے کہ انھوں نے خود ہی اپنے عربی کلام کا کوئی مجموعہ مرتب کر لیا ہو۔

فارسی شاعری

علامہ تمنا عمادی کو فارسی شاعری پر بھی اسی طرح عبور حاصل تھا۔ وہ ایک قادر الکلام، زود گو اور پُر گو شاعر تھے۔ اُردو ہو یا عربی و فارسی وہ شعر بھی اسی سہولت اور آسانی سے لکھتے تھے جس طرح لوگ نثر لکھتے ہیں۔ فارسی میں بھی انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ بے شمار غزلیں، نظمیں اور مثنویاں لکھیں۔ دو طویل مثنویاں "مذہب و عقل" (چار سو شعر) اور "معاش و معاد" (آٹھ سو شعر) کے نام سے شائع

ہوئیں۔ ان کی فارسی شاعری کے بارے میں ایڈووکیٹ انیس الرحمٰن لکھتے ہیں:

''علامہ تمنا عمادی کا فارسی کلام بھی حسن و خوبی، شگفتگی اور ترنم، سلاست اور روانی، گہرائی اور گیرائی، فصاحت اور بلاغت کا مجموعہ ہے۔ تمام ائمہ فن نے اس کی بلندی اور عظمت کا اعتراف کیا ہے اور لائق صد تحسین و آفرین قرار دیا ہے۔ آپ کی فارسی شاعری پر سعدیؔ اور حافظؔ کی زبان کی شیرینی اور چاشنی کے اثرات نمایاں ہیں۔ زبان دانی میں علامہ شبلیؔ سے فیض پایا ہے اور اسیِ حزیں سے استفادہ کیا ہے۔''

(''علامہ تمنا عمادی پھلواروی۔'' ص: ۷۷)

اُردو شاعری

علامہ تمنا عمادی کی برجستہ گوئی کا کوئی جواب نہ تھا بارہا ایسا ہوا کہ وہ مشاعرے میں پہنچے اور وہیں مصرعۂ طرح لے کر پوری غزل کہہ ڈالی۔ ان کی غزل بھی پندرہ بیس شعر سے کم کی نہ ہوتی تھی۔ انیس الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں:

''علامہ کی قادر الکلامی کا یہ عالم تھا کہ اکثر و بیشتر غزل مشاعرہ کے لیے کہہ کر نہیں لاتے تھے۔ حاضر دماغی ہمہ وقت تازہ دم رہتی ہے۔ مجلسِ مشاعرہ میں پہنچے۔ مصرعۂ طرح لے کر ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔ اِدھر چائے کی پیالی ختم ہوئی، اُدھر غزل تیار۔ ایسی غزل کہ مشاعرے پر چھا گئی۔ علامہ کی پُر گوئی اور قادر الکلامی کا اندازہ صرف ایک واقعے سے ہو سکتا ہے۔ آٹھ ہزار اشعار کا قصیدہ تراسی سال کی عمر میں دو مہینے کے اندر سپردِ قلم کر دیا ہے۔ کسی شاعر نے اپنی نظم میں دو شعر ایسے لکھے تھے جن کا تعلق تاریخ سے تھا، علامہ کو اس خیال سے اتفاق نہ تھا۔ انھوں نے ان دو شعروں پر تنقید کی اور پھر پوری نظم اسی بحر و قوافی میں لکھ ڈالی اور آٹھ ہزار شعر کہہ دیے۔''

(''علامہ تمنا عمادی پھلواروی'' ۔ص: ۶۰)

مصنف موصوف نے یہاں بات ادھوری کی ہے۔ انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ مثنوی کا نام کیا تھا۔ یہ شائع ہوئی یا نہیں۔ بہرحال تراسی سال کی عمر میں (وفات سے ایک سال قبل) اتنی طویل مثنوی لکھنا، یقینا حیرت انگیز ہے۔

علامہ تمنا نے غزلوں کے کئی دیوان مرتب کر لیے تھے۔ انھوں نے بہت سی قومی اور سیاسی نظمیں بھی لکھیں جو اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتی رہیں۔ ان کی قومی اور سیاسی نظموں کے دو مجموعے ''ہوک'' اور ''لیڈر نامہ'' بھی شائع ہوئے۔ انھوں نے متعدد طویل مثنویاں بھی لکھیں۔ حمد و نعت، قصائد اور مرثیے بھی لکھے، ان کا سب سے اہم مطبوعہ قصیدہ، ''قصیدۃ الزہرا'' ہے۔ جس میں انھوں نے اپنی تحقیق کے مطابق واقعات کربلا اور اس دور کی تاریخ بیان کی ہے۔

علامہ تمنا کی غزل گوئی پرانے طرز کی تھی۔ وہ اکثر سنگلاخ زمین اور مشکل بحروں میں شعر کہتے تھے۔ ان کی غزلیں عموماً بڑی طویل ہوتی تھی۔ لیکن ان غزلوں میں صرف استادانہ شان ہی نہیں۔ لطف و اثر بھی ہے۔ یہاں ان کی تین غزلیں بطور نمونہ درج کی جاتی ہیں:

سینے میں یونہی رکھے رکھے سوزِ غمِ پنہاں کیا کرتا
پروانہ جل بجھتا نہ اگر اے شمعِ شبستاں کیا کرتا

ہے رسمِ وفا کا پاس ذرا، ورنہ میں تمھیں دکھلا دیتا
کرتا جو میں نالہ کیا ہوتا، ہوتا جو میں نالاں کیا کرتا

انداز لبِ گویائی کا، گرتی اٹھتی پلکوں ہی میں تھا!
ظاہر غمِ پنہاں اس بت پہ نظارۂ حیراں کیا کرتا

دل دے ہی چکا، جی کھو ہی چکا، ایمان جو تھا اس سے بھی گیا
بتلاؤ تمھیں اس سے بڑھ کر اب ایک مسلماں کیا کرتا

گو شغلِ غزل گوئی ہے جنوں، پھر بھی نہیں بالکل میں مجنوں
''دیوانے تمنا'' سب کہتے، چھپوا کے میں دیواں کیا کرتا

☆

جس گلی سے لوگ لائے تھے بصد مشکل مجھے
لو وہیں پھر لے چلا کم بخت میرا دل مجھے
رُخ تو میرا پھیر دے اے موجِ دریا اس طرف
دور ہی سے کچھ کہے شاید لبِ ساحل مجھے
خاک تو میں ہوں مگر خاکسترِ پروانہ ہوں
چاہیے اک یادگارِ گرمیِ محفل مجھے
ناتواں ہوں کس طرح درزوں ذرا تھم ساربان
کچھ اشارے کر رہا ہے پردۂ محمل مجھے
لوگ کرتے ہیں تمنا کس لیے کسبِ ہنر
اتنی تحصیلِ ہنر سے کیا ہوا حاصل مجھے

☆☆☆☆☆

نکلے اجل کے معرکۂ جاں کنی سے ہم
تب جا کے روشناس ہوئے زندگی سے ہم
کیا کر سکیں گے اپنا تعارف کسی سے ہم
اپنی نظر میں آپ ہیں اک اجنبی سے ہم
پھیلا کہاں سے رازِ محبت جہان میں
پوچھا کسی نے اور نہ بولے کسی سے ہم
خود شوق اپنا خضر ہے، ہمت رفیقِ راہ
بھولیں جو راستہ تو نہ پوچھیں کسی سے ہم
آبِ حیات خضر نے جس گھاٹ پر پیا
بیٹھے تھے ہاتھ دھو کے وہاں زندگی سے ہم

جب اٹھ چکا جنازہ تو آیا ہے بام پر
اچھا، سلام ! جاتے ہیں تیری گلی سے ہم
اب فکر ہے اگر تو تمنا اسی کی ہے
شرمندہ ہوں نہ حشر میں اپنے نبیؐ سے ہم

ڈاکٹر عندلیب شادانی بہت کم کسی کو خاطر میں لاتے تھے۔ لیکن علامہ تمنا کے فضائل و کمالات سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ دیکھیے وہ کس طرح انھیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:

علامہ تمنا کہ ہیں اک علم کا دریا
واقف نہیں کون آپ سے ادنیٰ ہو کہ اعلیٰ
اخلاق میں اطوار میں تقویٰ میں عمل میں
ذات ان کا نمونہ ہے بزرگانِ سلف کا
کل عمر ہی گو دین کی خدمت میں گزاری
دنیا میں صلہ اس کا کسی سے نہیں چاہا
لکھا ہے مہماتِ مسائل پہ بہت کچھ
آسان نہیں جملہ تصانیف کا احصا
جھکنا نہ سکا تنگیِ اسبابِ معیشت
سائل نہ ہوا ہوا غیر سے اللہ کا یہ بندا
گو شاعری ہے آپ کے رتبے سے فروتر
جاتا ہے ادھر سے بھی درِ فیض کو رستا
اس رنگ میں بھی اپنے حریفوں سے ہے ممتاز
استاد گراں مایہ، گراں پایہ تمنا

اس میں شک نہیں کہ علامہ تمنا عمادی دینی علوم کے ایک بلند پایہ اور منفرد عالم و محقق و مصنف ہونے کے علاوہ زبان و بیان، علم عروض و بلاغت اور شعر و شاعری کے بھی "استادِ گراں مایہ اور گراں پایہ" تھے۔

حالاتِ زندگی

حیات الحق محمد محی الدین نام، تمنا تخلص اور تمنا عمادی قلمی نام تھا اور اسی نام سے مشہور ہوئے۔ ۱۴؍ جون ۱۸۸۸ء کو پھلواری شریف (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک علمی، دینی اور ادبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنے والد (مولانا) نذیر الحق سے تعلیم حاصل کی اور بہت جلد مشرقی اور دینی علوم میں کمال حاصل کر لیا۔ چودہ سال تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد علمی و دینی تحقیق و تصنیف کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ کچھ عرصہ حیدر آباد میں بھی رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہی ڈھاکا آ گئے۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۹ء تک ان کا قیام مشرقی پاکستان میں رہا۔ وہیں ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے پچاسوں کتابیں تصنیف کر ڈالیں، اس سے پہلے بھی پچاسوں کتابیں لکھ چکے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں علامہ کراچی آ گئے۔ یہاں تین سال قیام رہا۔ یہاں بھی تصنیف و تحریر کا سلسلہ جاری رہا۔ ۲۷؍ نومبر ۱۹۷۲ء کو کراچی میں ان کا ۸۴ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ رحمت اللہ علیہ۔

کراچی آنے کے بعد ماہر القادری (مدیر "فاران" کراچی) سے ان کے روابط قائم ہو گئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"علامہ تمنا عمادی علم و فضل کا سمندر تھے۔ ان کا مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ دورِ حاضر میں اس قدر کثیر المطالعہ علماء خال خال ہی ہوں گے۔ وسیع الاطراف جامع شخصیت! تجوید کے فن سے بڑے بڑے علمائے دین واقف نہیں ہوتے مگر علامہ تمنا اس فن میں بھی درک رکھتے تھے۔ شعر و سخن اور فنِ عروض میں انھیں استادی کا مرتبہ حاصل تھا۔ آخر عمر میں ہزاروں

صفحے قدیم مطالعہ، یادداشت اور حافظہ کی مدد سے لکھ ڈالے۔ لکھنا اور مسلسل لکھنا ان کی زندگی تھی۔"

("یادِ رفتگاں۔" جلد اوّل۔ ص: ۱۳۸)

تصانیف

علامہ تمنا عمادیؒ ایک بلند پایہ دینی محقق و مصنف تھے۔ انھوں نے دینی موضوعات پر سیکڑوں تحقیقی کتابیں لکھیں جن میں مجتہدانہ بصیرت نمایاں ہے۔ وہ تقلید اور روایت پرستی کے قائل نہ تھے۔ اللہ نے انھیں جرأتِ اظہار بھی عطا کی تھی۔ لہٰذا وہ جس بات کو غلط سمجھتے تھے اس کا برملا اظہار کرتے تھے۔ وہ دلیل و برہان کے بغیر کوئی بات نہ کہتے تھے۔ فرقہ بندی، روایت پرستی اور شخصیت پرستی کے خلاف انھوں نے زندگی بھر جہاد کیا۔

علامہ تمنا کی پچاسوں کتابیں شائع ہوئیں اور رفتہ رفتہ نایاب ہوگئیں۔ "الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کراچی" کی یہ ایک بڑی علمی و دینی خدمت ہے کہ اس نے علامہ تمنا کی حسبِ ذیل ۱۶ کتابیں شائع کیں:

۱۔ جمع القرآن
۲۔ اعجاز القرآن
۳۔ اختلافِ قرأت
۴۔ امام زہری و امام طبری (تصویر کا دوسرا رُخ)
۵۔ مسئلۂ معلّٰی کی حقیقت
۶۔ مسند احمد کی حقیقت
۷۔ انتظارِ مہدی و مسیح
۸۔ مذاکرہ (عقیدہ ایصالِ ثواب کی حقیقت)
۹۔ کیا اختلافِ اُمت رحمت ہے؟
۱۰۔ سبیل المؤمنین (عظمتِ صحابہؓ)
۱۱۔ القصیدۃ الزہرہ (حصہ نثر)
۱۲۔ القصیدۃ الزہرہ (حصہ نظم)
۱۳۔ وصیت و وراثت اور کلالہ
۱۴۔ اخلاقی کمزوریاں
۱۵۔ الطلاق مرتٰن
۱۶۔ نمازِ پنجگانہ کا قرآنی ثبوت

فضل احمد کریم فضلی

(ممتاز شاعر، عظیم ناول نگار، آئی سی ایس افسر)

سید فضل احمد کریم فضلی (۱۹۰۶-۱۹۸۱ء) اُردو کے مشہور و معروف شاعر و ادیب ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصّہ ملازمت کے سلسلے میں مشرقی بنگال میں گزارا۔ اس خطّے میں انھوں نے عوام کی فلاح و بہبود اور اُردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے جو کام انجام دیے وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔

فضلی ۱۹۰۶ء میں الٰہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم علی گڑھ میں حاصل کی۔ ۱۹۲۸ء میں بی۔ اے کا امتحان الٰہ آباد یونیورسٹی سے پاس کیا۔ ۱۹۳۰ء میں آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء تک ٹریننگ کے سلسلے میں انگلینڈ میں مقیم رہے۔ واپس آئے تو بنگال میں ان کا تقرر ہوا۔ متحدہ بنگال کے مختلف علاقوں میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ مشہور زمانہ قحطِ بنگال میں وہ مشرقی بنگال کے ضلع میمن سنگھ میں بحیثیت کلکٹر متعین تھے۔ یہ وہی ضلع ہے جو قحط میں سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ فضلی صاحب نے قحط زدہ لوگوں کی دیکھ بھال میں دن رات ایک کر دیے۔

تقسیم کے بعد بھی مشرقی پاکستان میں ان کی خدمات جاری رہیں۔ وہ ایک عرصے تک شعبۂ تعلیم کے سکریٹری رہے۔ اس عہدے پر فائز رہتے ہوئے انھوں نے تعلیم و تعلّم اور اُردو زبان و ادب کی بڑی خدمت کی۔ مشرقی پاکستان کے پسماندہ علاقوں میں متعدد اسکول اور کالج قائم کیے۔

اس کے علاوہ جن علاقوں میں اُردو بولنے والے مہاجروں کی تعداد زیادہ تھی وہاں اُردو میڈیم اسکول کھولے۔ ان کے جانے کے بعد پھر کوئی اُردو اسکول قائم نہ ہوا۔ انھوں نے تمام سرکاری کالجوں میں اُردو کا شعبہ بھی قائم کیا۔ تقسیم کے فوراً بعد ڈھاکا یونیورسٹی میں اُردو آنرز اور ایم۔ اے کے کلاسیز انھیں کی کوششوں سے جاری ہوئے۔ وکٹوریا کالج، کومیلا میں ڈاکٹر اختر حمید خاں کو پرنسپل مقرر کیا (۱۹۵۱ء)۔ ۱۹۴۸ء میں علامہ ظفر احمد عثمانی جب ڈھاکا یونیورسٹی سے فارغ ہوئے تو انھیں مدرسہ عالیہ، ڈھاکا میں بحیثیت صدر مدرس لے آئے تاکہ ان کے علم و فضل سے مشرقی پاکستان کے طلبہ مستفید ہوتے رہیں۔

فضلی ایک بلند پایہ شاعر ہونے کے علاوہ ایک مجلسی انسان بھی تھے۔ مشرقی پاکستان میں جو اُردو شعر و ادب کی ایک دلآویز محفل سجی تھی وہ اس کے ایک ممتاز رکن تھے۔ مشاعروں اور ادبی نشستوں میں شریک ہوتے رہے۔ علامہ رضا علی وحشتؔ، علامہ تمنا عمادی، ڈاکٹر عندلیب شادانی، شرف الحسینی شرقؔ، خواجہ محمد عادل، خواجہ اسمٰعیل ذبیحؔ، آصف بنارسی، امیر الاسلام شرقیؔ، سلیم اللہ فہمی، شہاب رحمت اللہ اور پروفیسر اقبال عظیم وغیرہ ان کے دوستوں میں تھے۔ غالباً ۱۹۵۴ء میں ان کا تبادلہ مغربی پاکستان ہوگیا۔ اس کے باوجود ان کا تعلق مشرقی پاکستان سے منقطع نہ ہوا۔ وہ مشاعروں اور ادبی محفلوں میں شرکت کے لیے اور احباب و اقربا سے ملنے اکثر ڈھاکا آتے رہے۔

فضلی نہایت خلیق، بامروّت اور وضع دار انسان تھے۔ کسی ناقد کا یہ قول کہ اچھے شاعر کے لیے اچھا انسان ہونا بھی ضروری ہے، فضلی جیسے شاعروں پر صادق آتا ہے۔ وہ جتنے اچھے شاعر تھے اتنے ہی اچھے انسان بھی تھے۔ وہ نہایت ہی خوش گو اور خوش فکر شاعر تھے۔ وہ فطری طور پر غزل گو تھے۔ ان کے اشعار سہلِ ممتنع کی بہترین مثال ہیں اور یہی ان کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ ان کے یہاں پاکیزہ تغزل کے بڑے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ دو غزلیں یہاں درج کی جاتی ہیں:

اب وہ مہکی ہوئی سی رات نہیں بات کیا ہے کہ اب وہ بات نہیں
پھر وہی جاگنا ہے دن کی طرح رات ہے اور جیسے رات نہیں
بات اپنی تمھیں نہ یاد رہی خیر جانے دو کوئی بات نہیں
پھر بھی دل کو بڑی امیدیں ہیں گو بظاہر توقعات نہیں
عشق ہوتا ہے خود بخود پیدا عشق کے کچھ لوازمات نہیں
ایسے فضلی کے شعر کم ہوں گے جن میں کچھ دل کے واردات نہیں

☆☆☆☆☆

آتے رہتے ہیں قدسیوں کے پیام
شعر بھی اک طرح کا ہے الہام
عشق ہے کس قدر بلند مقام
اس سے آگے ہے بس خدا کا نام
کام ان کا ہے، دیں نہ دیں انعام
چاہیے ہم کو اپنے کام سے کام
زندگی ہے ازل سے تا بہ ابد
زندگی کی نہ کوئی صبح نہ شام
راہ رو تھک کے رہ گئے آخر
زندگی تھی کچھ ایسی تیز خرام
زلفِ دوراں سنوارنے والے
ہیں بڑی چیز شاعرانِ کرام
میں نے مانا کہ ہوں تہی ساغر
شکر صد شکر ہے تو ہاتھ میں جام

فضلی کا مجموعۂ کلام "چشمِ غزال" قیامِ ڈھاکا کے دوران ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔ ان کا پہلا مجموعہ "نغمۂ زندگی" ۱۹۴۰ء میں شائع ہو چکا تھا۔ "چشمِ غزال" کے بعد شاید ان کا کوئی اور مجموعہ شائع نہ ہوا، حالانکہ وہ اپنی وفات (۱۹۸۱ء) تک شعر کہتے رہے۔

فضلی ایک آئی سی ایس افسر تھے لیکن دوسرے افسروں کی طرح مغرب زدہ نہ تھے۔ وہ فکر ونظر کے لحاظ سے پورے مسلمان تھے۔ ہر سچے مسلمان کی طرح ان کی بھی یہی خواہش تھی کہ پاکستان میں اسلام کا عادلانہ نظام قائم ہو جائے۔ لہٰذا وقتاً فوقتاً اپنے ان خیالات کا اظہار وہ اپنی نظموں اور اشعار میں بھی کرتے رہے۔ اس سلسلے میں ان کی ایک طویل نظم "نذرِ اقبال" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس نظم میں انھوں نے نظریۂ پاکستان کی وضاحت بڑی خوبی سے کی ہے۔ اقبال سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

کر دیا تیری نواؤں نے دلِ مسلم دو نیم
ضرب جو تیری پڑی ثابت ہوئی ضربِ کلیم
اشتراکیت ہو یا سرمایہ داری کا نظام
دونوں ہی انساں کو انساں کا بناتے ہیں غلام
تھا ترا پیغام اک تفسیرِ قرآنِ کریم
تجھ پہ روشن ہو گئے تھے معنیٔ خُلقِ عظیم
تو نے مِلّت کو دکھایا خواب پاکستان کا
جو محافظ ہو گیا ہے دین کا ایمان کا
آ، اور آ کر آج اپنے خواب کی تعبیر دیکھ
سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ
دین کو کرنے لگے ہیں اب سیاست سے جدا
چل رہی ہے ملک میں ہر سمت لادینی ہوا

سرزمینی قومیت ہو یا لسانی قومیت
ہیں نگاہِ مردِ مومن میں یہ دونوں معصیت

ناول نگار

فضل احمد کریم فضلی ایک ممتاز و منفرد غزل گو کی حیثیت سے مشہور تھے لیکن اپنے عظیم ناول ''خونِ جگر ہونے تک'' کی وجہ سے وہ صفِ اوّل کے ناول نگاروں میں شامل ہو گئے۔ اس ناول کو اگر اُردو کا بہترین ناول کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ فکری اور فنی دونوں لحاظ سے یہ ناول ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔

''خونِ جگر ہونے تک'' بنگال کے مشہور قحط سے متعلق ہے۔ اس زمانے میں فضلی صاحب ایک آئی۔ سی۔ ایس افسر کی حیثیت سے یہیں متعین تھے۔ انھوں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور قحط سے پیدا شدہ آلام و مصائب کو ایک شاعر و ادیب کے دردمند دل سے محسوس کیا۔ یہ احساسات و مشاہدات ''خونِ جگر ہونے تک'' کی صورت میں ظہور پذیر ہوئے۔ یہ ناول اُردو ادب میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ فکر و فن کا جیسا حسین امتزاج اس ناول میں نظر آتا ہے کسی اور اُردو ناول میں نہیں ملتا۔ یہاں اس کی گنجائش نہیں کہ اس ناول پر تفصیلی گفتگو کی جائے۔ میں نے اپنے مضمون ''خونِ جگر ہونے تک۔ ایک مطالعہ'' (مطبوعہ ماہنامہ ''سیارہ'' لاہور، جولائی ۱۹۶۹ء) میں اس ناول کی فکری و فنی خوبیوں پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

اس مضمون کی اشاعت کے بعد فضلی صاحب کا کئی صفحات پر مشتمل ایک طویل خط ملا جس میں انھوں نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ ناول کی اشاعت (۱۹۵۷ء) کے بعد یہ پہلا تفصیلی مضمون ہے جو شائع ہوا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ترقی پسند نقادوں اور جائزہ نگاروں نے اس ناول کو نظر انداز کرنے کی پالیسی اختیار کی تھی، اس لیے کہ انھوں نے اسلامی نظریے کی حمایت اور مارکسی نظریے کی مخالفت کی تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے کمیونسٹوں کی چالبازیوں کو بھی مختلف

کرداروں کے روپ میں ظاہر کا تھا، فضلی صاحب نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا تھا کہ وہ اکثر ڈھاکا جاتے رہتے ہیں لیکن کسی ادبی نشست میں مجھ سے ان کی ملاقات نہ ہو سکی۔ فضلی صاحب کو کیا معلوم کہ یہ فقیر جوانی میں بھی گوشہ نشیں تھا۔

اس ناول کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ شروع سے آخر تک رومان و معاشقہ سے بالکل تہی ہونے کے باوجود نہایت دلچسپ ہے۔ اور اس مفروضے کو غلط ثابت کرتا ہے کہ بغیر معاشقہ کے ناول میں دلچسپی پیدا نہیں ہوتی۔ یہ ناول پاکستانی ناول نگاروں کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ ناول میں مصنف نے جا بجا اسلامی تعلیمات کو اس دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے کہ بے ساختہ زبان سے مرحبا نکل جاتا ہے۔ فضلی مرحوم کا یہ ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے کہ اُردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

فضلی نے ''خونِ جگر ہونے تک'' (۱۹۵۷ء) کا دوسرا حصّہ ''سحر ہونے تک'' کے نام سے لکھا جو غالباً ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔

فضلی صاحب کا آخری دور کراچی میں گزرا۔ انھوں نے معاشرے کی فکری اور عملی اصلاح کے لیے کئی فلمیں بھی بنائیں اور خود ہی ان کی کہانی، مکالمے اور گانے لکھتے رہے۔ اسلام کے عادلانہ نظام کے نفاذ کی خواہش ان کے دل میں ہمیشہ موج زن رہی۔ وہ اس کے لیے علمی اور عملی جدو جہد کرتے رہے۔ وہ مخلص اور بے باک انسان تھے۔ آخری عمر میں عارضۂ قلب میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ۱۷ر دسمبر ۱۹۸۱ء کو کراچی میں ان کی وفات ہوئی۔ اللہ مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔ آمین۔

❖❖

پروفیسر اقبال عظیم
(عظیم شاعر، عظیم انسان)

پروفیسر اقبال عظیم (۱۹۱۳ء-۲۰۰۰ء) مشرقی پاکستان کے بہترین غزل گو تھے۔ ان کے کلام میں تغزل اپنے پورے حسن ورعنائی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک خوش گو اور خوش فکر شاعر تھے۔ شعر پڑھنے کا انداز بھی بڑا دلکش تھا۔ اس پورے دور میں ایک غزل گو کی حیثیت سے نمایاں رہے۔

اقبال عظیم ۱۹۱۳ء میں میرٹھ (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن سہارنپور تھا۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے ۱۹۳۲ء میں بی۔اے اور آگرہ یونیورسٹی سے ۱۹۴۳ء میں اُردو میں ایم۔اے کیا۔ مارچ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۵۰ء تک یو پی کے محکمہ تعلیم سے منسلک رہے۔ اگست ۱۹۵۰ء میں ڈھاکا آگئے اور ڈھاکا گورنمنٹ کالج سے بحیثیت اُردو لیکچرار وابستہ ہوگئے۔ ۱۹۵۲ء میں ان کا تبادلہ چاٹگام ہوگیا۔ غالباً وہیں سے ۱۹۶۸ء میں ریٹائر ہوئے۔ اس کے بعد ڈھاکا آگئے۔ اس پورے دور میں ان کی ادبی سرگرمیاں ڈھاکا اور چاٹگام میں جاری رہیں۔

افسوس کہ آخری دور میں ان کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ اس کے بعد ان کے کلام میں درد اور کسک کا اضافہ ہوگیا۔ وہ ۱۹۷۰ء میں کراچی آگئے۔ خوش قسمت تھے کہ سقوطِ ڈھاکا کی آفتوں کا انھیں سامنا نہ کرنا پڑا۔ کراچی میں انھوں نے تقریباً تیس سال گوشہ نشینی کی زندگی گزاری۔ کبھی کبھی مشاعروں میں شریک ہو جاتے تھے۔ لیکن ان کی یہاں وہ پذیرائی نہ ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔

فرماتے ہیں:

جہاں بھی ہم نے صدا دی یہی جواب ملا
یہ کون لوگ ہیں پوچھو کہاں سے آئے ہیں

کراچی آنے کے بعد اقبال عظیم نے زیادہ تر نعتیں کہیں۔ ۲۳ر ستمبر ۲۰۰۰ء کو کراچی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اللہ مغفرت فرمائے۔

پروفیسر اقبال عظیم ایک باکردار شاعر، ادیب، دانشور اور استاد تھے۔ شاعر و ادیب ہونا ایک بڑی بات سہی لیکن اچھا اور بلند کردار انسان ہونا اس سے بھی بڑی بات ہے اور یہ چیز نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولوی روم "انسانم آرزو است" کا نعرہ لگاتے رہے۔ اقبال عظیم نے اپنی زندگی کے بہترین ایام مشرقی پاکستان میں گزار دیے۔ بڑھاپا آیا تو آنکھیں بھی ساتھ چھوڑ گئیں اور شریکِ حیات بھی۔ لیکن صبر و شکر کا دامن کبھی نہ چھوڑا۔ دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کی بہترین تربیت کی۔ بڑے مخلص، دیانت دار، نرم دل اور دردمند انسان تھے۔ نہ کبھی کسی کی غیبت کی نہ شکایت۔ کراچی سے ان کے حسبِ ذیل شعری مجموعے شائع ہوئے:

مضراب (غزلوں کا مجموعہ)۔ قابِ قوسین (نعتوں کا مجموعہ)۔ مضراب و رباب (غزلوں کا مجموعہ)۔ لب کشا (نعتیں اور غزلیں)۔ نادیدہ (غزلیں)۔ چراغِ آخرِ شب (غزلیں) اور ماحصل (کلیات)۔

اقبال عظیم ڈھاکا اور اس کی محفلِ شعر و ادب کو کبھی فراموش نہ کر سکے۔ کراچی پہنچ کر انھوں نے "شہرِ ڈھاکا" کے عنوان سے جو نظم لکھی وہ اپنے اندر ایک عجیب تاثیر رکھتی ہے۔ نظم دیکھیے:

"شہرِ ڈھاکا"

زخمِ دل لے آئے اور خندہ بھی چھوڑ آئے ہم
دوستوں کی انجمن میں ہر خوشی چھوڑ آئے ہم

شہر ڈھاکا چھوڑ کر محسوس ہوتا ہے ہمیں
اپنے پیچھے ایک پوری زندگی چھوڑ آئے ہم
دل کے ہر گوشے میں ہیں آباد اس بستی کے لوگ
جس کے بازاروں میں اپنی روشنی چھوڑ آئے ہم
ایک مدت کی رفاقت بھی نہ راس آئی جہاں
اس دیارِ غیر میں اک زندگی چھوڑ آئے ہم
عمر بھر یاد آئیں گی وہ بے تکلف محفلیں!
جن میں اک بے لوث رسمِ دوستی چھوڑ آئے ہم
پھول تو پھر پھول ہیں کانٹے بھی یاد آنے لگے
اب یہ صدمہ ہے کہ لطفِ دشمنی چھوڑ آئے ہم
اتفاقاً آ ہی جاتی تھی لبوں تک جو ہنسی
راستوں کے پیچ و خم میں وہ ہنسی چھوڑ آئے ہم
تاکہ ڈھاکا سے ہماری یاد وابستہ رہے
شہر میں خاک شریکِ زندگی چھوڑ آئے ہم
شعر ڈھلتے تھے جہاں، نغمے بکھرتے تھے جہاں
وہ شبستانِ عروسِ شاعری چھوڑ آئے ہم
ناز ہے اقبالؔ ہم کو اپنے اس احساس پر
خود چلے آئے مگر اپنی کمی چھوڑ آئے ہم

اقبال عظیم نے شہر ڈھاکا کو "شبستانِ عروسِ شاعری" بالکل درست کہا ہے۔ جو بھی اس شبستاں سے نکلا، اس کی یاد میں تڑپتا رہا۔ لیکن افسوس کہ یہ محفلِ شعر و ادب ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو اُجڑ گئی۔ "عروسِ شاعری" کا سہاگ لٹ گیا۔ ایک عرصہ گزر گیا، آنکھیں اب بھی اس کے لیے روتی ہیں۔

دل اب بھی اس کے لیے مچلتے ہیں۔ یہ ایک ایسا صدمہ ہے جو اس محفل میں شریک ہونے والوں کے دل سے کبھی نہ نکلے گا، خواہ وہ دنیا کے کسی خطے میں چلے جائیں۔

اقبال عظیم ایک منفرد غزل گو تھے۔ ان کے خیالات واضح، زبان صاف ستھری اور اندازِ بیان دلکش تھا۔ فکر و نظر کی بلندی اور اخلاقی اقدار کی پاسداری کا قدم قدم پر احساس ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک جادو بیاں شاعر تھے۔ جب مشاعروں میں اپنا کلام ترنم سے سناتے تھے تو ایک سماں بندھ جاتا تھا۔

منتخب اشعار:

روشنی مجھ سے گریزاں ہے تو شکوہ بھی نہیں
میرے غم خانے میں کچھ ایسا اندھیرا بھی نہیں

بے نیازانہ گزر جائے گزرنے والا!
اب نظر پہلی سی بے تابِ تمنا بھی نہیں

پرسشِ حال کی فرصت تمھیں ممکن ہے نہ ہو
پرسشِ حال طبیعت کو گوارا بھی نہیں

یوں سرِ راہ ملاقات ہوئی ہے اکثر
تم نے دیکھا بھی نہیں، ہم نے پکارا بھی نہیں

مرے دل پہ نقش ہیں آج تک وہ بہ احتیاط نوازشیں
وہ غرور و ضبط عیاں عیاں، وہ خلوص و ربط نہاں نہاں

مری خلوتوں کی یہ جنتیں کئی بار سج کے اجڑ گئیں
مجھے بارہا یہ گماں ہوا کہ تم آ رہے ہو کشاں کشاں

ایک دورِ زندگی یوں ناگہاں یاد آگیا

لمحہ لمحہ داستاں در داستاں یاد آگیا

جس سفر کی یاد سے وابستہ ہیں کچھ حادثات

وہ سفر پھر کارواں در کارواں یاد آگیا

جن چراغوں کو بجھا کر ہم اٹھے تھے بزم سے

وقتِ رخصت ان چراغوں کا دھواں یاد آگیا

چند تنکے، چند شعلے، کچھ سہارے، کچھ فریب

وہ چمن، وہ آشیاں، وہ باغباں یاد آگیا

باوجودِ ضبطِ غم، آنکھیں بھی نم، دامن بھی نم

اپنے اس عالم میں اک تسکینِ جاں یاد آگیا

☆☆☆☆☆

زہر دے دے نہ کوئی گھول کے پیمانے میں

اب تو جی ڈرتا ہے خود اپنے ہی میخانے میں

سارا ماضی مری آنکھوں میں سمٹ آیا ہے

میں نے کچھ شہر بسا رکھے ہیں ویرانے میں

پیاس کانٹوں کی بجھاتا ہے لہو سے اپنے

کتنی بالغ نظری ہے ترے دیوانے میں

مجھ پہ تنقید بھی ہوتی ہے تو القاب کے ساتھ

کم سے کم اتنا سلیقہ تو ہے بیگانے میں

میں نے یہ سوچ کے ان سے کبھی شکوہ نہ کیا

بات کچھ اور اُلجھ جاتی ہے سلجھانے میں

اس کو کیا کہتے ہیں اقبآل کسی سے پوچھو
دل نہ اب شہر میں لگتا ہے نہ ویرانے میں

بالاہتمام ظلم کی تجدید کی گئی اور ہم سے صبر و ضبط کی تاکید کی گئی
اوّل تو بولنے کی اجازت نہ تھی ہمیں اور ہم نے کچھ کہا بھی تو تردید کی گئی
اپنی زباں سے میں نے کبھی کچھ نہیں کہا پھر بھی مرے خلوص پہ تنقید کی گئی
جینے کا کوئی ایک سہارا تو چاہیے ڈر ڈر کے کی گئی مگر اُمید کی گئی
گھر کے چراغ اور بھی بے نور ہو گئے اس درجہ خاطرِ مہ و خورشید کی گئی
ضد میں نقاب پوش ہوا حُسنِ بے نقاب اقبآل جب کبھی طلبِ دید کی گئی

وائے مجبوری کہ اوروں کی خوشی کے واسطے
اپنا دامن ان کے ہاتھوں سے چھڑا لینا پڑا

☆☆☆☆☆

جہاں چھٹا تھا مرے ہاتھ سے ترا دامن
بھٹک رہی ہے وہیں اب بھی زندگی اے دوست

☆☆☆☆☆

اپنے مشکوک عزائم کو عزائم کہہ کر
پے بہ پے کوششِ ناکام کو الزام نہ دو

☆☆☆☆☆

اپنی مٹی ہی پہ چلنے کا سلیقہ سیکھو
سنگِ مرمر پہ چلوگے تو پھسل جاؤگے

☆☆☆☆☆

مجھے ملال نہیں اپنی بے نگاہی کا
جو دیدہ ور ہیں انھیں بھی نظر نہیں آتا

نعت گوئی:

کراچی آنے کے بعد اقبال عظیم نے زیادہ تر نعتیں کہیں اور دل کی گہرائیوں سے کہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں لطف و اثر بھی زیادہ ہے۔ غزلوں کی طرح ان کی نعتوں میں بھی ایک خاص انفرادیت ہے۔ ان کی نعتوں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے۔ ذیل میں نمونے کے طور پر ان کی ایک مشہور نعت درج کی جاتی ہے جو ریڈیو، ٹی وی اور کیسٹ پر قاری وحید ظفر قاسمی کی آواز میں اکثر سنائی دیتی ہے:

فاصلوں کو تکلف ہے ہم سے اگر
ہم بھی بے بس نہیں، بے سہارا نہیں
خود انھیں کو پکاریں گے ہم دور سے
راستے میں اگر پاؤں تھک جائیں گے

ہم مدینے میں تنہا نکل جائیں گے
اور گلیوں میں قصداً بھٹک جائیں گے
ہم وہاں جا کے واپس نہیں آئیں گے
ڈھونڈتے ڈھونڈتے لوگ تھک جائیں گے
جیسے ہی سبز گنبد نظر آئے گا
بندگی کا قرینہ بدل جائے گا
سر جھکانے کی فرصت ملے گی کسے
خود ہی پلکوں سے سجدے ٹپک جائیں گے
نامِ آقا جہاں بھی لیا جائے گا
ذکر ان کا جہاں بھی کیا جائے گا

نور ہی نور سینوں میں بھر جائے گا
ساری محفل میں جلوے لپک جائیں گے
اے مدینے کے زائر خدا کے لیے
داستانِ سفر مجھ کو یوں مت سنا
بات بڑھ جائے گی، دل تڑپ جائے گا
میرے محتاط آنسو چھلک جائیں گے
ان کی چشمِ کرم کو ہے اس کی خبر
کس مسافر کو ہے کتنا شوقِ سفر
ہم کو اقبالؔ جب بھی اجازت ملی
ہم بھی آقا کے دربار تک جائیں گے

اقبال عظیم ایک اچھے نثر نگار اور متعدد کتابوں کے مصنف و مؤلف بھی تھے۔ ''مشرقی بنگال میں اُردو'' ان کی شاہکار تصنیف ہے۔

محترمہ فرحت پروین ملک نے اپنی کتاب ''دربارِ ادب'' میں اقبال عظیم کا ایک خوب صورت خاکہ ''ایک دن ہم بھی بہت یاد کیے جائیں گے'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ جس میں ان کے اعلیٰ اخلاق و کردار کی عکاسی بڑی خوبی سے کی گئی ہے۔

❖❖

شہاب رحمت اللہ

(شاعر، ادیب، مصور، آئی سی ایس افسر)

شہاب رحمت اللہ (۱۹۱۳ء۔ ۱۹۹۱ء) سابق مشرقی پاکستان کے مشہور و معروف آئی سی ایس افسر اور شاعر و مصور تھے۔ اُردو اور انگریزی تحریر و تقریر پر انھیں یکساں عبور حاصل تھا۔ وہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ انھوں نے اُردو اور انگریزی میں متعدد کتابیں لکھیں۔ ان کی مشہور کتاب ''آرٹ اِن اُردو پوئٹری'' اسی دور میں شائع ہوئی۔

شہاب الدین رحمت اللہ نام اور شہاب تخلص تھا۔ وہ ۹ رجون ۱۹۱۳ء کو ضلع شاہ آباد (بہار) میں پیدا ہوئے۔ عمر کا بیشتر حصہ بنگال میں گزرا۔ وہ بیرسٹر ایٹ لاء اور آئی سی ایس افسر تھے۔ ان کی پہلی تقرری ۱۹۳۷ء میں نتر وکونا (مشرقی بنگال) میں ایس ڈی او کی حیثیت سے ہوئی۔ پاکستان بننے پر وہ ڈھاکا کے پہلے ڈی سی مقرر ہوئے اور ڈھاکے میں پہلا پاکستانی جھنڈا لہرایا۔ آخر میں وہ مشرقی پاکستان میں مسلسل پانچ سال تک کمشنر رہے۔ اس کے بعد وہ حکومتِ پاکستان کے منصوبہ بندی کمیشن کے سکریٹری کے عہدے پر فائز کیے گئے۔ لیکن جنرل ایوب خاں کے فوجی انقلاب کے بعد ۱۹۵۹ء میں وہ ریٹائر ہو گئے۔ اس کے بعد ڈھاکا واپس آ کر اپنا ''لاء چیمبر'' یعنی قانونی مشاورتی ادارہ قائم کیا اور سقوطِ ڈھاکا تک یہیں رہے۔

شہاب رحمت اللہ مشرقی پاکستان میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ ان میں خدمتِ خلق کا جذبہ بھی موجود تھا۔ انھیں اُردو زبان و ادب اور تعلیم کے فروغ و اشاعت سے خاص

دلچسپی تھی۔ انھوں نے اس سلسلے میں بہت سی عملی خدمات بھی انجام دیں۔ ''رحمت اللہ اکیڈمی، نرائن گنج''، ''رحمت اللہ ہائی اسکول، ڈھاکا'' اور ''قایدِ اعظم کالج، ڈھاکا'' انھیں کے قائم کردہ تھے۔

شہاب رحمت اللہ ایک اچھے غزل گو تھے۔ ان کی غزلیں کلاسیکی انداز کی ہوتی تھیں۔ انھیں زبان وبیان پر قدرت حاصل تھی۔ وہ مشاعروں میں بھی شریک ہوتے رہے۔ ڈاکٹر شادانی ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ انھوں نے کئی بڑے مشاعروں کی صدارت بھی کی۔

سقوطِ ڈھاکا کے بعد ۳۰ رجون ۱۹۷۲ء کو وہ بڑی مشکل سے مع اہل وعیال نیپال اور تھائی لینڈ ہوتے ہوئے کراچی پہنچے۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد ان پر جو کچھ بیتی اس کی روداد انھوں نے بڑی تفصیل سے اپنی کتاب ''شہاب بیتی'' میں بیان کی ہے۔ یہ ایک عبرت ناک روداد ہے۔

کراچی آنے کے بعد شہاب صاحب نے اپنا زیادہ تر وقت تصنیف وتالیف میں گزارا۔ انگریزی میں اقبال کے ''بانگِ درا'' کا ترجمہ کیا۔ یہ ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ دو شعری مجموعے ''مرقعِ شہاب'' اور ''سحرِ حلال'' شائع کیے۔ ان مجموعوں میں ان کی بنائی ہوئی تصویریں بھی شامل ہیں۔ انھوں نے ''سحرِ حلال'' کا انگریزی ترجمہ بھی کیا جس کا نام ''شہاب اِن انگلش'' تھا۔ ''شہاب بیتی کے نام سے اپنی سوانح بھی لکھی۔ ۳۰ راکتوبر ۱۹۹۱ء کو کراچی میں ان کی وفات ہوئی۔ اللہ مغفرت فرمائے۔

ایک بیٹا اور دو بیٹیاں یادگار چھوڑیں۔

(''محفل جو اجڑ گئی'')

نمونۂ کلام

شہاب رحمت اللہ صرف غزلیں کہتے تھے۔ ذیل میں چند غزلیں پیش کی جاتی ہیں:

ہے اس میں روحِ نشاطِ عالم خیال رکھنا کہیں نہ چھلکے
یہ ساغرِ مے ہے میرے ساتھی اسے اٹھانا ذرا سنبھل کے

ہمارے غم کے قلیل لمحے سحر کے پہلے کے ہیں دھندلکے
اب ان مصائب پہ خاک ڈالو گزر گئے واقعے جو کل کے
خزاں میں کیا پھول مسکرائیں نہ بلبلیں ہیں کہ نغمہ گائیں
بہار قدموں میں ہے ہمارے چمن میں آئیں تو گھر سے چل کے
یہ چاند سورج ہوں یا ستارے سبھی ہیں ظلمت شکن جہاں میں
انھیں کے دم سے تو روشنی ہے نہیں جو تھکتے کبھی جو چل کے
ہے بلبلوں میں نفاق کیسا، یہ کیسا آپس میں تفرقہ ہے
ہزاروں صیاد گھات میں ہیں، چمن سے دیکھے کوئی نکل کے
شہابؔ میرا کلام کیا ہے یہ شعر کیا ہیں مری غزل کے
زباں سے میری جو سن رہے ہیں نقوشِ دل ہیں وہ سب ازل کے

ابرِ سیاہ برق بہ داماں نہ پوچھیے
زیرِ نقاب جلوۂ تاباں نہ پوچھیے
ہر اشک میں تبسمِ رقصاں نہ پوچھیے
وہ لذتِ ندامتِ عصیاں نہ پوچھیے
گل لاکھ ہنس رہے ہیں مگر ان کے عشق میں
رکھتے ہیں کیا جراحتِ پنہاں نہ پوچھیے
تیغِ ادا، خدنگِ نظر سب سہی مگر
کیا ہے وہ التفاتِ گریزاں نہ پوچھیے
مظہر ہے آپ چاکِ گریبانِ گل شہاب
گلچیں سے داستانِ گلستاں نہ پوچھیے

شکستہ سنگِ حوادث سے شیشۂ احساس
کوئی پڑا ہے ترے در پہ کھو کے ہوش و حواس
خزاں میں پھول تو کھلنے کو کھل ہی جاتے ہیں
گلِ بہار کی ہوتی ہے اور ہی بو باس!
عجب طرح کی نزاکت ہے میرے شعروں میں
یہ برگ ہیں وہی ہمدم جو کاٹ دیں الماس
وہی ہیں زندہ حقیقت میں جو سمجھتے ہیں
کہ موت کیا ہے بجز زندگی بے احساس
نبات و قند بھی جس پر ہیں زہر کھائے ہوئے
شہابؔ تیرے ترنم کی اور ہی ہے مٹھاس

جنہیں جانتے ہیں مصیبتیں، وہ ہیں زندگی کی حقیقتیں
وہی ان کی جانے گا لذتیں جسے کچھ کسی سے گلہ نہیں
مجھے پورے باغ سے پیار ہے جہاں ساتھ پھول کے خار ہے
یہ بہار پھر بھی بہار ہے میں خزاں سے بھی تو خفا نہیں
تجھے زندگی کا غرور ہے یہ شہابؔ تیرا قصور ہے
تجھے یاد شامِ فنا نہیں، تجھے فکرِ صبحِ بقا نہیں

❖❖

ڈاکٹر اختر حمید خاں

(نامور شخصیت، گمنام شاعر)

ڈاکٹر اختر حمید خاں ۱۹۱۴ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں میرٹھ کالج سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ ۱۹۳۶ء میں آئی سی ایس کے مقابلے میں منتخب ہو کر دو سال کے لیے کیمبرج چلے گئے۔ کیمبرج میں قیام کے دوران انھوں نے پی ایچ ڈی بھی کرلی۔ واپسی پر صوبہ بنگال میں تعیناتی ہوئی۔ لیکن سرکاری افسری کا کرّ و فر انھیں پسند نہ آیا اور "خاکسار تحریک" میں شامل ہو گئے۔ علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی سے قربت حاصل ہوئی اور ان کی صاحب زادی سے شادی بھی ہو گئی۔ ۱۹۴۴ء میں ملازمت سے استعفیٰ دے کر غریبانہ اور آزادانہ طریقہ اختیار کرنا چاہا لیکن اس کوشش میں کچھ زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ اس دور میں علی گڑھ میں تالا بنانے کا ایک چھوٹا سا کارخانہ قائم کیا اور خود بھی کاریگروں کے ساتھ کام کرتے رہے۔ ناکام ہو کر میرٹھ آ گئے۔ خاکسار تحریک کا انگریزی جریدہ "ریڈینس" نکالا۔ پروفیسر کرّار حسین بھی ان کے ساتھ تھے۔ آگے چل کر ان دونوں کے علامہ مشرقی سے اختلافات پیدا ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء میں "جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی" میں استاد بن گئے۔ آزادیٔ ہند کے بعد فسادات کا زمانہ وہیں گزرا۔ ۱۹۵۰ء میں کومیلا (مشرقی پاکستان) چلے آئے۔ آٹھ سال تک "وکٹوریہ میموریل کومیلا کالج" کے پرنسپل رہے۔ اس کے بعد کومیلا اکیڈمی، دیہاتیوں کی فلاح و بہبود کے لیے قائم کی۔ ۱۹۷۱ء تک وہ اس کے ڈائرکٹر رہے۔ اپنی خدمات کی وجہ سے وہ اس علاقے میں بہت مشہور و مقبول ہو گئے۔ کومیلا کے لوگ اب تک انھیں یاد کرتے ہیں۔

۱۹۷۱ء میں سقوطِ مشرقی پاکستان سے کچھ پہلے ڈاکٹر صاحب کراچی آ گئے۔ اپریل ۱۹۸۰ء میں اورنگی آزمائشی منصوبہ کی بنیاد ڈالی اور اپنی موت تک اس سے وابستہ رہے۔ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۹۹ء کو امریکہ میں ان کی وفات ہوئی اور ۱۵ر اکتوبر بروز جمعہ چار بجے شام ان کے جسدِ خاکی کو اورنگی آزمائشی منصوبہ کے احاطے میں دفن کر دیا گیا۔

اختر حمید خاں ایک پُر اثر اور اعلیٰ شخصیت کے حامل تھے۔ ان کا علم و مطالعہ وسیع تھا اور عمل کی بھی اعلیٰ صلاحیت حاصل تھی۔ وہ زندگی بھر اپنی فکر و نظر کے مطابق عمل کرتے رہے۔ وہ محض منصوبے نہیں بناتے تھے بلکہ انھیں عملی جامہ بھی پہناتے تھے۔ ان کی فکر و نظر اور دینی عقائد میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہیں۔ آخر میں ان کے بعض عقائد سے متعلق لوگوں میں بدظنی بھی پھیل گئی۔ لیکن عقائد سے قطع نظر وہ زندگی بھر خدمتِ خلق میں مصروف رہے۔ وہ جہاں بھی رہے غریب اور نچلے طبقے کے لوگوں کی زندگی سدھارنے اور ان کے مصائب دور کرنے میں لگے رہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک آزاد فکر اور روشن خیال عالم تھے۔ روایت پرستی سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔

("محفل جو اجڑ گئی")

"چراغ اور کنول"

یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اختر حمید خاں ایک اچھے اور منفرد شاعر بھی تھے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اپنی ناموری کے باوجود ایک شاعر کی حیثیت سے وہ ہمیشہ گمنام رہے۔ ان کا مجموعۂ کلام "چراغ اور کنول" ۱۹۶۷ء میں کومیلا سے شائع ہوا۔ اس کے دیباچہ "تعارف" سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

"اختر حمید خاں نے اُردو، انگریزی، عربی، فارسی اور بنگالی ادب کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔ ان کو دینیات اور اقتصادیات سے بھی گہرا شغف ہے۔ کومیلا کے اقتصادی تجربات کی بنا پر ان کو 'ستارۂ پاکستان' اور جمہوریہ فلپین کا 'میگسا ساری ایوارڈ' ملا ہے اور مشی گن اسٹیٹ

یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی ہے۔ اختر حمید خاں نہایت کم آمیز اور تنہائی پسند ہیں۔ وہ شعر اپنا دل بہلانے کو کہتے ہیں۔ نہ رسالو میں چھپواتے ہیں، نہ مشاعروں میں پڑھتے ہیں۔ اب تیس سال میں وقتاً فوقتاً لکھی ہوئی نظموں کو تاریخی ترتیب سے جمع کر کے اہلِ نظر کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔"

"چراغ اور کنول" میں ۱۰۲ نظمیں ہیں۔ اختر حمید غزل نہیں کہتے تھے۔ ان کی نظموں پر مغربی شاعری کا اثر نمایاں ہے لیکن اس میں اُردو شاعری کی روایات بھی رچی بسی ہوئی ہیں۔ ان نظموں میں فکر و فلسفہ بھی ہے اور رومان بھی۔ معاشرے کی عکاسی بھی ہے اور ایک بے قرار روح کی ترجمانی بھی۔ اور اس پر زبان و بیان کا حُسن مستزاد۔ اختر صاحب کے اس مجموعے کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس پایہ کا شاعر اس قدر گمنام کیسے رہ گیا۔ جب کہ ان سے بہت کم تر درجے کے شاعر ممتاز شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ انھیں رسالوں میں چھپنے چھپانے اور مشاعروں سے بھی دلچسپی نہیں رہی۔ اسمیں شک نہیں کہ اختر حمید خاں کا یہ مجموعہ اُردو شعری کے ذخیرے میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

ذیل میں ان کی تین نظمیں نموتاً پیش کی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی اکثر نظمیں چھوٹی بحروں میں ہیں۔

"قلندر"

رنگ برنگی بادل چھائے
اودے، نیلے، لال
ندی کنارے ہوا چلے ہے
مست ہاتھی کی چال
باج رہے ہیں دھیمے سُر کے
اونچے سُر کے تال

گورے ماتھے پر ناچ رہے ہیں
گھونگھر والے بال

روپ کے بکے کھیت کھڑے ہیں
نین اور ہردے کا کال
مست قلندر ہنس کر بولا
بھیّا دنیا کا مال
ایک نظر اور دل کے علاوہ
سب جی کا جنجال"

(کیمبرج ۱۹۳۷ء)

"شب قدر"

وہ ساعت سعد تھی قدر کی
ہاتف نے یہ غیب سے صدا دی
"ہم نے تجھے منتخب کیا ہے
تجھ کو دل بے قرار دے کر
سامان عجیب عیش کا دیا ہے
راضی نہیں عز و جاہ سے تو
تکتا ہے ہمیں نگاہ سے تو
کہتا ہے مآل زیست کیا ہے؟

طاقت تری آزمائیں گے ہم
وہ راہ تجھے چلائیں گے ہم
جس کی بہت دور انتہا ہے
ہم کرتے ہیں دوستی بہت کم
ارباب ہمم کے دوست ہیں ہم
آئے جو بلند حوصلہ ہے"

(۱۹۴۳ء۔ تواگاؤں)

اس مجموعے کی آخری نظم "حمیدہ بیگم" ہے۔ حمیدہ بیگم، اختر حمید خاں کی اہلیہ اور علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی (خاکسار تحریک کے بانی) کی بیٹی تھیں۔ غالباً ۱۹۶۶ء میں لاہور میں کینسر کے مرض میں ان کی وفات ہوگئی۔ یہ نظم ان کی وفات کے بعد لکھی گئی ہے۔

حمیدہ بیگم

پھر نہ بیٹھو گی کبھی آ کر ہمارے پاس تم
پھر نہ پائیں گے کبھی وہ صورتِ محبوب ہم
پھر نہ دیکھیں گے تمھیں بیٹھا ہوا محوِ خیال
پھر نہ پوچھو گی ہمارا خستگی میں حال تم

پھر نہ لرزائے گی ہم کو آپ کی شانِ جلال
پھر نہ ہوں گے سرزنش سے آپ کے محجوب ہم
آسرا ہم کو نہ دے گا آپ کا عزمِ بلند
حوصلہ آ کر بڑھاؤ گی نہ وقتِ یاس تم

پھر نہ آنکھوں کو نظر آئے گا وہ پیارا جمال
پھر نہ کانوں سے سنیں گے، لہجۂ مرغوب ہم
یاد آئیں گی شبانہ روز خاطر داریاں
وہ تواضع، وہ محبت، مہربانی، شفقتیں
وہ تمھارا نفس کش ایثار، محنت کش اصول
سخت کوشی، راحت و آرام سے بے زاریاں

سختیوں کے بعد اب آرام فرمائیں گی آپ
صبح دم مہکا کریں گے آپ کی تربت کے پھول
رات کو سایہ کریں گی آسمانی رحمتیں
اور جب گھیریں گی مجھ کو زندگی کی سختیاں
گاہے گاہے خواب میں مجھ کو نظر آئیں گی آپ
گاہے گاہے میری خاطر آپ کا ہوگا نزول

(۱۹۶۶ء۔کومیلا)

"چراغ اور کنول" کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۸ء میں کراچی سے شائع ہوا جس میں دس نظموں کا اضافہ ہے، یہ نظمیں ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۳ء تک کراچی میں کہی گئی ہیں۔ تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔

اختر حامد خاں نے اپنے بڑے بھائی کا خاکہ "بھائی صاحب" ("چند بزرگ") کے عنوان سے اور فرحت پروین ملک نے "بیسویں صدی کا گوتم بدھ" ("دربارِ ادب") کے عنوان سے لکھا ہے۔ یہ دونوں خاکے بہت دلچسپ اور قابلِ مطالعہ ہیں۔

❖❖

افسر ماہ پوری

(شاعر، افسانہ نگار، مبصر)

افسر ماہ پوری (ظہیر عالم صدیقی) مشہور و معروف شاعر، افسانہ نگار، مضمون نگار اور مقدمہ نگار تھے۔ ۱۹۱۸ء میں موضع ماہ پور (ضلع چھپرا، بہار) میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں کلکتہ چلے آئے۔ ۱۹۳۸ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک پاس کیا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد ہی بنگال سکریٹریٹ میں ملازم ہو گئے۔ تقسیم کے بعد ڈھاکا تبادلہ ہوا جہاں ۱۰ر جنوری ۱۹۷۴ء کو حکومتِ بنگلہ دیش کے تحت ملازمت اختتام پذیر ہوئی اور وہ اسی سال ۲۳ر جنوری کو اپنے اہل و عیال کے ساتھ کراچی آ گئے۔

افسر ماہ پوری نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۶ء میں نثر نگاری سے کیا۔ افسانے اور مضامین لکھتے رہے۔ ۱۹۴۳ء میں پہلی نظم لکھی اور اس کے بعد نظم نگاری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ فروری ۱۹۴۸ء میں ڈھاکا پہنچنے کے بعد پہلی بار "یوم اقبال" کے موقع پر غزل کہی اور اس کے بعد غزلیں بھی کہنے لگے۔ مشرقی پاکستان کی محفلِ شعر و ادب کے ابتدائی دور کے بارے میں افسر ماہ پوری اپنے مجموعۂ کلام "غبارِ ماہ" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"میں ۱۳ر فروری ۱۹۴۸ء کو ڈھاکا پہنچا۔ ہر چند ڈھاکا اور اہلِ ڈھاکا اُردو سے نامانوس نہ تھے مگر اس وقت کوئی انجمن فعال نہ تھی۔ اس لیے ہجرت کر کے آنے والے شاعروں اور ادیبوں کے لیے ملنے ملانے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار و ابلاغ کی کوئی صورت نہ

تھی۔ اس کی تلافی قیام پاکستان کے بعد ڈھاکا میں پہلی ادبی انجمن "دائرۂ ادب" قائم کر کے کی گئی۔ میں اس کا معتمد اور رفقائے کار میں ڈھاکے کے مقامی شاعر حافظ ظہور السبار کی اور عابد داناپوری، وفا راشدی وغیرہ شامل تھے۔ اس کے جلسوں میں ہر مکتبِ فکر کے ادباء و شعراء شریک ہوتے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی مرحوم اس دائرے کے سرپرست تھے۔ دائرے کے جلسوں میں جن ادیبوں اور شاعروں نے بطور صدر مہمان شرکت کی ان میں بابائے اردو مولوی عبدالحق، علامہ وحشت کلکتوی، علامہ تمنا عمادی، ڈاکٹر عندلیب شادانی، سلیم اللہ فہمی، شہاب الدین رحمت اللہ شہاب، جگر مراد آبادی، حیدر دہلوی، فضل احمد کریم فضلی اور کیفی چریا کوٹی نمایاں ہیں۔ ریڈیو پاکستان سے وابستہ حضرات بھی اس کی نشستوں میں شریک ہوتے تھے۔ ان شرکاء میں راز مراد آبادی، مختار زمن اور کلیم اللہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔"

افسر ماہ پوری نے شروع سے آخر تک اس محفل کی ادبی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ ادبی محفلوں اور مشاعروں میں برابر شریک ہوتے رہے اور ان کی نظمیں، غزلیں، افسانے، مضامین اور ترجمے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ اس دور میں قاضی نذرالاسلام کی نظموں کا ترجمہ "جامِ کوثر" کے نام سے کیا۔

افسر ماہ پوری، بہت مہذب، بااخلاق اور مجلسی انسان تھے۔ ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا جس میں ہر مکتبِ فکر کے لوگ شامل تھے۔

کراچی سے ان کے دو مجموعے "غبارِ ماہ" (غزلوں کا مجموعہ) اور "نگارِ ماہ" (نظموں کا مجموعہ) شائع ہوئے۔ کراچی آنے کے بعد انھوں نے بہت سے شعری مجموعوں پر مقدمے لکھے جو بہت پسند کیے گئے۔ فروری ۱۹۹۵ء میں کراچی میں ان کا انتقال ہوا۔ اللہ مغفرت فرمائے۔

("محفل جو اجڑ گئی")

افسر ماہ پوری کی وفات کے بعد ان کے صاحب زادے ڈاکٹر حامد ظہیر نے ان کی تمن

کتابیں شائع کیں۔ ''حرا سے طور تک'' (نعتوں کا مجموعہ)، ''دیارِ ماہ'' (غزلوں کا مجموعہ) اور ''سوکھی چھاں'' (افسانوں کا مجموعہ)۔

دوسری ہجرت کے اثرات

سابق مشرقی پاکستان (حالیہ بنگلہ دیش) سے دوسری ہجرت کرکے آنے والے شاعروں کے لیے سقوطِ ڈھاکا ایک ایسا دردناک سانحہ تھا جسے وہ کبھی نہ بھلا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ان شاعروں کے کلام میں ایک ایسی کسک پیدا ہوگئی ہے جسے اہلِ دل ہی محسوس کرسکتے ہیں۔ افسر ماہ پوری اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''زندگی کے شب و روز بظاہر سکون سے گزر رہے تھے لیکن یہ سکون چشمِ فلک سے دیکھا نہ گیا۔ چنانچہ مشرقی پاکستان کے سینے میں جو سیاسی لاوا روزِ ازل ہی سے پرورش پا رہا تھا وہ ۱۹۷۱ء تک آتے آتے پھٹ پڑا جس کے سیلِ بلاخیز میں مشرقی پاکستان کی اُردو بولنے والی آبادی خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی۔ لاکھوں قتل ہوئے، لاکھوں اِدھر اُدھر بھاگ گئے اور لاکھوں پاکستان کے اس حصے میں پناہ گیر بنے۔ اس انسانی تاریخ کے سب سے بڑے المیہ کی تفصیلات لکھنا تحصیلِ حاصل ہے۔''

(''جمیل عظیم آبادی۔ شخصیت اور فن۔'' ص: ۳۸، ۳۹)

افسر ماہ پوری نے خود دوسری ہجرت کی تھی، وہ اس درد کو خوب سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنی ایک نظم ''زرد پتے'' میں دوسری ہجرت کرنے والوں کی ترجمانی بڑی خوبی سے کی ہے:

''زرد پتے''

یہ زرد پتے،
بچھڑ کے شاخوں کی انجمن سے
بھٹکتے پھرتے ہیں صحرا صحرا

تڑپتے پھرتے ہیں قریہ قریہ
سسکتے پھرتے ہیں کوچہ کوچہ
نہ ان کا دنیا میں کوئی مولا، نہ کوئی ملجا، نہ کوئی ماوئی
خزاں کی سفاکیوں سے لرزاں، خموش گریاں
سموم وصرصر کی ٹھوکروں سے
جہاں میں ہر سو بکھر گئے ہیں
چمن کے دل میں اتر گئے ہیں
شفق کی قندیل بجھ چکی ہے
افق پہ چھانے لگا اندھیرا
تھکے پرندوں کے قافلے بھی
رواں دواں سوئے گلستاں ہیں
مگر یہ بے خانماں مسافر...... یہ زرد پتے
سوال کرتے ہیں ہر شجر سے
کہ ہم کہاں ہیں؟...... کہیں ہمارے بھی آشیاں ہیں؟

افسر پہلے بھی پاکستان کی محبت میں سرشار تھے اور دوسری ہجرت کے بعد بھی سرشار رہے۔ ان کی نظم "نغمۂ ربانی" دیکھیے:

ہمارا وطن، یہ تمھارا وطن

یہ زمیں پر خدا کا اُتارا وطن
یہ کتابِ مُبیں کا سپارا وطن
یہ سپہرِ رسالت کا تارا وطن
مظہرِ نورِ وحدت یہ سارا وطن

یہ ہمارا وطن، یہ تمھارا وطن

اس کے کوہ و دمن رشکِ خلدِ بریں
آب فرحت فزا، چشمۂ انگبیں
روح پرور ہوا، نغمۂ دل نشیں
حُسنِ فطرت کے ہاتھوں سنوارا وطن

یہ ہمارا وطن، یہ تمھارا وطن

گھر یہ حکمت، محبت، مساوات کا
اہلِ دل کی سنہری روایات کا
حق پرستوں کے خواب و خیالات کا
یہ عروسِ زمیں کا ستارا وطن

یہ ہمارا وطن، یہ تمھارا وطن

تا ابد یہ گلستاں سلامت رہے
اس پہ سایہ فگن ابرِ رحمت رہے
یہ نشانِ خلوص و اخوت رہے
بے کسوں کا یہ ملجا، سہارا وطن

یہ ہمارا وطن، یہ تمھارا وطن

غزل کے چند اشعار:

جو ساتھ چل رہا تھا اچانک بچھڑ گیا
پھر شہر کی گلی گلی ہم جھانکتے رہے

☆☆☆☆☆

دیکھنا یہ ہے کہ محفل میں محبت کے دیے
کتنے انساں نے بجھائے ہیں ہوا نے کتنے

☆☆☆☆☆

کھٹک سی رہتی ہے سینے میں ایک مدت سے
کسی نے دیکھا تھا ہم کو کبھی محبت سے

☆☆☆☆☆

آوارہ ہم ہیں عرصۂ صحرا میں اور طیور
جاتے ہیں سوئے باغ کہ اب شام ہو چلی

☆☆☆☆☆

آتی ہے ان کی یاد کہ دن ہو چکا تمام
جلتے ہیں دل کے داغ کہ اب شام ہو چلی

☆☆☆☆☆

چمن میں ہر طرف اپنا لہو دیکھا نہیں جاتا
ابھی یہ مآلِ آرزو دیکھا نہیں جاتا

☆☆☆☆☆

شاید نصیب ہی میں نہیں منزلِ مراد
جو بھی قدم اٹھا، غلط انداز سے اٹھا

☆☆☆☆☆

اچانک آخرِ شب آنکھ میں آنسو بہت آئے
ابھی بھادوں نہ برسا تھا مگر جگنو بہت آئے

☆☆☆☆☆

ہماری داستانِ غم میں جو مستور تھے پہلو
نظر والوں کی نظروں میں وہی پہلو بہت آئے

❖❖

مبارک مونگیری

(قادرالکلام شاعر)

مبارک مونگیری مشرقی پاکستان کے ایک منفرد اور پختہ گو شاعر تھے۔ انھیں زبان و بیان پر عبور حاصل تھا۔ نام مبارک احمد اور قلمی نام مبارک مونگیری، ۱۰ر جنوری ۱۹۱۴ء کو مونگیر (بہار) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت وہیں حاصل کی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد ریلوے میں ملازم ہو گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد آپٹ کر کے ۱۹۴۷ء میں مشرقی پاکستان آ گئے۔ قیام چاٹگام میں رہا۔ سقوطِ ڈھاکا تک وہ وہیں رہے۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد کراچی آ گئے۔ یہاں محکمۂ ریلوے میں ان کی دوبارہ تعیناتی ہو گئی۔ ۱۹۸۰ء میں ملازمت سے سبک دوش ہو گئے۔ یہاں بھی شعر و شاعری کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۸۲ء میں ان کے کلام کا مجموعہ "صحرا سے گلستاں تک" کراچی سے شائع ہوا۔ ۶ر اکتوبر ۱۹۸۸ء کو کراچی میں ان کی وفات ہو گئی۔ اللہ مغفرت فرمائے!

"صحرا سے گلستاں تک"

مبارک مونگیری کا مجموعۂ کلام "صحرا سے گلستاں تک" ۱۹۸۲ء میں بڑے اہتمام سے شائع ہوا۔ افسر ماہ پوری، رئیس امروہوی اور شاعر کے دیباچوں کے علاوہ فلیپ اور پشت پر ڈاکٹر حنیف فوق، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، احمد ہمدانی، پروفیسر انجم اعظمی، پروفیسر سحر انصاری، ادیب سہیل اور سید رشید احمد رشید کی مختصر آرا شامل ہیں۔ چند نظموں اور رباعیات کے علاوہ یہ مجموعہ تمام تر غزلوں

پر مشتمل ہے۔ صفحات، ۲۰۸

”مقدس لہو“

اس مجموعے میں شامل ایک طویل نظم ”مقدس لہو“ کے بارے میں افسر ماہ پوری لکھتے ہیں کہ ”مقدس لہو، المیہ مشرقی پاکستان کی وحشت ناکیوں اور اہلِ وفا کے قتلِ عام کی دل دوز عکاسی ہے اور شاید ہی اتنی مربوط و موثر نظم اس المیہ پر کسی اور نے لکھی ہو۔“

اس نظم کے چند بند دیکھیے:

یہ خوں ہے وفا کی حرارت کا حاصل
اک ایک بوند ایثار ہجرت کا حاصل
خودی کا نتیجہ، حمیت کا حاصل
یہ چوبیس سالہ ریاضت کا حاصل

رواں جو تری خاک پر چار سو ہے
ادب اے زمیں یہ مقدس لہو ہے

یہ خوں اہلِ ہجرت سے موسوم کا خوں
یہ خوں خونِ ناحق، یہ مظلوم کا خوں
یہ خوں آو مریم سی معصوم کا خوں
یہ خوں شیر خواروں کے حلقوم کا خوں

وہ خوں جس کی تابش سے پُر نور تو ہے
ادب اے زمیں یہ مقدس لہو ہے

یہ تھے بربریت میں بے باک کتنے
شکم حاملہ کے ہوئے چاک کتنے

مظالم تھے اف زیرِ افلاک کتنے
ہوس کے پجاری تھے ناپاک کتنے
کہ مسجد کی حرمت بھی بے آبرو ہے
ادب اے زمیں یہ مقدس لہو ہے

یہ سلمیٰ کہ چیخیں فضا کانپتی ہے
برہنہ ہے سر تا بہ پا کانپتی ہے
لبوں پر اجل کی دعا کانپتی ہے
لرزتی ہے غیرت، حیا کانپتی ہے
لہو میں شرابور ہر ماہرو ہے
ادب اے زمیں یہ مقدس لہو ہے

مہاجر وہ ترکِ وطن کرنے والے
فدا قوم پر جان و تن کرنے والے
بیاباں کو رشکِ چمن کرنے والے
خس و خار کو یاسمن کرنے والے
انہی گل قباؤں کا خونِ گلو ہے
ادب اے زمیں یہ مقدس لہو ہے

یہ ترکِ وطن کر کے آئے ہوئے تھے
یہ تجھ پر سبھی کچھ لٹائے ہوئے تھے
یہ تیرے تھے تجھ میں سمائے ہوئے تھے
اخوت کا پرچم اٹھائے ہوئے تھے
وہی جس کی مرہونِ احسان تو ہے
ادب اے زمیں یہ مقدس لہو ہے

غزل کے اشعار

فصلِ بہار آ کر کیا گل کھلا گئی ہے
حسرت برس رہی ہے صحرا سے گلستاں تک

☆☆☆☆☆

صلہ شہیدِ محبت کو کچھ ملا تو سہی
متاعِ جاں نہ سہی، دولتِ وفا تو سہی
ہوا کے رُخ پہ ذرا رکھ کے آزما تو سہی
مری طرح کبھی شمعِ وفا جلا تو سہی

☆☆☆☆☆

اک آہ میں ڈھلی ہے رودادِ زندگانی
عمرِ طویل کا ہے افسانہ مختصر سا
رخصت ہوا ہے دل سے ہر شوق رفتہ رفتہ
یہ شہرِ آرزو بھی بنتا چلا کھنڈر سا

☆☆☆☆☆

جو سانس بھی آتی ہے گزرتی ہے قیامت
دن زیست کے یارب ہیں کہ لوہے کے چنے ہیں

☆☆☆☆☆

جب بھی تخریبِ دیں کی بات چلی
سلسلہ خانقاہ تک پہنچا

☆☆☆☆☆

خدا کے فضل سے احباب کی کمی تو نہیں
سوال یہ ہے کہ مخلص ہمیں ملے کتنے

دامن لہو لہو ہے گریباں لہو لہو
ہیں کشتگانِ فصلِ بہاراں لہو لہو
شاید گزر چکی ہے اسیروں کی جان پر
زنجیر ہے خموش تو زنداں لہو لہو
خنجر فشاں ہے کس کی خدائی چہار سمت
ہر گام پر ہے عظمتِ انساں لہولہو
جولاں فقط رگوں میں مبارک لہو نہیں
ہے قلب تا بہ دیدۂ گریاں لہولہو

مبارک مونگیری کا نعتیہ مجموعہ ''ذکرِ ارفع'' کے نام سے ان کی وفات کے بعد ۱۹۹۴ء میں ان کے بیٹے اقبال مجیدی نے (جو خود بھی ایک اچھے شاعر ہیں) شائع کیا۔ ان کا ایک مجموعہ منظوم خاکہ نگاری کا ''بوجھو تو جانیں'' بھی شائع ہوا۔ یہ دلچسپ منظوم خاکے پہلے رسالوں میں شائع ہوئے۔

نمونتاً پروفیسر نظیر صدیقی کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

بوجھو تو جانیں

ادیب و شاعر و نقاد صورت دل پذیر ان کی
ادب کے خانوادے میں نہیں کوئی نظیر ان کی
فنِ تنقید میں یکتا کمالِ فن میں لا ثانی
جو خود استاد سے بڑھ جائے وہ شاگردِ شادانی
یہ خادم فن کا ہے 'شہرت کی خاطر' کچھ نہیں کرتا
'خیال اس کا'' کبھی دولت کی خاطر کچھ نہیں کرتا

پئے اُردو یہ 'مغرب کے دریچے' کھول دیتا ہے
خزف ریزوں کی دنیا میں یہ موتی رول دیتا ہے
اب اس اہلِ قلم کو 'حسرتِ اظہار' کیا ہوگی
اسے 'تفہیم اور تعبیر' پھر دشوار کیا ہوگی
'تعصب پر تاثر' پر جب اس نے روشنی ڈالی
کھلی اہلِ قلم پر پھر تو اس کی عظمتِ عالی
طبیعت میں نفاست ہے، مزاج ان کا ہے شاہانہ
زمانے بھر کے شاکی ہیں، کبھی نظروں میں بیگانہ
بھلا کس پر یہاں تنقید کا خنجر نہیں نکلا
وہ اپنا یا پرایا ہو کوئی بچ کر نہیں نکلا
ہاں نازک مزاجی فلسفی بھی ہیں سخنور بھی
خدا رکھے بڑے نقاد بھی ہیں علم پرور بھی

وفاؔ براہی

(قادرالکلام شاعر)

نام سیّد شاہ محمود عالم اور قلمی نام وفاؔ براہی۔ پٹنہ کے ایک گاؤں براہ میں ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم رواج کے مطابق گاؤں میں حاصل کی۔ اس کے بعد بہار شریف کے مدرسہ میں داخل کیے گئے۔ یہ مدرسہ ان دنوں غالباً فوقانیہ تک تھا۔ تکمیل سے پہلے ہی وطن سے باہر نکلنے کا خیال پیدا ہوا اور گھومتے پھرتے الٰہ آباد جا پہنچے۔ وہاں ایک مدرسے میں داخل ہو گئے۔ فراغت کے بعد الٰہ آباد ہی میں ملازمت کر لی۔ اس دوران شعر بھی کہنے لگے۔ الٰہ آباد میں نوحؔ ناروی (داغؔ کے مشہور شاگرد) موجود تھے۔ وفاؔ بھی ان کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ ایک تو خوش گلو اور اس پر پاٹ دار آواز نے انھیں مشاعروں میں چھا جانے کا موقع دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بحیثیت شاعر مشہور ہو گئے اور یوپی اور بہار کے بڑے مشاعروں میں بلائے جانے لگے۔

جنگِ عظیم دوم کے آخر میں پٹنہ آ گئے اور حکومتِ بہار کی پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ سے منسلک ہو گئے۔ غالباً ۱۹۵۰ء میں ڈھاکا آ گئے۔ ڈھاکا آنے سے پہلے ان کے دو مجموعے ''نکہتِ گل'' اور ''سحر نظر'' شائع ہو چکے تھے۔ بہار کے یہ پہلے شاعر تھے جو مشاعروں میں معاوضہ لے کر شریک ہوتے تھے۔

وفاؔ براہی ڈھاکا آنے کے بعد رحمت اللہ اکیڈمی، نرائن گنج میں معلم ہو گئے۔ بہت جلد مشرقی پاکستان کی بزمِ شعر و ادب میں بھی ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ ان کی شاعری کا دائرہ بہت

وسیع ہے۔ ان کے یہاں حسن و عشق کے علاوہ سیاسی و معاشرتی اور قومی و ملی موضوعات پر بھی نظمیں ملتی ہیں۔ ان کی بعض نظمیں بہت مشہور ہوئیں۔ ان کے کلام میں موسیقیت اور ترنم کا خاص اہتمام نظر آتا ہے۔ وہ اپنا کلام ایک مخصوص ترنم سے سناتے تھے اور مشاعروں پر چھا جاتے تھے۔ مسلم لیگ کے جلسوں میں بھی نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ وہ ایک ماہر فن غزل گو بھی تھے۔ قیامِ مشرقی پاکستان کے دوران ان کا ایک مجموعہ ''شرارِ فطرت'' شائع ہوا۔

سقوطِ ڈھاکا کے بعد نیپال ہوتے ہوئے کراچی پہنچے۔ یہاں انھوں نے ریٹائرمنٹ کی زندگی گزاری۔ بڑے ملنسار، ہنس مکھ اور خوش اخلاق انسان تھے۔ کراچی کے مشاعروں میں بھی کبھی کبھی شریک ہو جاتے تھے۔ وفات سے ایک سال قبل ان کا مجموعۂ کلام ''شعاعِ نو'' (غزلیات) شائع ہوا۔ اورنگی کے ایک مشاعرے میں کلام سناتے ہوئے ۴ر دسمبر ۱۹۹۳ء کو ان کی وفات ہوگئی۔ اللہ مغفرت فرمائے!

نمونۂ کلام

نوائے وقت (نظم)

ہٹا یہ ساغر و سبو بچا وطن کی آبرو
نہ کر سوالِ ما و تو بدل مذاقِ رنگ و بو
سسک رہی ہے زندگی
بلک رہی ہے زندگی

دلیر نوجواں ہے تو جہاں کا پاسباں ہے تو
امیرِ کارواں ہے تو زمیں کا حکمراں ہے تو
سکوں سے اجتناب کر
جہاں میں انقلاب کر

اٹھا لے تیغِ حیدری یہی ہے اصلِ زندگی
مٹا دے قیدِ برتری جہاں کو بخش زندگی
تڑپ کے مثلِ برقِ نو
جلا دے خرمنِ عدو
بتاؤں آج ایک بات ہے موت اصل میں حیات
بدل کے اب تخیلات مٹا دے ظلمِ کائنات
جہاد کیا ہے قرض ہے
یہ مومنوں پہ فرض ہے

غزل کے اشعار

ثابت یہ زمانے میں تو سو بار ہوا ہے
جو کام ہوا ہے وہ سرِ دار ہوا ہے
ایسی بھی گھڑی عالمِ احساس میں آئی
اندازِ تخاطب بھی ترا بار ہوا ہے
کب اہلِ ہوس صدق و صفا سے ہوئے واقف
کب کوئی محبت سے خبردار ہوا ہے

☆☆☆☆☆

جھلکی دکھاتی رہتی ہے جنبش نقاب کی
رہ رہ کے پھوٹتی ہے کرن آفتاب کی
شوخی بھری ہوئی ہے شرارت بھری ہوئی
آنکھوں میں تم جگہ تو نکالو حجاب کی

ہر چند اپنے آپ سے میں بے خبر رہا
پھر بھی سمجھ سکا نہ کوئی بے خبر مجھے

☆☆☆☆☆

ترا جمال اگر تیرے رو برو آئے
تو آئینے کو بھی اندازِ گفتگو آئے

☆☆☆☆☆

میں نے مانا کہ ہے جینا بھی مصیبت لیکن
خوفِ رسوائی ہمت بھی ہے مر جانے میں

☆☆☆☆☆

فضائے تیرہ بھی روشن ہو عزم کامل سے
طریقِ فکر و عمل میں جو تم سنبھل کے چلو

☆☆☆☆☆

کہاں تک کرو گے مقدر کا شکوہ
عمل کے قدم بھی بڑھا کر تو دیکھو

☆☆☆☆☆

مل جو بیٹھے ہیں ہم لوگ اے وقا غنیمت ہے
کیا خبر خدا جانے، کون، کل کہاں ہوگا

☆☆☆☆☆

اے متاعِ سکوں کے شیدائی
آرزو اپنی مختصر کر دے

☆☆☆☆☆

جب ہم غمِ حیات سے کچھ آشنا ہوئے
دل سے ہمارے خطرۂ دار و رسن گیا

❖❖

خواجہ ریاض الدین عطشؔ

(منفرد شاعر، استادِ سخن، محقق، ادیب)

خواجہ سید ریاض الدین حسین نام، عطشؔ تخلص اور خواجہ ریاض الدین عطشؔ قلمی نام ہے۔ ان کا آبائی خاندان صدیوں سے دلّی اور لکھنؤ میں آباد تھا۔ ان کے دادا خواجہ سید فخر الدین حسین سخن دہلوی، غالبؔ کے شاگرد، اردو فارسی کے صاحبِ دیوان شاعر اور ''سروشِ سخن'' اور ''تہذیب النفوس'' کے مصنف تھے۔

خواجہ عطشؔ کی پیدائش اور تعلیم و تربیت پٹنہ (عظیم آباد) میں ہوئی۔ انھوں نے اپنے مجموعۂ کلام ''سوغاتِ جنوں'' کے دیباچہ (تحریر کردہ ۵؍جون ۱۹۸۵ء) میں اپنی عمر ۶۶ (چھیاسٹھ) سال لکھی ہے (ص: ۱۷)، جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا سالِ پیدائش ۱۹۱۹ء ہے۔ لیکن اس مجموعے میں ایک مضمون نگار نے ان کا سالِ پیدائش ۱۹۲۵ء لکھا ہے، جو عطشؔ کے اپنے بیان کی روشنی میں درست نہیں۔

خواجہ عطشؔ نے ۱۹۳۸ء سے شعر گوئی کا آغاز کیا۔ دوسری جنگِ عظیم میں ایک فوجی ہوا باز کی حیثیت سے پانچ سال تک مشرق بعید کے محاذوں پر لڑتے رہے۔ محاذ جنگ سے واپسی ہوئی تو فسادات بہار کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۵۲ء میں وہ ہجرت کر کے مشرقی پاکستان چلے آئے۔ ڈھاکے میں قیام رہا۔ واپڈا میں ملازمت مل گئی، جہاں وہ سینئر ایڈمنسٹریٹو آفیسر کی حیثیت سے سقوطِ ڈھاکا تک کام کرتے رہے۔

خواجہ عطش نے ڈھاکے کی ادبی سرگرمیوں میں نمایاں حصّہ لیا۔ انھوں نے اپنے دادا مرحوم تحسن دہلوی کی یادگار کے طور پر ڈھاکے میں ۱۹۵۴ء میں "بزمِ تحسن" کی بنیاد ڈالی۔ یہ بزم سقوطِ ڈھاکا تک سرگرم رہی۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی اور آصف بناری مرحوم اس کے سرپرست اور اختر دہلوی مرحوم سکریٹری رہے۔ اس بزم کے زیر اہتمام ماہانہ ادبی نشستیں اور سہ ماہی اور سالانہ مشاعرے پابندی سے ہوتے رہے۔

۱۹۶۳ء میں خواجہ عطش نے ڈھاکے میں "بزمِ اقبال" بھی قائم کی جس کے صدر نواب حسن عسکری مرحوم، نائب صدر کیپٹن خورشید اور وفا براہی، سرپرست ڈاکٹر شادانی اور جنرل سکریٹری خواجہ عطش تھے۔ معاون سکریٹری نوشاد نوری، اختر دہلوی اور روشن علی عشرت تھے۔ اس بزم کے تحت بھی ماہانہ اور سالانہ مشاعرے ہوتے رہے۔ خواجہ عطش کے گھر پر بھی اکثر مشاعرے ہوتے تھے۔

خواجہ عطش مشرقی پاکستان میں فلمی صنعت سے بھی ایک فلم ساز، ہدایت کار اور نغمہ نگار کی حیثیت سے منسلک رہے۔ انھوں نے چالیس (۴۰) فلمی نغمے لکھے جن میں سے بعض مشہور بھی ہوئے۔

خواجہ عطش پُرگو اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کے کلام میں فکر و خیال کی گہرائی اور گیرائی اور زبان و بیان کی ندرت و تازگی موجود ہے۔ وہ غزل بھی کہتے تھے اور نظم بھی۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ وہیں ڈھاکے میں ۱۹۶۷ء میں "جادۂ منزل" کے نام سے کتابت اور تصحیح کے مرحلوں سے گزر چکا تھا لیکن وہاں یہ مجموعہ اشاعت پذیر نہ ہوسکا۔

کراچی آکر خواجہ صاحب کے حالات بہتر ہوئے تو ۱۹۹۲ء میں انھوں نے اپنے تین مجموعے بیک وقت شائع کیے، "سوغاتِ جنوں" (غزلوں کا مجموعہ)، "جشنِ جنوں" (نظموں کا مجموعہ) اور "وردِ نفس" (حمد و نعت کا مجموعہ)۔ خواجہ عطش ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ انھوں نے "اردو کا نسب نامہ" کے نام سے اردو زبان کی ایک مبسوط تاریخ بھی شائع کی۔

خواجہ عطش ۱۹۸۹ء سے امریکہ (شکاگو) میں مقیم تھے۔ جنوری ۲۰۰۱ء میں کینسر کے مرض

میں ان کا وہیں انتقال ہو گیا۔ اللہ مغفرت فرمائے!

("محفل جو اُجڑ گئی")

نمونۂ کلام

"سوغاتِ جنوں" سے چند اشعار بطور نمونۂ کلام درج کیے جاتے ہیں:

ہم جلاتے رہے ہر گام محبت کا چراغ
وہ رہ و رسم کی ہر شمع بجھاتا گزرا

☆☆☆☆☆

دن بھر کی عطش دھوپ کو دامن میں سمیٹے
میں شام کے سورج کی طرح ڈوب رہا ہوں

☆☆☆☆☆

خود فریبی کے اجالوں سے نکلنا ہوگا
رات کو رات سمجھ کے ہمیں چلنا ہوگا
آتشِ گل نہیں، گلزارِ براہیم نہیں
وقت کی آگ ہے اس آگ میں جلنا ہوگا
ہم یہ کہتے ہیں کہ خو اپنی بدلنی ہوگی
لوگ کہتے ہیں زمانے کو بدلنا ہوگا

☆☆☆☆☆

بجھا لیتی ہے دنیا آنسوؤں سے آگ سینے کی
جو سلگے اشک سے اس کا بجھانا یوں نہیں ہوتا

☆☆☆☆☆

ہوگی پھولوں کی منزلت معلوم
عمر کانٹوں میں جب بسر ہوگی

اشک کی بوند کو مٹی سے بچا کر رکھنا
یہ ٹپک جائے تو مشکل ہے اٹھا کر رکھنا
روشنی جس کی کسی اور کے کام آجائے
اک دیا ایسا بھی رستے میں جلا کر رکھنا
ہم درِ میکدہ رکھتے ہیں زمانے پہ کھلا
اپنا شیوہ نہیں جنت کو چھپا کر رکھنا
دستِ ہنگامِ تغیر میں نہ جانے کیا ہو
آئینہ رکھنا تو پتھر کا بھی امکاں رکھنا

☆☆☆☆☆

قطرہ تھا اشک کا وہ مگر اس طرح گرا
جیسے ٹپک کے آنکھ سے اک داستاں گرے
دل ہیں پُر نور تو چہروں پہ سیاہی کیسی
روشنی ہے تو چراغوں سے نکل کر ابھرے

☆☆☆☆☆

یہ کیسا شہر ہے جس شہر میں حق بات کہنے کو
کفن کاندھے پہ رکھ کر سوئے مقتل جانا پڑتا ہے

☆☆☆☆☆

ہر گوشۂ عالم میں زمانے کی صدا ہوں
میں وقت پہ چلتا ہوا نقشِ کفِ پا ہوں

۱۹۷۱ء میں (سقوط سے پہلے) قائدین کا گمراہ کن کردار دیکھ کر خواجہ صاحب نے ایک طویل طنزیہ نظم لکھی تھی جس کا عنوان ہے ''کیا یہ لازم ہے کہ گردش میں رہیں جام و سبو''۔ دو بند دیکھئے:

جب کہ طوفانِ بلا خیز میں ہوں قریہ و جو
جب کہ شعلوں کی لپک میں ہوں گھرے قصبہ و کو
جب کہ وحشت کا نیا جال ہو پھیلا ہر سو
جب کہ ملّت کے ہر اک چاک کو کرنا ہو رفو
کیا یہ لازم ہے کہ گردش میں رہیں جام و سبو

جب کہ ڈھاکہ سے اٹھے سوختہ جانوں کی صدا
جب کہ بیماروں، ضعیفوں کے لیے ہو نہ غذا
جب کہ بچوں کے لیے دودھ نہ پانی نہ دوا
جب کہ بہنوں کے سروں پر نہ ہو عصمت کی ردا
جب کہ وحشت کا نیا جال ہو پھیلا ہر سو
جب کہ ملّت کے نئے چاک کو کرنا ہو رفو
کیا یہ لازم ہے کہ گردش میں رہیں جام و سبو

خواجہ صاحب نے بہت سے مضامین اور تبصرے بھی لکھے۔ انھوں نے ''اُردو کا نسب نامہ'' کے نام سے اُردو زبان کی تاریخ بھی لکھی۔ ان کی تصانیف یہ ہیں:

۱۔ سوغاتِ جنوں (مجموعۂ غزل)

۲۔ جشنِ جنوں (مجموعۂ نظم)

۳۔ وردِ نفس (حمد و نعت)

۴۔ داغ کا آخری چراغ
(داغ دہلوی کے آخری جانشین مبارک عظیم آبادی کے حالاتِ زندگی اور انتخابِ کلام)

۵۔ اردو کا شجرۂ نسب (تاریخ زبانِ اردو کے سلسلے میں تحقیقی کتاب)

۶۔اردو ہزار داستان (اردو ادب کا نسب نامہ، تاریخ اور مقدمہ)

۷۔اُردو دشمن تحریک کے سو سال

مذکورہ بالا چاروں نثری اور تحقیقی کتابیں خواجہ صاحب نے قیامِ امریکہ کے دوران لکھیں۔

خواجہ صاحب نے ایک خوش گوار گھریلو زندگی گزاری۔ انھیں اپنی بیگم قیصر جہاں سے بڑی محبت تھی۔ ان کے سات بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ وہ اپنے بچوں کے لیے شفیق باپ بھی تھے اور استاد و رہنما بھی۔ ان کی شفقت آمیز طبیعت ہر ملنے والے پر محبتوں کے پھول نچھاور کرتی تھی۔ دس بارہ سال تک وہ امریکہ میں استادِ سخن اور معلمِ ادب کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ آخر عمر میں وہ بزرگانِ سلف کا نمونہ بن گئے تھے۔

❖❖

پروفیسر فروغ احمد

(ایک درویش صفت شاعر و ادیب)

پروفیسر فروغ احمد (۱۹۲۰-۱۹۹۴ء) ایک درویش صفت شاعر و ادیب اور مشرقی پاکستان میں "ادبِ اسلامی" کے ترجمان و علم بردار تھے۔ لیکن ان میں تعصب و تنگ نظری مطلق نہ تھی۔ وہ ہر مکتبۂ فکر کے ادیبوں اور شاعروں سے ملتے، ان کی محفلوں میں شریک ہوتے اور ان کے کلام کی مناسب تعریف و توصیف سے گریز نہ کرتے تھے۔ وہ بی۔اے (علیگ) تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہی ڈھاکا آ گئے اور ایک مدت تک "رحمت اللہ ہائی اسکول" میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۶۳ء میں ڈھاکا یونیورسٹی سے اُردو میں ایم۔اے کرنے کے بعد "قائدِ اعظم کالج، ڈھاکا" سے وابستہ ہو گئے۔ صحافت سے بھی ان کا تعلق رہا۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد لاہور آ گئے۔ ماہنامہ "سیارہ" لاہور اور ماہنامہ "بتول" لاہور کے ایڈیٹر رہے۔ آخر میں آنکھوں کی بینائی زائل ہو گئی۔ ۱۹۹۴ء میں لاہور میں انتقال کیا۔ اللہ مغفرت فرمائے!

فروغ صاحب بڑی سادہ طبیعت کے حامل تھے۔ لباس و کردار ہر چیز میں سادگی تھی۔ کم آمدنی والے کثیر العیال انسان تھے۔ صحت بھی ان کی ہمیشہ خراب رہی لیکن قوتِ عمل ان کی حیرت انگیز تھی۔ وہ اپنے کمزور جسم میں ایک بے قرار جان رکھتے تھے اور ہر وقت رواں دواں رہتے تھے۔ مطالعہ کافی وسیع تھا۔ اُردو، فارسی اور عربی پر عبور رکھتے تھے۔ کچھ عرصہ ریڈیو پاکستان، ڈھاکا سے "قرآنِ حکیم اور ہماری زندگی" کے عنوان سے ان کی تقریر بھی نشر ہوتی رہی۔ انھیں نظم و نثر پر یکساں

قدرت حاصل تھی۔ قلم برداشتہ لکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے۔ لیکن وہ مقرر اچھے نہ تھے، زبان میں لکنت تھی۔ معاملہ فہم اور نکتہ شناس تھے، بہت جلد بات کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔ ہمیشہ شیروانی، پاجامے اور جناح کیپ میں نظر آتے تھے۔ پان خوب کھاتے تھے، منکسر مزاج اور اخلاق مند تھے۔ سب سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔

نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی بھی کرتے تھے۔ ادیبوں اور شاعروں میں ایک خامی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہم عصروں کو عموماً اور محفلِ ادب کے نو واردوں کو خصوصاً خاطر میں نہیں لاتے لیکن فروغ صاحب میں یہ بات نہ تھی۔ خوبی اور کمال خواہ کسی میں ہو، وہ اس کی داد دیے بغیر نہیں رہتے تھے۔ اس معاملے میں ان سے زیادہ فراخ دل ادیب و ناقد میں نے کوئی اور نہیں دیکھا۔

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ کچھ عرصے تک مجھے ان کی قربت کے مواقع بھی حاصل رہے۔ میرپور کے قیام کے زمانے میں مجھے ان کے گھر کے سامنے سے گزر کر بس اسٹینڈ جانا پڑتا تھا۔ بازار بھی ان کے گھر کے قریب ہی تھا۔ آتے جاتے میں اکثر ان کے یہاں کچھ دیر رک جاتا تھا۔ گھر میں لنگی بنیائن پہنے ایک تخت پر بیٹھے رہتے تھے۔ ان کی چاروں طرف کتابوں، اخباروں اور رسالوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا۔ تخت سے ملحق کتابوں کی ایک ریک بھی تھی جو کتابوں سے بھری رہتی تھی۔ اور وہ ہاتھ بڑھا کر جو کتاب چاہتے نکال لیتے تھے۔ میرے پہنچنے پر بہت خوش ہوتے۔ بغیر دودھ والی چائے سے تواضع ضرور کرتے تھے۔ کبھی صبح کو بس اسٹینڈ پر ملاقات ہو جاتی۔ پہلے بس کا سفر ہوتا (تقریباً ایک گھنٹے کا)، اس کے بعد سائیکل رکشا کا۔ ان کا کالج (قائدِ اعظم کالج) میرے کالج (جگن ناتھ کالج) کے قریب ہی تھا۔ کبھی میں کالج سے فارغ ہو کر ان کے کالج چلا جاتا۔ وہاں دوسرے اساتذہ سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ کالج کے پرنسپل عبدالرؤف قاطمی صاحب تھے، جو اپنی تعلیمی اور علمی سرگرمیوں کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔

فروغ احمد صاحب ایک زود گو اور پُرگو شاعر تھے۔ فکر و فن دونوں لحاظ سے ان کی شاعری

بلند پایہ اور اپنے اندر بڑی دلکشی اور جاذبیت رکھتی ہے۔ لیکن اکثر شعراء کی طرح وہ مشاعروں کے شاعر نہ تھے۔ نجی محفلوں میں کچھ سنا دیتے تھے لیکن مشاعروں میں شریک نہ ہوتے تھے۔ وہ زیادہ تر نظمیں لکھتے تھے لیکن غزل گوئی بھی جاری رہتی تھی۔ ان کا کلام اخباروں اور رسالوں کی زینت بنتا رہتا تھا۔ انھوں نے اتنا کچھ لکھا کہ ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو سکتے تھے لیکن افسوس کہ ایک مجموعہ بھی شائع نہ ہو سکا۔ صرف دو طویل نظمیں الگ الگ کتابچوں کی شکل میں شائع ہوئیں۔ ایک "پرچم نامہ" اور دوسری "سواء السبیل"۔ "مہاجر نامہ" بھی ان کی ایک خوب صورت اور طویل نظم تھی جو ہفت روزہ "انصاف" ڈھاکا میں چھپی۔ جدید اُردو شاعری میں طویل نظمیں بہت کم لکھی گئی ہیں جب کہ شاعری کا جوہر طویل نظموں ہی میں کھلتا ہے۔ فروغ صاحب نے "قصیدہ بردہ" کا منظوم ترجمہ بھی کیا جسے "اسلامک پبلی کیشنز" لاہور نے شائع کیا تھا۔ مختصر یہ کہ ان کا کلام مختلف اصناف اور گوناگوں موضوعات پر مشتمل ہے جس میں فکرِ بلند اور جذبات عمیق بھی ہیں اور حسنِ زبان و بیان بھی۔

نمونۂ کلام
(نظموں سے اقتباس)

یا ربِّ مشرقین و یا ربِّ مغربین
مشرق کے دل کو چین نہ مغرب کے دل کو چین
ذہنِ رسا نے تاروں پہ ڈالی تو ہے کمند
قلبِ حزیں یقین و گماں کے ہے بین بین
شیطاں کے دل میں آج بھی پیہم کھٹکتا خار
بو جہلِ نا مراد ہے یا خواجۂ حنین؟
مومن خلوصِ دل سے طلب گار بھی تو ہو
ہاں نفسِ مطمئنہ ہے بے شک خدا کی دین

برسات، کالی رات، پپیہے کی پی کہاں
بے کل ہے من فروغؔ، برسنے لگے ہیں نین

("سواءالسبیل")

کتنے تارے فلک پر فروزاں ہوئے ٹوٹ کر گر گئے
جادۂ ماہ و انجم وہی کہکشاں، بے کراں کراں
کتنی شمعیں جلائی گئیں بزم میں اور گھلتی رہیں
بزمِ جاناں وہی بزمِ جاناں رہی، دل ستاں بے کراں
پھول کتنے کھلے اور مرجھا گئے، رُت بدلتی رہی
بلبلیں رقص کرتی رہیں اور جوئے رواں بے کراں
کتنے ملزم سرِ دار لائے گئے، سرنگوں کب ہوئے
سرفرازانِ راہِ وفا ہیں وہی شعلہ جاں بے کراں
کتنے مطرب سرِ بام آئے گئے، شب گزرتی گئی
ہے وہی مرو آتش بجاں، یادِ لالہ رُخاں بے کراں

("بے کراں")

طنز و مزاح

فروغ صاحب کے کلام میں طنز و مزاح کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں اور کہیں کہیں یہ رنگ گہرا ہو گیا ہے۔ ایک نظم میں انھوں نے بڑے دلچسپ انداز میں خود اپنی ہجو کی ہے، جو درج ذیل ہے:

پاندان نامہ

فکرِ معاش ہے نہ غمِ خاندان ہے
کھانے کو روز وقت پہ سالن ہے نان ہے

انبار ہے رسالوں کا یا مؤنث ایورسٹ
بس حضرت، فروغ ہیں اور پاندان ہے

اندر سے پھر منگاتے ہیں پانوں کی طشتری
بالکل بجا ہے گر اسے کہیے ہری بھری
کیسے انھیں بچارے کہ بیٹھے ہیں چند برگست
بس حضرتِ فروغ ہیں اور پاندان ہے

سارے فرائض آپ نے انجام دے دیے
جب دیکھیے سرور میں رہتے ہیں بے پیے
بستر ہے اور تکیہ ہے اور کر رہے ہیں ریسٹ
بس حضرتِ فروغ ہیں اور پاندان ہے

منہ میں گلوری ڈال کے بیٹھے جھکا کے سر
اس فکر میں ہیں غرق کہ موزوں ہو شعر تر
پھولے ہوئے ہیں گال تو سکڑا ہوا ہے چسٹ
بس حضرتِ فروغ ہیں اور پاندان ہے

انگریزی قافیوں کو مزے سے کھپاتے ہیں
کھا کھا کے پان خوب ہی چھینٹے اُڑاتے ہیں
اس گنگا جمنی نظم کو کہتے ہیں خود ہی بسٹ
بس حضرتِ فروغ ہیں اور پاندان ہے

غزل کے اشعار

لب بستگانِ حسرتِ گفتار کچھ کہو
ہاں اب تو اے رفیقو سرِ دار کچھ کہو
سو زخم سو دہن ہیں مگر وہ بھی ہیں خموش
اے کشتگانِ کوچۂ دلدار کچھ کہو
دنیا کھڑی ہے روزنِ زنداں کے سامنے
ہاں اب بلا کشانِ گرفتار کچھ کہو

☆☆☆☆☆

اپنے اس کفر کا اقرار مجھے آج بھی ہے
الفتِ غیر سے انکار مجھے آج بھی ہے
دل جہاں جھک نہ سکا، سر بھی جھکایا نہ گیا
اک یہی نشۂ پندار مجھے آج بھی ہے
ہجر کیسا؟ کبھی ملنا بھی ہوا ان سے نصیب
وہ جو تھی حسرتِ دیدار مجھے آج بھی ہے

☆☆☆☆☆

ہر ذوق تشنہ کام ہے، ہر شوق تشنہ کام
میخانۂ حیات میں آسودگی حرام
از کاہ تا بہ کاہکشاں موجِ رنگ و نور
ماہی سے تا بہ ماہ رواں جنبشِ مدام
گُل پا بہ گِل سہی، مگر از غنچہ تا نسیم
قلب و دماغ محشرِ صد فتنۂ خرام

اک لمحہ یا دو لمحہ کی آسودگی فقط
شمشیرِ بے اماں کے لیے عشرتِ نیام
فن ماورائے صاحبِ فن کچھ نہیں تو پھر
یک گونہ بے خودی کا بہانہ خیالِ خام
لو نکتہ چینِ غالبِ دانا ہوا فروغؔ
"یارانِ نکتہ داں کے لیے ہے صلائے عام"

☆☆☆☆☆

دلوں کے بھید کو اہلِ دماغ کیا پائیں
کچھ ایسی عقل یہاں دنگ ہے کہ مت پوچھو
ہزار ہم نے نگاہوں کے زاویے بدلے
مگر وہ جلوۂ نیرنگ ہے کہ مت پوچھو
بجا کہ آئینۂ دل ہے طالبِ صیقل
پرانی یادوں کا وہ رنگ ہے کہ مت پوچھو
فروغؔ شوق تھا ہم کو بھی نام کرنے کا
اب اپنے نام سے وہ ننگ ہے کہ مت پوچھو

فروغؔ صاحب کی وفات کے بعد ماہنامہ "سیارہ" لاہور (مدیر حفیظ الرحمن احسنؔ) نے ایک ضخیم "فروغ احمد نمبر" شائع کیا تھا جو ایک یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ بھی شامل ہے۔

فروغؔ صاحب ایک بلند پایہ اور منفرد نثر نگار بھی تھے۔ انھوں نے بے شمار تنقیدی مضامین لکھے۔ وہ ماہر اقبالیات بھی تھے۔ ان کی ضخیم کتاب "تفہیم اقبال" کراچی سے شائع ہوئی۔

❖❖

ڈاکٹر حنیف فوق

(شاعر، ناقد، معلّم)

۱۹۵۸ء میں جگن ناتھ کالج، ڈھاکا سے بی۔ اے کرنے کے بعد جب میں نے ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو و فارسی میں داخلہ لیا تو وہاں مشہور و معروف اور قابل اساتذہ کا جمگھٹا تھا۔ صدر شعبہ ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیب شادانی کے علاوہ ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی، ڈاکٹر ظفر الہدیٰ (علامہ شبلی نعمانی کے بیٹے حامد نعمانی کے داماد)، پروفیسر فیض احمد چودھری (بنگالی نژاد، جدید و قدیم فارسی کے ماہر) اور پروفیسر حنیف فوق شعبے میں رونق افروز تھے۔ حنیف فوق صاحب ان میں سب سے کم عمر، ترقی پسند نظریات کے حامل اور ایک ممتاز تنقید نگار و شاعر تھے۔ انھیں انگریزی تحریر و تقریر پر بھی عبور حاصل تھا۔ طلبا ان کے زیادہ گرویدہ تھے۔

شعبے میں طلبہ و طالبات کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے اساتذہ ہم سے بہت قریب تھے۔ ہر استاد کی الگ الگ خصوصیات تھیں اور ان کے پڑھانے کا انداز بھی مختلف تھا۔ فوق صاحب کا انداز "دوستانہ" تھا، وہ طلبہ سے ہمیشہ "آپ" کہہ کر مخاطب ہوتے تھے، ان کے سوالوں کا جواب وضاحت سے دیتے تھے اور ان کی کسی بات کا بُرا نہ مانتے تھے۔ اس وقت میں اکیس سال کا ایک مسکین سا نوجوان تھا۔ صبح کو ایک پرائمری اسکول (آئیڈیل پرائمری اسکول، شگون باغیچہ، ڈھاکا) میں پڑھاتا تھا اور ظہر کے بعد یونیورسٹی پہنچ جاتا تھا۔ شعبۂ اُردو و فارسی کی کلاسیں دو بجے سے شروع ہوتی تھیں۔ فوق صاحب مجھے "مولانا" کہتے تھے حالانکہ نہ میرے چہرے پر داڑھی تھی اور نہ دیگر

مذہبی علامتیں، مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ میں نے ان سے اپنی نظموں اور غزلوں پر اصلاح لینی بھی شروع کردی جس کا سلسلہ ایم۔اے (فائنل) کا امتحان دینے تک جاری رہا۔

فوق صاحب چھوٹے قد اور بھاری جسم کے خوب صورت آدمی تھے۔ گورا رنگ، بیضوی چہرہ، بڑی بڑی مسکراتی ہوئی آنکھیں۔ بات کرتے وقت ہمیشہ مسکراتے رہتے، خوش مزاج اور خوش گفتار تھے لیکن کبھی کبھی انھیں غصہ بھی آجاتا تھا۔ وہ ذاتی طور پر کسی سے پرخاش نہیں رکھتے تھے۔ بڑے نیک دل اور مخلص انسان تھے۔ وہ شاگردوں کو ہمیشہ شاگرد ہی سمجھتے تھے اور ان کے مشفقانہ برتاؤ میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔

فوق صاحب یونیورسٹی کے فلیٹ میں تنہا رہتے تھے۔ انھوں نے شادی نہیں کی تھی۔ ایک نوکر تھا جو کھانا پکاتا تھا اور سودا سلف بھی لاتا تھا۔ کبھی شام کو ان کے یہاں جانا ہوتا (خلیل احمد جو مجھ سے ایک سال سینئر تھے، اکثر میرے ساتھ ہوتے تھے) تو پکوڑوں اور چائے وغیرہ سے تواضع کرتے۔ ان کے فلیٹ میں کبھی کبھی ان کے دوست احباب بھی جمع ہوجاتے تھے جن میں پروفیسر اظہر قادری، اختر پیامی، عطاءالرحمٰن جمیل، رفیع احمد فدائی اور افسر ماہ پوری وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

ایک دن فوق صاحب نے ایک سانولے رنگ اور گھونگھریالے بالوں والے نوجوان سے میرا تعارف کرایا۔ وہ ان کے چھوٹے بھائی تھے جو ان سے ملنے بھوپال سے آئے تھے۔ وہ سادہ دل اور ملنسار نوجوان تھے اور میرے ہم عمر تھے۔ مجھ سے گھل مل کر باتیں کرنے لگے۔ وہ تقریباً ایک یا دو ماہ رہے اور ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں، افسوس میں ان کا نام بھول گیا۔ فوق صاحب ڈھاکا آنے کے بعد اپنے گھر والوں کو تقریباً بھول گئے تھے۔ ان کی بہنوں کے بھی خطوط آتے رہتے تھے، وہ ان کے لاابالی پن کی وجہ سے بہت فکرمند رہا کرتی تھیں فوق صاحب غالباً ان کے خطوط کا جواب بھی نہیں دیتے تھے۔ کبھی کبھی ان کی بہنیں ڈاکٹر شادانی اور ڈاکٹر ظفر الہدیٰ کو بھی خط لکھتی تھیں کہ وہ ان کے بھائی کا خیال رکھیں۔ مجھے اس کا علم نہیں کہ مشرقی پاکستان میں قیام کے دوران فوق صاحب اپنے گھر والوں سے ملنے بھوپال گئے یا نہیں۔

میں نے ۱۹۶۰ء میں ایم۔اے کرنے کے بعد ۱۹۶۱ء میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے داخلہ لیا تو میرے گائیڈ ڈاکٹر شادانی تھے۔(میرے پی ایچ ڈی کے مقالے کا عنوان "۱۸۵۷ء کے بعد اُردو شاعری کے میلانات" تھا، بعض وجوہ سے میں یہ کام جاری نہ رکھ سکا اور ۱۹۶۳ء میں اس سے الگ ہو گیا)۔ جب بھی یونیورسٹی جاتا، فوق صاحب سے بھی ملاقات ہوتی۔ ایک دن پہنچا تو میرزا ادیب پہلے سے ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میرا ان سے تعارف کروایا اور ان کے ساتھ مجھے بھی یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں لے گئے۔ کہا "میرزا صاحب کو اپنی غزل سنایئے۔" میں نے اپنی تازہ کہی ہوئی غزل سنائی۔ میرزا صاحب کو غزل پسند آئی۔ کہا لکھ کر دے دیجئے، میں اسے "ادبِ لطیف" میں شائع کروں گا۔ میں نے غزل نقل کر کے دے دی۔ لیکن شاید وہ غزل ان کی جیب ہی میں رہ گئی اور "ادبِ لطیف" کے صفحات پر کبھی جلوہ گر نہ ہوئی۔

۱۹۶۴ء میں فوق صاحب نے "دی سوشل انالیسس آف اُردو پوئٹری ڈیورنگ اینڈ آفٹر ۱۸۵۷" کے عنوان سے انگریزی میں مقالہ لکھ کر ڈھاکا یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے ممتحن ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں تھے۔ میں انھیں مبارک باد دینے ان کے فلیٹ پہنچا تو بہت خوش ہوئے۔ شعیب عظیم بھی میرے ساتھ تھے۔ میں نے کہا "اب ڈیپارٹمنٹ میں فیضی صاحب (پروفیسر فیض احمد چودھری) کی اہمیت سب سے زیادہ ہو گئی ہے۔" حیرت سے پوچھا، "کیسے؟" میں نے کہا "ان کے علاوہ سب ڈاکٹر ہیں۔" اس پر خوب ہنسے اور کہا "ہاں آپ نے ٹھیک کہا۔" اس وقت تک ڈاکٹر معز الدین (جو بعد میں اقبال اکیڈمی، کراچی کے چیئرمین مقرر ہوئے) شعبے سے منسلک ہو چکے تھے۔ وہ جگن ناتھ کالج میں میرے اُستاد تھے۔

۱۹۶۹ء کے ابتدائی مہینوں میں میری پہلی کتاب "اُردو ادب اور اسلام" (جلد اوّل) لاہور سے چھپ کر آئی تو سوچا سب سے پہلے اپنے اساتذہ کو کتاب پیش کی جائے۔ ڈاکٹر شادانی کے یہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ ڈاکٹر معز الدین کے ہاں گئے ہوئے ہیں۔ ان کے فلیٹ (جگن ناتھ

ہال) پہنچا تو ان سے ملاقات ہوگئی۔ ڈاکٹر شادانی اور ڈاکٹر معزالدین دونوں کو کتاب پیش کی۔ ڈاکٹر شادانی چند منٹ کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے اور کہا "میاں! تم بڑے خوش قسمت ہو کہ ڈھاکا میں بیٹھے ہوئے لاہور سے اتنی اچھی کتاب چھپوالی۔" دوسرے دن شام کو فوق صاحب کے ہاں گیا۔ ڈاکٹر شادانی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ فوق صاحب نے پوچھا "ڈاکٹر صاحب کو کتاب دی؟" میں نے کہا "جی ہاں۔" اس پر فوق صاحب کہنے لگے "ڈاکٹر صاحب سے کہیے کہ اس پر کچھ لکھیں۔" میں نے ان الفاظ کو دُہرایا تو ڈاکٹر صاحب نے کہا: "ہاں میاں لکھوں گا، موقع ملا تو لکھوں گا۔" (اس کے دو تین ماہ بعد ہی جولائی ۱۹۶۹ء میں ڈاکٹر شادانی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اللہ مغفرت فرمائے!)۔

چند ہفتوں کے بعد فوق صاحب کے ہاں گیا تو کہنے لگے: "مولانا! میں نے آپ کی کتاب پوری پڑھ لی۔ آپ نے زبان بہت صحیح لکھی ہے، زبان وبیان کی کہیں کوئی غلطی نہیں۔ آپ نے بڑی خوبی سے اپنے خیالات ونظریات کا اظہار کیا ہے، کہیں کوئی تشنگی یا ابہام نہیں۔ لیکن ایک بڑی خامی اس میں یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک اور اشتراکیت کو اکثر جگہ بے ضرورت تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے، اپنی باتوں کو مثبت انداز میں پیش کرنا چاہیے۔" استادِ محترم کی یہ باتیں بالکل درست تھیں جو چالیس سال گزرنے کے بعد بھی مجھے یاد رہ گئیں۔

۱۹۷۰ء کے بعد فوق صاحب سے میری کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ غالباً ۱۹۸۶ء میں اورنگی میں ماہر فریدی مرحوم کی یاد میں ایک جلسہ ہوا جس کی صدارت فوق صاحب نے کی۔ مجھے مضمون پڑھنا تھا۔ تقریباً ۱۶، ۱۷ سال کے بعد ملاقات ہوئی۔ سلام کر کے میں ان کے قریب بیٹھ گیا۔ لیکن شناسائی کی کوئی علامت ان کے چہرے پر نہ دیکھی۔ لمبی داڑھی، کھچڑی بال، کرتا، پاجامہ اور ٹوپی اس حلیے میں وہ مجھے پہچان نہ سکے۔ بہر حال جب مضمون پڑھ کر فارغ ہوا تو وہ مجھے پہچان گئے۔ کہنے لگے: "میں نے پہلے آپ کو نہیں پہچانا تھا لیکن جب آپ مضمون پڑھنے لگے تو پہچان گیا۔" خیریت پوچھنے لگے اور اپنے یہاں آنے کو کہا۔ اس وقت وہ یونیورسٹی کوارٹر میں رہتے تھے۔ لیکن گردشِ روزگار

نے مہلت نہ دی کہ حاضر ہوتا۔۔

۲۰۰۲ء میں جب میری کتاب "محفل جو اُجڑ گئی" تکمیل کے مراحل میں تھی، فوق صاحب کا فون نمبر مل گیا۔ اس وقت تک ان کی ترک بیگم واپس جا چکی تھیں اور انھوں نے یونیورسٹی روڈ پر ایک فلیٹ خرید لیا تھا۔ تنہا رہتے تھے، فون پر تقریباً آدھے گھنٹے تک بات ہوتی رہی۔ اپنی زندگی کے ابتدائی حالات بتاتے رہے اور پھر ڈھاکا سے کراچی آنے کے بعد کے حالات بھی بتائے، جن کا اختصار میں نے اپنی کتاب میں درج کیا۔ جب فوق صاحب کو کتاب ملی تو بہت خوش ہوئے اور اس پر ایک تفصیلی تبصرہ لکھوا کر ماہنامہ "افکار" کراچی میں شائع کیا۔ تبصرہ آنے کے بعد میں نے انھیں فون کیا۔ انھوں نے کتاب کی اشاعت پر مبارک باد دی اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ یہ معلوم کر کے بہت افسوس ہوا کہ کوئی ملازم بھی ان کے یہاں نہ تھا۔ ہوٹل سے کھانا لا کر کھاتے تھے اور بالکل تنہا رہتے تھے۔ عمر ۷۵ سال سے تجاوز کر چکی تھی۔

مختصر حالاتِ زندگی

ڈاکٹر حنیف فوق کا نام محمد حنیف قریشی تھا۔ میٹرک سرٹیفکیٹ کے مطابق ۱۹۲۶ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ میٹرک وہیں سے پاس کیا۔ کانپور حلیم کالج سے انٹر اور لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے (اردو) کیا۔ وہ انٹر کے طالب علم تھے کہ ان کے تنقیدی مضامین اس دور کے موقر رسالوں میں شائع ہونے لگے۔ ایم۔ اے پاس کرنے تک وہ ایک تنقید نگار کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں وہ ڈھاکا یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے اور یہ وابستگی ۱۹۷۱ء تک قائم رہی۔ وہیں سے ۱۹۶۳ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ سقوطِ ڈھاکا سے چند دن قبل کراچی پہنچے۔ چند ماہ بعد کراچی یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے۔ ملازمت کے دوران ۱۹۷۳ء میں انقرہ یونیورسٹی میں اُردو اور پاکستان اسٹڈیز کے استاد کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا۔ وہاں آٹھ سال ان کا قیام رہا۔ اس دوران انھوں نے ترکی زبان بھی سیکھ لی اور وہاں ترکی زبان میں مضامین بھی لکھے

اور بعض نثر کی کتابوں کا اُردو اور انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔ ادھیڑ عمری میں ایک ترک خاتون سے شادی بھی کرلی۔ ۱۹۸۱ء میں کراچی واپس آ گئے۔ چند سال کے بعد ان کی اہلیہ ترکی واپس چلی گئیں۔

ڈاکٹر حنیف فوق ۱۹۸۶ء میں کراچی یونیورسٹی کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے اور وہیں جز وقتی استاد کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ ۱۹۹۶ء میں اُردو ڈکشنری بورڈ، کراچی کے ڈائرکٹر جنرل ہوئے۔ ۱۹۹۸ء میں بورڈ کی ملازمت سے فارغ ہو کر دوبارہ کراچی یونیورسٹی اور سرسید یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے۔

فوق صاحب نے بے شمار مقالے لکھے۔ لیکن ان کے مقالوں کے صرف دو مجموعے ''مثبت قدریں'' اور ''متوازی نقوش'' شائع ہوئے۔ ایک کتاب غالبؔ پر لکھی۔ اپنا مجموعۂ کلام ''سایۂ شب'' کے نام سے مرتب کیا۔ اس پر افسر ماہ پوری مرحوم نے دیباچہ لکھا تھا۔ دیباچہ چھپ گیا لیکن مجموعہ شائع نہ ہو سکا۔ یہ فوق صاحب کی اپنی کوتاہی یا بے نیازی تھی، ان کے پاس وسائل کی کمی نہ تھی۔

۲۰۰۷ء سے فوق صاحب بیمار رہنے لگے تھے۔ ۲۰۰۸ء میں جب وہ زیادہ بیمار ہو گئے تو ان کے چھوٹے بھائی کراچی آ کر انھیں بھوپال لے گئے جہاں یکم مئی ۲۰۰۹ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ اللہ مغفرت فرمائے!

شاعری

فوق صاحب ایک اچھے اور منفرد شاعر بھی تھے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی۔ زبان و بیان کی پختگی اور حُسنِ بیان کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں فکری گہرائی بھی پائی جاتی ہے۔ وہ ترقی و جدت کے علم بردار ہوتے ہوئے بھی روایت کے باغی نہ تھے۔ ان کی شاعری میں اُردو کی شعری روایات کے صالح عناصر پوری طرح موجود ہیں۔ ان کے کلام میں ایک انفرادی رنگ بھی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی غزلوں میں کلاسیکی اور جدید انداز کا بڑا حسین امتزاج ملتا ہے۔

نمونۂ کلام

''فضائی دور میں انسان کے تاثرات''

یہ فضائے نیل گوں یہ بال و پر کافی نہیں
ماہ و انجم تک مرا ذوقِ سفر کافی نہیں
بحر و بر کافی نہیں، کوہ و کمر کافی نہیں
زندگی کو فطرتِ برق و شرر کافی نہیں!
ایک ساعت اک صدی ہے، اک نظر آفاق گیر
اب نظامِ گردشِ شام و سحر کافی نہیں
عشق کی اک اک ادا کو سو جہانوں کی طلب
اس شرر کو یہ حیاتِ مختصر کافی نہیں!
پھر جنوں کو وسعتِ افلاک ہے کوہِ ندا
اے دلِ دیوانہ دشتِ پُر خطر کافی نہیں
شوق کی پلکوں پہ ہے کتنی ہی صدیوں کا خمار
تشنگی کو جلوۂ صد بام و در کافی نہیں
یہ ہوائے نم، یہ سینے میں سلگتی آگ سی
آہ، یہ عمرِ رواں کی رہ گزر کافی نہیں
پھر مشیت سے الجھتی ہے مری دیوانگی!
نالۂ شب گیر، اشکوں کے گہر کافی نہیں
شیشۂ شب میں بھری ہے فوق جو صہبائے کیف
قطرہ قطرہ بھی پیوں تو رات بھر کافی نہیں

غزل

دلِ ناداں پہ شکایت کا گماں کیا ہوگا
چند اشکوں سے جفاؤں کا بیاں کیا ہوگا

شب کے بھٹکے ہوئے راہی کو خبر دے کوئی
صبح رنگیں کے بہاروں کا نشاں کیا ہوگا

نالۂ مرغِ گرفتار سے بے زاری کیا!
گوشِ صیاد پہ اب یہ بھی گراں کیا ہوگا

آج پابندِ سلاسل ہے مرا حرفِ جنوں
اس سے بڑھ کر بھی کوئی بندِ گراں کیا ہوگا

چپ رہے ہم تو سرِ دار پکارے گا لہو
چند ہی روز میں آئینِ جہاں کیا ہوگا

اب تو ہم شہرِ نگاراں سے چلے آئے ہیں
باعثِ وحشتِ دل حُسنِ بُتاں کیا ہوگا

چشمِ نرگس کو ہوس ہے کہ چمن میں دیکھے
آتشِ گل کے بھڑکنے کا سماں کیا ہوگا

☆☆☆☆☆

آہ و فریاد سے معمور چمن ہے کہ جو تھا
مائلِ جور وہی چرخِ کہن ہے کہ جو تھا

حُسن پابندیٔ آدابِ جفا پہ مجبور
عشق آوارہ سرِ کوہ و دمن ہے کہ جو تھا

لاکھ بدلا سہی منصور کا آئینِ حیات
آج بھی سلسلۂ دار و رسن ہے کہ جو تھا

خود بہار اپنی امنگوں پہ لہو روتی ہے
خندۂ گل میں وہی سازِ محن ہے کہ جو تھا

ہاتھ رکھ دیتا ہے شانے پہ تصور ان کا
غم کی راتوں میں کوئی جلوہ فگن ہے کہ جو تھا

انھیں کیا فکر کہ پوچھیں دلِ بیمار کا حال
بے نیازانہ وہ اندازِ سخن ہے کہ جو تھا

لاکھ بدلا سہی اے فوقؔ زمانہ لیکن
تیرے انداز میں بے ساختہ پن ہے کہ جو تھا

پروفیسر اظہر قادری

(شاعر، ناقد، معلّم)

پروفیسر اظہر قادری (۱۹۲۵ء-۲۰۰۳ء) کا شمار سابق مشرقی پاکستان کے ممتاز ناقدوں اور شاعروں میں ہوتا تھا۔ انھیں شاعری اور نثر نگاری پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ اعلیٰ ذہن اور وسیع مطالعہ کے حامل تھے۔ اُردو کے بہت کم شاعر و ادیب ایسے ہوں گے جن کا مطالعہ ان کی طرح وسیع ہو۔ اُردو ادب کے علاوہ انگریزی ادب، فلسفہ اور تاریخ پر انھیں عبور حاصل تھا۔ وہ انگریزی میں بھی مضامین لکھتے تھے اور کبھی کبھی نظم بھی۔

اظہر قادری (نام ظہیر الدین محمد یحییٰ) کلکتہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے (اُردو) کرنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں ڈھاکا آگئے۔ اس وقت سے سقوطِ ڈھاکا تک ڈھاکا کے مختلف کالجوں میں پڑھاتے رہے۔ وہ ایک اچھے استاد و معلّم تھے۔ ان کا وجود ڈھاکا کی محفلِ شعر و ادب کے لیے ہمیشہ باعثِ رونق رہا۔

اظہر قادری صاحب جگن ناتھ کالج میں میرے استاد تھے۔ ڈھاکا یونیورسٹی سے ایم۔ اے (اُردو) کرنے کے بعد ۱۹۶۱ء میں جب میری تقرری جگن ناتھ کالج میں بحیثیت لیکچرار ہوئی تو میں ان کا رفیق کار بن گیا۔ پہلے شعبۂ اُردو، شعبۂ عربی کے ماتحت تھا، جس کے صدر مولانا بذل الرحمٰن تھے جو بعد میں جگن ناتھ کالج کے پرنسپل بنے اور ایک عرصے تک اس عہدے پر فائز رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی کئی بار ان کی ملازمت میں توسیع کی گئی۔ وہ بنگالی نژاد تھے لیکن کسی قسم کا

کوئی تعصب ان میں نہ تھا۔ بڑے نیک دل، ہمدرد اور منکسر مزاج انسان تھے۔ پورے کالج میں "مولانا" کے نام سے مشہور تھے، حالانکہ داڑھی وغیرہ سے مبرا تھے، کرتا پائجامہ ان کا مستقل لباس تھا۔ اُردو بہت صاف بولتے تھے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے والد ایک بڑے عالم اور مدرسہ عالیہ، کلکتہ کے استاد تھے۔ انھیں شمس العلماء کا خطاب بھی ملا تھا۔ لمبی عمر پائی تھی۔ ۶۶-۱۹۶۵ء تک با حیات تھے۔ مدرسہ عالیہ ڈھاکا کے معلم اور مشہور و معروف عالم و خطیب مفتی عمیم الاحسان ان کے شاگرد تھے اور اکثر ان سے ملنے ان کے گھر جایا کرتے تھے۔ بہرحال بذل الرحمٰن صاحب نے ۷۲-۱۹۷۱ء کے ہنگامی دور میں اظہر صاحب کی اور میری ہر طرح سے حفاظت کی اور ہم پر کوئی آنچ نہ آنے دی۔ (جگن ناتھ کالج، مشرقی پاکستان کا سب سے بڑا کالج اور بنگالی قومیت اور عوامی لیگ تحریک کا بہت بڑا گڑھ تھا)۔ کالج کے دیگر اساتذہ کا رویہ بھی ہمارے ساتھ دوستانہ اور ہمدردانہ رہا۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے!

۱۹۶۸ء میں جب حکومت نے کالج کو اپنی تحویل میں لے لیا تو اُردو اور عربی کے شعبے الگ کر دیے گئے۔ شعبۂ اُردو کے سربراہ پروفیسر اظہر قادری مقرر کیے گئے۔ شعبے میں میرے علاوہ ایک خاتون معلمہ جہاں آرا چودھری (اردو کی شاعرہ اور ادیبہ) بھی تھیں۔ صدر شعبہ بننے کے بعد اظہر صاحب کے انداز میں کوئی فرق نہ آیا۔ انھوں نے اپنے لیے کوئی کمرہ بھی نہیں لیا۔ اس طرح ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۲ء تک بحیثیت رفیق کار میں اظہر صاحب سے بہت قریب رہا۔ کالج کے علاوہ بھی امجدیہ ہوٹل (نواب پور، ڈھاکا) میں بھی ان کے ساتھ نشست رہتی تھی جہاں ان سے ملنے ان کے احباب اور تلامذہ (شعر و شاعری کے) بھی آیا کرتے تھے۔ ہوٹل والوں نے ایک کیبن ان کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ اکثر آنے والے حضرات میں حسب ذیل قابلِ ذکر ہیں:

عارفؔ ہوشیار پوری، رفیع احمد فدائی، محمود الحسن (صحافی)، عصمت علی عصمتؔ، ساتھی صدیقی، منیر غازی پوری، اشتیاق احمد شوقؔ، شفیق احمد شفیق اور احمد سعید فیض آبادی وغیرہ۔ بعض نام میرے ذہن سے نکل گئے ہیں۔ وہیں ایک بار یونس احمر سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔

اظہر صاحب کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ ان کی خوش اخلاقی کی وجہ سے لوگ بہت جلد ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ پیسے کی محبت ان میں نہ تھی، جو کماتے تھے خرچ کر ڈالتے تھے۔ ہوٹل میں چائے کا بل عموماً وہی ادا کرتے تھے۔ جس طرح کتابیں پڑھنے کا شوق تھا اسی طرح کتابیں خریدنے کا بھی شوق تھا۔ ہر ماہ اپنی آمدنی کا ایک معقول حصّہ کتابوں پر صرف کر ڈالتے تھے۔ جگن ناتھ کالج میں پڑھانے کے علاوہ دوسرے کالجوں میں بھی جز وقتی ملازمت کرتے تھے۔ اس طرح ان کے پاس پیسوں کی کمی نہ ہوتی تھی۔ انھوں نے شادی بہت تاخیر سے ۱۹۶۹ء میں کی۔ گھر میں والدہ محترمہ کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ وہ ضعیفی کی وجہ سے کھانا بھی پکا نہ سکتی تھیں۔ لہٰذا دونوں وقت کا کھانا وہ ہوٹل سے لے جاتے تھے۔

اظہر صاحب شروع ہی سے ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ انھوں نے اشتراکیت کا نہایت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس کے باوجود نام نہاد ترقی پسندوں کی طرح ان کی زبان یا قلم سے کبھی مذہب یا خدا کے خلاف ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ مسلمانوں کی شاندار تاریخ سے انھیں گہری دلچسپی تھی۔ اسلام نے دنیائے انسانیت پر جو احسانات کیے ہیں اس کے وہ قائل اور مسلمانوں کے علمی، ادبی اور سیاسی کارناموں کے بے انتہا معترف تھے۔ ان موضوعات پر جب وہ بولتے تو گھنٹوں بولتے جاتے تھے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی، علامہ ابوالکلام آزاد، علامہ رضا علی وحشتؔ اور کیپٹن قمر صدیقی (ان کے والد) ان کی محبوب شخصیتیں تھیں۔ جب ان میں سے کسی شخصیت پر وہ گفتگو کرتے تو ان میں بڑا والہانہ انداز پیدا ہو جاتا تھا:

پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار
رکھ دے کوئی پیمانہ و صہبا مرے آگے

شاعری

اظہر صاحب نے طالب علمی کے زمانے ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ چونکہ شعر گوئی کی فطری صلاحیت ان میں موجود تھی اس لیے مشق و مطالعہ کے ساتھ ساتھ وحشتؔ و قمرؔ (اظہر صاحب

کے والد کیپٹن قمر صدیقی) جیسے اساتذہ کے دامن تربیت نے انھیں بہت جلد فنی پختگی عطا کر دی۔ ترقی پسندانہ رجحانات کی وجہ سے ان کی شاعری میں ایک نیا رنگ و آہنگ پیدا ہو گیا۔

اظہر صاحب نے نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی۔ لیکن ان کی طبیعت کا رجحان غزل کی طرف زیادہ تھا۔ ان کی شاعری میں فنی پختگی اور جدید شعور کا بڑا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

چلتی ہے باغِ دل میں تری یاد کی نسیم
جلتے ہیں ذہن میں ترے رخسار کے چراغ

☆☆☆☆☆

تم سے نباہ کرتے رہے ہم تمام عمر!
اس اک امید میں کہ ملیں گے خوشی کے پھول

☆☆☆☆☆

ہوائیں چلتی ہیں ہر وقت تند و تیز یہاں
تمھارے شہر میں کیسے کوئی چراغ جلے

☆☆☆☆☆

ناحق خفا ہیں آپ گلہ آپ کا نہ تھا
اک ہم نشیں سے رات تھی اک ہم نشیں کی بات
کچھ مصلحت ضرور ہے اس میں وگرنہ کیوں
ہے لب پہ شہر یار کے صحرا نشیں کی بات

☆☆☆☆☆

فریب کھاتا ہے دنیا کا ہم کو دانستہ
ہر ایک شخص کا کیسے نہ اعتبار کریں
ہم اہلِ دل ہیں ہمارا جو بس چلے اظہر
تو ساری دنیا کو خوشیوں سے ہم کنار کریں

اظہر صاحب کی شاعری کا خمیر خود داری، وضع داری اور انسان دوستی سے اٹھا ہے۔ دیکھیے، اردو غزل میں یہ انداز کج کلاہی بہت کم نظر آتا ہے:

تقسیم جام مرضی ساقی پہ تا بکے
چھلکاؤ خود ہی بزم میں پیمانہ دوستو
کیا ہم کو اہل جاہ و حشم سے کوئی غرض
اپنی روش رہی ہے فقیرانہ دوستو

☆☆☆☆☆

جو ٹھہریں ہم تو ٹھہر جائے کائنات کی نبض
چلیں جو ہم تو زمانہ ہمارے ساتھ چلے

☆☆☆☆☆

ہو جور کی خزاں کہ تغافل کی تیز دھوپ
مرجھانے ہم نہ دیں گے کبھی عاشقی کے پھول

☆☆☆☆☆

یہ اور بات ہے ہم تشنہ رہ گئے ورنہ
ہمارے سر سے گھٹا بار بار گزری ہے

اس میں شک نہیں کہ اظہر صاحب کا کلام رجائیت کا ترجمان ہے لیکن اس میں ایک حزنیہ رنگ بھی رچا ہوا ہے جو دل گداز بھی ہے اور دل نشیں بھی۔ یہ شاعر کے سوزِ دل اور دردِ جگر کا کرشمہ ہے جس نے ان کی شاعری کو عام سطح سے بلند کر دیا ہے۔ یہاں ان کی ایک غزل پیش کی جاتی ہے۔ اس غزل کے حزنیہ رنگ، موسیقیت اور جذبات کی شدت و گہرائی نے اسے ایک شاہکار بنا دیا ہے:

جو تمھاری پرسشِ حال پر تھی زبان میری رُکی رُکی
تو مرے بیانِ الم پہ بھی تھی نظر تمھاری جھکی جھکی

مرے دل سے تم کو جو ربط تھا اسے میں بھی خود نہ سمجھ سکا
تھا ستم اگر تو عیاں عیاں تھیں نوازشیں تو چھپی چھپی
کہوں تم سے اپنا میں حال کیا مری داستاں ہے یہ مختصر
میں ہوں اک لکیر مٹی مٹی میں ہوں ایک شمع بجھی بجھی
ہے اگر اسی میں تری خوشی، مجھے خوش نہ کر مرا دل نہ رکھ
ترا غم بھی مجھ کو عزیز ہے اسے جھیل لوں گا خوشی خوشی
ترے التفاتِ نگاہ سے مرے دل کی آگ بھڑک اٹھی
مجھے خود بھی اس کا نہ علم تھا کہ سلگ رہی ہے دبی دبی
وہ امید و بیم کی کشمکش وہ تلون ان کے مزاج کا
کبھی ہر قدم پہ نوازشیں، کبھی ہر نگاہ پھری پھری
ہوئی ایک عمر ملے تھے تم کبھی چھپ کے سب کی نگاہ سے
مجھے آج بھی یہ گمان ہے کہ گئے ہو مل کے ابھی ابھی

رباعی کا فن ایک مشکل فن ہے۔ اظہر صاحب کو اس پر پوری قدرت حاصل ہے۔ انھوں نے بکثرت رباعیاں کہی ہیں جو فکر و فن دونوں لحاظ سے بلند پایہ ہیں۔ ان کی رباعیوں کا ایک مجموعہ ''کیف و کم'' عرصہ ہوا ترتیب پا چکا تھا، جس پر علامہ وحشتؔ نے دیباچہ بھی لکھا تھا۔ لیکن افسوس کہ یہ مجموعہ بھی شائع نہ ہو سکا۔ چند رباعیاں نمونتاً پیش کی جاتی ہیں:

میخانے پہ پُر کیف گھٹا چھائی ہے
پینے کی پلانے کی گھڑی آئی ہے
پچھم سے جو اٹھی ہے یہ گھنگھور گھٹا
شاید کسی بدمست کی انگڑائی ہے

افسردہ نہیں تیری نہیں ہے ساقی
مل جائے گی مے مجھ کو کہیں سے ساقی
مانگوں جو خدا سے تو بہ فیضِ رحمت
مے برسے گی خود عرشِ بریں سے ساقی

☆☆☆☆☆

تکلیف بلانے کی جو کی ہے تم نے
اور دعوتِ نظارہ بھی دی ہے تم نے
سب ٹوٹ گئے تارِ گریبانِ حیات
انگڑائی پسِ پردہ جو لی ہے تم نے

اظہر صاحب نے بڑے اچھے اور دلکش قطعات بھی کہے ہیں جو زیادہ تر رومانی ہیں:

ان کو ہونے نہیں دیا رسوا
زخم خود دل پہ کھا لیا میں نے
ہائے مجبوری ان کے ہاتھوں سے
اپنا دامن چھڑا لیا میں نے

☆☆☆☆☆

جگمگاتے ہیں شب کو ماہ و نجوم
صبح دم پھول مسکراتے ہیں
دیکھتا ہوں جو ان نظاروں کو
جانے کیوں آپ یاد آتے ہیں

اظہر قادری اپنی پختہ، باوقار اور پُر کیف شاعری کی وجہ سے اردو ادب میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

بحیثیت ناقد

پروفیسر اظہر قادری کی سب سے نمایاں حیثیت ایک تنقید نگار کی ہے۔ انھوں نے ۵۰، ۵۵ سال تک مسلسل تنقیدی مضامین لکھے۔ ماہ نامہ "جامِ نو" کراچی میں ہر ماہ آٹھ نو سال تک "نقد و نظر" کے تحت مضامین لکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اظہر صاحب کی طبیعت میں اتنی بے نیازی تھی کہ وہ اپنے مضامین کی کاپی بھی اپنے پاس نہیں رکھتے تھے۔ خدا بھلا کرے شفیق احمد شفیق کا کہ انھوں نے کافی تگ ودو اور تلاش وجستجو کے بعد ان کا ایک تنقیدی مجموعہ "فکروفن کے محرکات" کے نام سے مرتب کر کے ۲۰۰۱ء میں شائع کر دیا۔ اس طرح انھوں نے حقِ شاگردی اور حقِ رفاقت ادا کر دیا۔ اس کتاب میں ۱۵ مضامین ہیں، صفحات ۱۶۰۔

اظہر قادری کی تنقیدیں زیادہ تر نظریاتی ہیں۔ انھوں نے ترقی پسند نظریات کی توضیح بڑی خوبی سے کی ہے۔ ان کی ان تحریروں سے ان کے وسیع مطالعہ اور دقتِ نظری کا اظہار ہوتا ہے۔ اکثر ایسی تحریریں تعصب، تنگ نظری اور انتہا پسندی کا شکار ہو جاتی ہیں، لیکن اظہر قادری کے مضامین ان عیوب سے پاک ہیں۔ وہ علمی انداز میں بڑی خوبی، سادگی اور صراحت کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے یہاں کسی قسم کا ابہام نہیں ہوتا اور نہ وہ غیر ضروری طور پر مغربی مصنفین کے حوالے دے کر قارئین کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے انگریزی میں بھی بہت سے مضامین لکھے۔ وہ مذہبی، اخلاقی اور روایتی اقدار کے باغی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں اعتدال ہر جگہ نمایاں ہے۔

تصانیف

پروفیسر اظہر قادری کی ڈھاکے میں حسبِ ذیل دو کتابیں شائع ہوئیں:

۱۔ رضا علی وحشت۔ شخصیت اور شاعری (مختصر کتاب)۔ ۱۹۵۶ء

۲۔ ایک کتے کی آپ بیتی (ناول)۔ ۱۹۶۸ء

کراچی میں ایک تنقیدی کتاب "فکروفن کے محرکات" ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی۔

اظہر قادری مرحوم ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کا ایک شعری مجموعہ شفیق احمد شفیق اگر ان کے دوستوں اور عزیزوں کے تعاون سے شائع کردیتے تو یہ بھی ان کا ایک ادبی کارنامہ ہوتا۔

آخری ایام

اظہر قادری نے اپنی زندگی کے بہترین ایام کلکتہ اور ڈھاکا میں گزارے۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد ۱۹۷۴ء میں مع اہل وعیال کراچی آگئے۔ دس سال تک سندھ یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد کراچی یونیورسٹی اور جناح یونیورسٹی برائے خواتین سے منسلک ہو گئے۔ ۳۰ رنومبر ۲۰۰۳ء کو چند ہفتوں کی علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں یادگار چھوڑی ہیں۔ اللہ مغفرت فرمائے!

پروفیسر نظیر صدیقی

(شاعر، ناقد، معلّم)

پروفیسر نظیر صدیقی (۱۹۳۰ء-۲۰۰۱ء) ایک منفرد ناقد کی حیثیت سے اُردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کی ادبی اور فکری نشوونما مشرقی پاکستان میں ہوئی، وہ ۱۹۴۸ء میں انٹر پاس کرکے ڈھاکا آگئے۔ یہیں سے ۱۹۵۰ء میں بی۔اے اور ۱۹۵۳ء میں ڈھاکا یونیورسٹی سے اُردو میں ایم۔اے کیا۔ اس کے بعد مختلف کالجوں میں پڑھاتے رہے۔ شروع میں چند سال نواب پور گورنمنٹ ہائی اسکول میں بھی پڑھایا۔

نظیر صاحب میدانِ ادب میں ہمیشہ سرگرم رہے۔ ان کی تنقید نگاری، انشائیہ نگاری اور شاعری کا آغاز یہیں سے ہوا۔ اس دور میں ان کی انشائیہ نگاری اکثر زیرِ بحث رہی۔ ان کے انشائیوں کا مجموعہ "شہرت کی خاطر" ۱۹۶۱ء میں ڈھاکے سے شائع ہوا۔ دو تنقیدی مضامین کے مجموعے "تاثرات وتعصبات" (۱۹۶۶ء) اور "میرے خیال میں" (۱۹۶۸ء) وہیں ڈھاکے سے شائع ہوئے۔

نظیر صاحب شاعر بھی تھے اور چاہتے تھے کہ شاعر کی حیثیت سے بھی خود کو منوالیں۔ مشاعروں میں اکثر متفرق اشعار سنایا کرتے تھے اور "خردہ گو شاعر" کی حیثیت سے مشہور ہوگئے تھے۔

مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ادیبوں میں نظیر صدیقی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ

سب سے زیادہ (تقریباً تیس) کتابیں انھیں کی شائع ہوئیں۔ یہ سب کتابیں یا تو تنقیدی تھیں یا فکر و فلسفہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ پاکستان آ کر (دوسری ہجرت کے بعد) انھوں نے انگریزی میں ایم۔اے بھی کر لیا تھا اور انگریزی میں مضامین اور ادبی کالم بھی لکھنے لگے تھے۔ جن کے متعدد مجموعے شائع ہوئے۔

نظیر صاحب کی کتابوں کے بارے میں ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کی سب کتابیں ان کے مضامین یا مقالات کا مجموعہ ہیں۔ رسالوں میں اشاعت کے لیے وہ تنقیدی یا فکری موضوعات پر مضامین لکھتے رہتے تھے۔ پھر ان کے مجموعے کچھ وقفے سے شائع کرتے رہتے تھے۔ غالباً ان میں اتنا صبر و تحمل اور جاں کاہی کا حوصلہ نہ تھا کہ کوئی موضوع منتخب کر کے برسوں کی تحقیق و تدقیق کے بعد کوئی کتاب لکھتے۔ ان میں نام و نمود اور شہرت کی بے پناہ خواہش تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر ماہ کسی ادبی رسالے میں ان کا مضمون یا مقالہ شائع ہوتا رہے اور اس کا چرچا ہوتا رہے۔ جذبۂ شہرت انھیں چین سے بیٹھنے نہ دیتا تھا۔ وہ اپنے ہم عصر ادیبوں کو خطوط بھی بکثرت لکھتے تھے۔ انھوں نے نام و نمود اور شہرت کے لیے جتنی محنت و مشقت کی، شاید ہی اُردو کے کسی ادیب نے کی ہو۔

نظیر صاحب خود پسند اور انا پرست انسان تھے اس لیے اپنے جذبات و احساسات اور خواہشات کے معاملے میں بہت حساس بھی تھے۔ لیکن ایک خوبی ان میں یہ بھی تھی کہ وہ دوسروں کے جذبات و احساسات کا خیال بھی رکھتے تھے۔ وہ اس مسلک کے پابند تھے کہ بقولِ انیس:

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

نظیر صاحب مالی لحاظ سے ہمیشہ تنگ دست رہے۔ ماں باپ کی سب سے بڑی اولاد تھے۔ ان کا کنبہ بہت بڑا تھا۔ ان کے پانچ بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ اس کنبے کی دیکھ بھال کا فریضہ بڑے ہونے کی حیثیت سے انھیں پر عائد ہوتا تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں اسکول میں پڑھاتے رہے۔ ایم۔اے کرنے کے بعد بیک وقت مختلف کالجوں میں پڑھاتے رہے۔ شادی کچھ دیر سے

کی۔ شادی کے بعد غالباً حکومت سے قرض لے کر ایک گھر محمد پور میں بنوایا اور اس میں اپنی بیگم کے ساتھ منتقل بھی ہو گئے۔ اس وقت تک سب بھائی برسرِ روزگار ہو گئے تھے۔

۱۹۶۹ء میں جب مشرقی پاکستان کے سیاسی حالات بہت دگرگوں ہو گئے تو انھوں نے دوسری ہجرت کا فیصلہ کر لیا۔ نومبر ۱۹۶۹ء میں کراچی منتقل ہو گئے۔ دو سال تک اُردو کالج میں پڑھایا۔ اس کے بعد اسلام آباد اوپن یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے اور بقیہ ایام اسلام آباد ہی میں گزار دیے۔ لیکن ان کا دل کراچی میں لگا رہتا تھا۔ وہ کراچی آنے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے تھے۔ کراچی آتے تو ان کا قیام اکثر افسر ماہ پوری کے یہاں ہوتا۔ افسر ماہ پوری ان کے مزاج شناس اور قریبی دوست تھے۔ ڈھاکے میں بھی دونوں میں بڑی قربت تھی۔ نظیر صاحب نے ایک بار کراچی سے اسلام آباد واپس جا کر ایک دوست کو لکھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "جنت" سے "دوزخ" میں آ گیا ہوں۔

نظیر صاحب اپنے فرائض سے کبھی غافل نہ ہوئے۔ بیوی بچوں (دو بیٹیاں، ایک بیٹا) کی بہتر پرورش و کفالت کے لیے ہمیشہ تگ و دو کرتے رہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھانے کے علاوہ اُردو اور انگریزی اخباروں میں ادبی کالم بھی لکھتے رہے۔ سال دو سال چین کی بیجنگ یونیورسٹی میں بھی پڑھایا۔ آخری دور میں اسلام آباد میں اپنا ایک مکان بھی بنوا لیا تھا۔ مہمان نواز بھی تھے۔ کراچی سے ان کے قریبی احباب جب اسلام آباد جاتے تو اکثر انھیں کے یہاں قیام کرتے تھے۔ خوش قسمتی سے بیگم (دورِ حاضر کی معروف ادیبہ اور خاکہ نگار فرحت پروین ملک) بھی بڑی محبت کرنے والی اور خدمت گزار ملی تھیں۔ وہ بغیر کسی شکوہ و شکایت کے ان کے دوستوں کی مہمان نوازی کرتی رہیں۔ شوہر پر اپنا سب کچھ نثار کر دینے والی ایسی نیک بیویاں اب بہت کم نظر آتی ہیں۔

نظیر صاحب کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ وہ خدا کی ہستی کے قائل نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی اور خاص طور پر شاعری پر قنوطیت کا سایہ نہایت گہرا ہے۔ جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں:

عقل منکر ہو خدا کا تو دُعا کس سے کریں
زندگی تیری جفاؤں کا گلہ کس سے کریں

بہرحال ان کی بیگم کا بیان ہے کہ انھوں نے موت سے پہلے کلمہ پڑھ لیا تھا (دیکھیے فرحت پروین ملک کا شاہکار خاکہ "آدھا مسلمان" "دربارِ ادب" میں)

نظیر صاحب مہذب، نرم دل، مخلص اور خوددار و وضع دار انسان تھے۔ وہ دیگر اُردو ادبا و شعراء کی طرح ہوٹلوں میں بیٹھ کر وقت ضائع نہیں کرتے تھے اور نہ غیر ضروری طور پر ان کے لڑائی جھگڑوں میں پڑتے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں علم و ادب کے رسیا تھے۔ جس طرح انھیں لکھنے کا شوق تھا، اسی طرح مطالعے کا بھی شوق تھا۔ اُردو کے علاوہ انگریزی کتابیں بھی ان کے زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔ کبھی کبھی جگن ناتھ کالج میں بھی (جہاں راقم لیکچرار تھا) کتابوں کے لیے آجاتے تھے۔ وہ میرے استاد بھی تھے۔ جب ملاقات ہوتی، دیر تک باتیں کرتے رہتے۔

"حسرتِ اظہار"

پروفیسر نظیر صدیقی کا مختصر مجموعۂ کلام "حسرتِ اظہار" کا پہلا ایڈیشن اسلام آباد سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۴ء میں اور تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۹ء میں کراچی سے چھپا۔ یہ مجموعہ ۱۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع میں ۳۹ غزلیں ہیں۔ ان کے بعد دو نظمیں اور تین قطعات ہیں اور پھر متفرق اشعار جو تقریباً ۳۵ صفحوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ اشعار تقریباً سوا سو یا ڈیڑھ سو ہوں گے۔ ایک خوبی اس مجموعے کی یہ ہے کہ ہر غزل کے نیچے تاریخ تحریر درج ہے۔ یہاں تک کہ سیکڑوں متفرق اشعار کے نیچے بھی تاریخِ تحریر موجود ہے۔

نظیر صاحب کی شاعری دراصل فکری شاعری ہے۔ ان کی خود پسندی اور قنوطیت بھی ان کے کلام میں نمایاں ہے۔ وہ اکثر ایک فلسفی کی طرح انسانی نفسیات اور جبرِ حیات کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔

وہ ہر قدم کے اثر سے ہے باخبر پھر بھی
رہِ حیات میں انساں کی کج روی ہے وہی
☆☆☆☆☆
جو اپنی خود سری کو بھی بڑی خوبی سمجھتے ہیں
انھیں بھی دوسروں کی خود سری اچھی نہیں لگتی
☆☆☆☆☆
بہت ثواب سہی پاکباز رہنے میں
جہاں میں رہ کے کوئی پاکباز کیوں کر ہوا
☆☆☆☆☆
محرمِ راز خطرناک بھی ہوتے ہیں نظیر
دل کو ہلکا جو کریں ہم تو بھلا کس سے کریں

آدمی ساتھ رہنے پہ مجبور ہے، پھر بھی اک دوسرے سے بہت دور ہے
دشمنوں سے تو ہتی بھلا صلح کیا جب کہ خود دوستوں سے بھی چلتی رہی

ہر شخص بن گیا ہے خدا تیرے شہر میں
کس کس کے در پہ مانگیں دُعا تیرے شہر میں
☆☆☆☆☆
غریبوں کا تقاضا ہے نظامِ زندگی بدلو
امیروں کی سخاوت سے تو ناداری نہیں جاتی

قنوطیت، غم پسندی اور اپنی مظلومیت کی داستان سناتے وہ تھکتے نہیں:

مری زندگی سر بہ سر دھوپ غم کی
خوشی کا کہیں اس میں سایہ نہیں ہے

☆☆☆☆☆

تیرا کلام سن کے جو خاموش ہیں نظیرؔ
ان کا گلہ نہ کر کہ ہیں اہلِ نظر وہ لوگ

☆☆☆☆☆

بہ شکلِ زندگی وہ بوجھ سر پر آ پڑا میرے
جسے ڈھونا ہے لازم اور ڈھونا بھی نہیں ممکن

☆☆☆☆☆

جو میں شاکی ہوں دنیا سے تو دنیا مجھ سے شاکی ہے
نہ میں دنیا کو راس آیا نہ دنیا مجھ کو راس آئی

☆☆☆☆☆

یادِ ماضی تلخ ہے، تصویرِ فردا دل شکن
اے غمِ امروز اب تو ہی بتا ہم کیا کریں

☆☆☆☆☆

حیات بخش مسرت کا ذکر ہی کیا ہے
ہمیں تو کوئی غمِ دل نواز بھی نہ ملا

☆☆☆☆☆

سکوتِ یاس کو یا پھر سکوتِ نامرادی کو
جسے چاہو ہماری زندگی کا ماحصل کہہ لو

☆☆☆☆☆

خدا کی یہ زمیں رہنے کے قابل تو نہیں لیکن
جسے جب تک خدا رکھے، یہاں رہنا ہی پڑتا ہے

چشمِ نم کچھ بھی نہیں اور شعرِ تر کچھ بھی نہیں
اب یہاں خونِ جگر، نقشِ ہنر کچھ بھی نہیں

چند حکیمانہ شعر بھی دیکھ لیجیے:

کمالِ علم و حکمت کے جلو میں
فسادِ علم و حکمت کم نہیں ہے

ہر سنگ میں دنیا کو نظر آتا ہے اک بت
اور ایسے ہر اک بُت کی پرستار ہے دنیا

آزادیٔ خیال کی موجودگی بجا
ماتم یہ ہے کہ جرأتِ اظہار چھن گئی

علم و ہنر کے فیض سے، علم و ہنر کے باوجود
محفلِ زیست میں نظیرؔ رنگ ہے روشنی نہیں

☆☆☆☆☆

کوئی کلی نہ رہی پھر بھی مسکرائے بغیر
سزا اگرچہ مقرر تھی مسکرانے کی

نظیر صاحب "حسرتِ اظہار" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"شاعر کے لیے اس کے شاعرانہ مرتبے کا مسئلہ یقیناً بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن اپنے مرتبے سے زیادہ اسے اس کی فکر ہونی چاہیے کہ شاعری میں اس کا وجود کہیں ہے بھی یا نہیں۔ میں اپنے تنقیدی مضامین میں شاعری کے جس تصور یا معیار پر اصرار کرتا رہا ہوں اس پر خود میری شاعری کا پورا اُترنا نہ ضروری ہے نہ ہر جگہ ممکن۔ اس وادی میں ہم ہوئے، تم ہوئے، نظیرؔ ہوئے، کسی کو اس

سے زیادہ کہنا زیب نہیں دیتا جتنا کہ عاؔلی (جمیل الدین) نے اس شعر میں کہہ دیا ہے

سوائے اس کے یہاں دعویٔ بہار نہیں
کہ ایک میں بھی ہوں اپنا چمن سجائے ہوئے"

("حسرتِ اظہار"۔ص:۶)

نظیر صدیقی صاحب نے بھی اپنی شاعری کا ایک چمن سجا رکھا ہے۔ بہر حال انھیں کے اس شعر پر میں یہ مضمون ختم کرتا ہوں:

اہلِ کمال کو نظیر اہلِ جہاں نے کیا دیا
اہلِ جہاں کو کیا نہیں اہلِ کمال دے گئے

وفات

طویل علالت کے بعد ۱۲/اپریل ۲۰۰۱ء کو اسلام آباد میں نظیر صدیقی وفات پا گئے۔ اللہ مغفرت فرمائے!

ڈاکٹر رضی حیدر نے مظفر پور یونیورسٹی (بہار) سے ۱۹۹۲ء میں نظیر صدیقی پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ "نذرِ نظیر" کے نام سے جاوید وارثی اور ڈاکٹر محمد محسن نے ایک کتاب مرتب کی جو غالباً نظیر صاحب کی زندگی ہی میں شائع ہوئی۔ ان کی وفات کے بعد ان کی اہلیہ فرحت پروین ملک اور احمد زین الدین نے ایک کتاب "حرفِ تازہ بیادِ نظیرِ صدیقی" مرتب کی جو ۲۰۰۵ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔

پروفیسر نظیر صدیقی کی تصانیف

پروفیسر نظیر صدیقی کی تقریباً تیس کتابیں شائع ہوئیں۔ وہ مختلف ادبی موضوعات پر مسلسل پچاس سال تک مضامین اور مقالات لکھتے رہے۔ ان کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست درج ذیل

ب:

تنقید: 'تاثرات وتعصبات'۔'میرے خیال میں'۔'تفہیم وتعبیر'۔'اردو ادب کے مغربی دریچے'
'ڈاکٹر عندلیب شادانی'۔'جدید اُردو غزل۔ایک مطالعہ'۔'اُردو میں عالمی ادب کے تراجم'
'گزرگاہِ خیال'۔'غالب اور اقبال'۔

انشائیہ: شہرت کی خاطر

شخصی خاکے: جان پہچان

شاعری: حسرتِ اظہار

دوسفرنامے: ہندوستان اور انگلستان

خودنوشت: سویہ ہے اپنی زندگی

دیباچے اور تبصرے: ادبی جائزے

ترجمہ: اعتراف (جاپانی ناول کا ترجمہ)۔امید (انگریزی ناول کا ترجمہ)

انگریزی کتابیں:

1. Columns on Books in English and Urdu
2. Glimpses of the East and West in Literature
3. Iqbal in his varied aspects
4. Reflection on Life and Literature
5. View and Reviews
6. A peap into Literature and Philosophy
7. Dr. Radha Krishnan: The Greatest Indian of the 20th.Century
8. Iqbal and Radha Krishnan
9. To Prof. Nazeer Siddiqui

تالیف: 'نقش ہائے رنگ رنگ'۔'شیرازۂ خیال'۔'انتخاب ازکلام یگانہ چنگیزی'۔

ترتیب: 'ایمن نے کہا'۔'پروین شاکر کے خطوط نظیر صدیقی کے نام'۔'نامے جو مرے نام آئے'۔

❖❖

سرور بارہ بنکوی
(حسنِ تغزل کا ترجمان)

سعید الرحمن نام اور سرور بارہ بنکوی قلمی نام تھا۔ ۱۹۲۶ء میں بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ بارہ بنکی گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور ملازمت اختیار کر لی۔ شعر و شاعری کا ذوق اسی زمانے میں پیدا ہو گیا۔ وہ جگر مرادآبادی سے بہت متاثر تھے۔ ۱۹۴۶ء سے مشاعروں میں شریک ہونے لگے اور بہت جلد مشہور ہو گئے۔ ۱۹۵۱ء میں ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے ڈھاکا آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔

سرور بارہ بنکوی ہماری اس محفل کے بہت ہی مقبول اور منفرد غزل گو تھے۔ اپنے حسنِ تغزل اور دلکش ترنم کی وجہ سے مشاعروں پر چھا جاتے تھے۔ ان کے کلام میں بڑی رنگینی، دل کشی اور جاذبیت تھی۔ جس طرح وہ خود خوب صورت تھے اسی طرح ان کا کلام بھی خوب صورت تھا۔ وہ مشاعروں میں غزل پڑھتے تو نوجوان لڑکیاں اور خواتین ان کے اشعار لکھتی جاتی تھیں۔

سرور صاحب شروع میں انجمن ترقیِ اردو، ڈھاکا سے وابستہ تھے۔ بعد میں فلمی صنعت سے منسلک ہو گئے۔ فلموں میں گانے اور مکالمے لکھنے کے علاوہ خود فلمیں بھی بنائیں۔ دو ادبی رسالوں "آب و گل" اور "قلمکار" کے مدیر بھی رہے۔ غالباً ۱۹۷۰ء میں اہل و عیال کے ساتھ کراچی چلے آئے۔

قیامِ بنگلہ دیش کے بعد وہ کئی بار فلموں کے سلسلے میں ڈھاکا گئے۔ آخری بار جب وہ

ڈھاکا گئے تو ۳ر اپریل ۱۹۸۰ء کو اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال کر گئے۔ کراچی میں سپردِ خاک کیے گئے۔ اللہ مغفرت فرمائے!

مرحوم کا مجموعۂ کلام "سنگِ آفتاب" ۱۹۷۷ء میں اور دوسرا مجموعہ "سوزِ گیتی" ان کی وفات کے چند ماہ بعد ستمبر ۱۹۸۰ء میں کراچی سے شائع ہوا۔

سرؔور مرحوم بڑے مہذب، خوش مزاج اور با اخلاق انسان تھے۔ ان کا یہ شعر ضرب المثل بن کر رہ گیا ہے:

جن سے مل کر زندگی سے پیار ہو جائے وہ لوگ
آپ نے دیکھے نہ ہوں شاید مگر ایسے بھی ہیں

("محفل جو اجڑ گئی")

"سنگِ آفتاب"

سرؔور صاحب نے سنگِ آفتاب" کے نام سے اپنا پہلا مجموعۂ کلام ۱۹۷۷ء میں کراچی سے شائع کیا جس کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ اس کا دیباچہ ان کے دوست افسر ماہ پوری (۱۹۱۸ء-۱۹۹۵ء) نے "سرور اور اس کا فن" کے عنوان سے لکھا ہے۔ یہ دیباچہ بہت دلچسپ اور اہم ہے۔ اس میں افسر مرحوم نے ڈھاکے میں سرؔور کی ابتدائی کارگزاریوں کا حال بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جب سرؔور ڈھاکے میں رہنے لگے تو معاش کا بھی سوال پیدا ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ انجمن ترقی اردو مشرقی پاکستان کے آفس سکریٹری ہو گئے۔ اور ایک عرصے تک ہم دونوں مل جل کر انجمن کے دفتری کام انجام دیتے رہے۔ اس وقت میں پلاسی بارک میں رہتا تھا۔ میرے گھر پر سرؔور، نظیر صدیقی اور عطاء الرحمٰن جمیل کی روزانہ بیٹھک رہتی تھی۔ یہ تینوں اپنی اپنی انفرادی صلاحیت وفراست اور طباعی و گیرائی کے اعتبار سے وسیع

فن کارانہ امکانات اور تابناک مستقبل کے حامل تھے۔ چونکہ میں ان سے عمر میں کافی بڑا تھا، لہٰذا یہ تکلّم میرا بے تکلفانہ لحاظ ہمیشہ کرتا رہا اور اس تکلّم سے رفاقت کے رشتے جس نہج پر استوار ہوئے اس میں ایک چوتھائی صدی گزرنے کے باوجود کوئی فرق نہیں آیا۔ سرورؔ مشرقی مزاج و مذاق رکھتے ہیں۔ اس لیے مشرقی اقدار و آداب کا لحاظ ان کی فطرت میں داخل ہے۔ وہ دوستوں سے تعلقات میں گرم جوشی کے اتنے قائل نہیں جتنے ہمواری و استواری کے۔

''جوں جوں وقت گزرتا گیا، سرورؔ اور دوسرے احباب کی ادبی اور معاشی سرگرمیاں تیزی سے بڑھنے اور پھیلنے لگیں۔ نظیر صدیقی کالج میں اُردو پڑھانے لگے اور تنقید نگاری اور انشا پردازی کی کڑی منزلیں سر کرنے میں مصروف ہو گئے۔ عطاء الرحمن جمیل بھی دیکھتے ہی دیکھتے سپرنٹنڈنگ انجینئر کے عہدے تک پہنچ گئے۔ پھر وہ تصوف کی طرف مائل ہو گئے۔ سرورؔ علم و ادب کے میخانے سے نکل کر فلم و تمثیل کے نگار خانے جا پہنچے۔ یہ اُردو کی عجیب خصوصیت ہے کہ اس کے اکثر غیر معمولی ذہین و طباع فن کار کسی نہ کسی مرحلہ پر یا تو فلمی دنیا میں جا نکلتے ہیں یا تصوف کی دنیا کے ہو رہتے ہیں۔ اس سے فن کاروں کی قسمت سنورتی ہو یا نہ ہو، اُردو کی عافیت یقیناً خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

''سرورؔ نے مشرقی ماحول میں آنکھیں کھولیں اور پروان چڑھے اور ان کی شاعری کلاسیکی رنگ و لباس میں جوان ہوئی ہے۔ حُسن، ان کی شخصیت اور ان کی شاعری میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہ فیصلہ کرنا ان کے باب میں مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کی شخصیت سے ان کی شاعری حسین، شگفتہ اور دل کش معلوم ہوتی ہے یا ان کی شاعری سے ان کی شخصیت۔''

(''سنگِ آفتاب۔'' ص: ۱۷۶-۱۷۹)

نمونۂ کلام

چند غزلیں درج کی جاتی ہیں:

کہے تو کون کہے سرگزشتِ آخرِ شب!
جنوں ہے سر بہ گریباں، خرد ہے مہر بہ لب
فضا اداس ہے، نم ہو چلا ہے دامنِ شب
کہاں ہے اے مری شامِ الم کی صبحِ طرب
یہ عالمِ قد و گیسو، یہ حُسنِ عارض و لب
تمام نکہت و نغمہ، تمام شعر و ادب
تمہارے عہدِ وفا کے ہیں آج تک شاید
یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ ماہتاب، یہ شب
ہزار حرف و حکایت وہ ایک نیم نگاہ
ہزار وعدہ و پیماں وہ ایک جنبشِ لب
سرودِ منزلِ جاناں ہے، کب سے چشم براہ
بھٹک رہا ہے کہاں کاروانِ شوق و طلب

☆☆☆☆☆

اللہ رے اک حُسنِ طرح دار کا عالم
سر تا بہ قدم فتنۂ بیدار کا عالم
وہ چہرۂ شاداب پہ ہلکا سا تبسم
وہ روئے شفق رنگ پہ انوار کا عالم
پلکوں پہ اٹھائے ہوئے میخانوں کی دنیا
شانوں پہ لیے گیسوئے خمدار کا عالم

وہ حافظؔ و خیامؔ کا رنگین تخیل !
وہ مانیؔ و بہزادؔ کے شہکار کا عالم
القصہ سرورؔ اب بھی نگاہوں میں بسا ہے
وہ چشم و لب و کاکل و رخسار کا عالم

☆☆☆☆☆

ہر ایک گام پہ دی ہیں بشارتیں کیا کیا
لیے ہے قامتِ جاناں قیامتیں کیا کیا
وہ اُس کا حُسنِ تکلم کہ رہ گئیں اکثر
مچل کے میرے لبوں پر جسارتیں کیا کیا
مجالِ ترکِ مراسم تو ہے مجھے لیکن
کسے خبر کہ ہیں اس میں قباحتیں کیا کیا
وہ کیا نگاہ تھی، ابھی تو ایک ساعت میں
گزر گئیں دل و جاں پر قیامتیں کیا کیا
دلوں کا زہر لبوں تک سرورؔ آ پہنچا
کھلیں زبان تو نکلیں کدورتیں کیا کیا

تو عروسِ شامِ خیال بھی، تو جمالِ روئے سحر بھی ہے
یہ ضرور ہے کہ بہ ایں ہمہ مرا اہتمامِ نظر بھی ہے
یہ مرا نصیب ہے ہم نشیں، سرِ راہ بھی نہ ملے کہیں
وہی میرا جادۂ جستجو، وہی ان کی راہ گزر بھی ہے
نہ ہو مضمحل مرے ہم سفر، تجھے شاید اس کی نہیں خبر
انھیں ظلمتوں ہی کے دوش پر، ابھی کاروانِ سحر بھی ہے

ترے قُرب نے جو بڑھا دیے کبھی مٹ سکے نہ وہ فاصلے
وہی پاؤں ہیں، وہی آبلے، وہی اپنا ذوقِ سفر بھی ہے
بہ ہزار دانش و آگہی، مری مصلحت ہے ابھی یہی
میں سرورِ رہروِ شب سہی، مری دسترس میں سحر بھی ہے

سرورؔ نے گھریلو ذمہ داریوں سے کبھی پہلو تہی نہیں کی۔ چار بیٹے اور تین بیٹیاں یادگار چھوڑیں۔ فرحت پروین ملک کے "دربارِ ادب" میں ان کا خوب صورت خاکہ شامل ہے جس سے ان کے اخلاق و کردار پر روشنی پڑتی ہے۔

❖❖

ادیب سہیل

(شاعر، مضمون نگار، صحافی)

سید محمد ظہور الحق نام اور ادیب سہیل قلمی نام ہے۔ ۱۹۲۲ء میں ضلع مونگیر (بہار) میں ایک خوش حال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ شروع ہی سے ادبی ذوق کے حامل تھے۔ غالباً ۱۹۴۱ء میں گیا سے میٹرک پاس کیا اور ملازمت کی تلاش میں کلکتہ آ گئے۔ اس وقت کلکتہ شعر و ادب کا مرکز بنا ہوا تھا۔ بہار کے شعرا اور ادبا کی ایک بڑی تعداد وہاں موجود تھی۔ متعدد اخبارات و رسائل وہاں سے نکل رہے تھے۔ کلکتہ کی صحافت اپنے عروج پر تھی۔ ادیب سہیل کو بھی صحافت سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ چونکہ ان کے اکثر و بیشتر ساتھی ترقی پسند تھے اس لیے وہ بھی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش بھی ختم نہ ہوئی۔ ۱۹۴۳ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے آئی۔کام کا امتحان پاس کیا۔ ملازمت کے سلسلے میں چند سال دہلی میں رہے۔ کلکتہ واپس آئے تو انھیں ریلوے کے اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت مل گئی۔

ادیب سہیل نے افسانہ نگاری اور نظم نگاری بھی شروع کر دی اور ان کا شمار کلکتہ کے نوجوان ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں میں ہونے لگا۔

ادیب سہیل تقسیم کے بعد آپٹ کر کے ۱۹۴۷ء میں مشرقی پاکستان آ گئے۔ سید پور میں جہاں ریلوے کا بڑا ورک شاپ تھا، ان کی تعیناتی ہوئی۔ ان کے شعر و ادب کی صحیح معنوں میں آبیاری یہیں ہوئی اور ان کی نظمیں ہند و پاک کے جرائد و رسائل میں شائع ہونے لگیں۔ وہ ایک ترقی پسند

شاعر کی حیثیت سے مشہور و معروف ہو گئے۔ جب راج شاہی یونیورسٹی قائم ہوئی تو ادیب سہیل نے وہاں سے پرائیوٹ طور پر بی۔کام کا امتحان بھی پاس کر لیا۔

ریلوے کی ملازمت کے باوجود ادیب سہیل کی صحافت سے دلچسپی کم نہ ہوئی۔ آخری دنوں میں ریلوے سے طویل رخصت لے کر یا تبادلہ کروا کر ڈھاکا آ گئے۔ یہاں کچھ عرصے تک روزنامہ "پاسبان" سے منسلک رہے۔ ان کا تعلق مشہور صحافی صلاح الدین محمد کے قائم کردہ 'فیچر سنڈیکیٹ" سے بھی رہا۔ اس دور میں انھوں نے متعدد فیچر لکھے۔

سقوطِ ڈھاکا کے بعد ۱۹۷۴ء میں جب ادیب سہیل کراچی پہنچے تو ان کی تعیناتی راولپنڈی ریلوے میں ہو گئی۔ ۱۹۸۲ء میں وقت سے کچھ پہلے ہی وہ ریلوے کی ملازمت سے سبک دوش ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے "انجمن ترقی اُردو" کراچی میں ملازمت کر لی اور ماہنامہ "قومی زبان" اور سہ ماہی "اُردو" کے مدیر مقرر کیے گئے۔ یہ کام انھوں نے تقریباً بیس سال تک بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ کتابوں پر تبصرے بھی لکھتے رہے۔

اس دوران ادیب سہیل کے حسب ذیل چار مجموعے شائع ہوئے:

۱۔ "بکھراؤ کا حرفِ آخر"

یہ شعری مجموعہ آزاد نظموں پر مشتمل ہے۔ جس کا موضوع سقوطِ ڈھاکا ہے۔

۲۔ "غمِ زمانہ بھی سہل گزرا" (منظوم خودنوشت)

ادیب سہیل کو اپنی مرحومہ بیگم (عارفہ) سے بڑی محبت تھی۔ یہ پوری منظوم خودنوشت انھیں کے گرد گھومتی ہے۔

۳۔ "کچھ نظمیں ایسی ہوتی ہیں"۔ (نظموں کا مجموعہ)

۴۔ "یہ زندگی ہے اپسرا" (نظموں اور غزلوں کا مجموعہ)

ادیب سہیل کم و بیش ستر سال تک مسلسل لکھتے رہے۔ اتنا طویل عرصہ بہت کم ادیبوں کو نصیب ہوتا ہے۔ انھوں نے دوسرے نام نہاد ترقی پسندوں کی طرح بھی خدا، مذہب اور معاشرتی

اقدار سے بغاوت یا بیزاری کا اظہار نہیں کیا۔ انسان دوستی، ظلم سے نفرت، مساواتِ انسانی اور عالمی امن کی خواہش ان کی شاعری کے خاص موضوعات ہیں۔

"یہ زندگی یہ اپسرا"

ادیب سہیل کا آخری مجموعہ "یہ زندگی یہ اپسرا" کے نام سے ۲۰۰۹ء میں ان کی بیماری کے دوران شائع ہوا۔ یہ ضخیم اور خوب صورت مجموعہ ۳۹۶ صفحات پر مشتمل ہے جو مجموعہ کی بجائے کلیات معلوم ہوتا ہے۔ اس میں ۷۵ نظمیں اور ۷۵ غزلیں ہیں۔ نظمیں سب آزاد ہیں۔ وہ ہندی اور سنسکرت کے الفاظ اپنی نظموں اور غزلوں میں بکثرت استعمال کرتے ہیں۔

نمونے کے طور پر دو نظمیں اور غزل کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں۔ "یہ زندگی یہ اپسرا" ان کی ایک چھوٹی سی نظم ہے۔ شاید انھیں یہ نظم بہت پسند ہے کہ پورے مجموعے کا نام یہی رکھ دیا۔

کتاب کا انتساب یہ ہے:

"شریکِ حیات عارفہ (مرحومہ) کے نام"

نمونۂ کلام

یہ زندگی یہ اپسرا

یہ زندگی یہ اپسرا
اُس کے من کی کامنا تھی کاش میں لکھتا کبھی
زندگی پر ایک البیلی سی نظم
زندگی ہوتی کوئی چنچل پری
بادلوں کے پنکھ، روپک دامنی

اس کے من کی کامنا کو روپ دینے کے لیے
سوچ کے رتھ پر سوار
لوک اور پرلوک میں اُڑتا پھرا اُس اپسرا کے کھوج میں
جب اچانک اک ڈگر پر رتھ رکی
میں نے یہ سمجھا مری من چاہی منزل آگئی
رتھ کے جھلمل ریشمیں پردے ہٹا کر جب اٹھی میری نظر
آم کے پھینکے ہوئے چھلکوں کے پاس
میں نے دیکھی ایک صورت ملگجی
آم کی چوسی ہوئی گٹھلی نظر آئی مجھے
یہ زندگی یہ اپسرا!

گیند

جس دم قدم نکالے
میرے کھیلنے کو اک گیند ملی
بالک پن کے عرصے میں
یہ گیند نہ جانے کتنی بار
ہاتھ سے میرے چھوٹی بھی
اور ہاتھ میں میرے آئی بھی
ہوش سنبھالا تو یہ کھلنڈری ایسی چھوٹی
قابو میں کرنے کی کوشش قدم قدم ہلکان ہوئی
جب سے اب تک

گیند لڑھکتی جاتی ہے
پیچھے پیچھے پالینے کی خواہش پیہم بھاگتی جاتی ہے

غزل کے اشعار:

دیارِ جاں پہ مسلط عجب زمانہ رہا
نظر میں درد لبوں پہ رواں ترانہ رہا
کچھ اس ادا سے گزاری جہانِ نکہت میں
ہر ایک پھول کا دل میرا آشیانہ رہا
کسی پہ برق گری شاخِ جاں سلگ اٹھی
کسی پہ سنگ چلے، سر مرا نشانہ رہا

☆☆☆☆☆

کام کی بات بہت کم ہے دکھاوا ہے بہت
آج ہر راہ گزر پہ یہ تماشا ہے بہت
وسعتِ بحر سے کیا خاک شناسا ہوگی
جب مری جستجوئے فکر کو دریا ہے بہت
کام آئے تو نہ کرنے کے بہانے ڈھونڈے
کام کا اس کے مگر شہر میں چرچا ہے بہت

☆☆☆☆☆

نوکا، چاند، ندی کی لہری اور بیتالی راگ
اگنی بان چلاتی ہے یہ شیتل شیتل آگ

پدما تیرے کنارے دیکھا میگھ کا اصلی روپ
تیری ہی آغوش میں جاتا کیا ہے ملہار کی آگ
یہ بنگال سنہرا بندھو گیت اور پیار کا دیس
ندی نالے چاہت چھلکیں، ئے سے پھوٹے راگ

ادیب سہیل کو فنِ موسیقی پر بھی دست رس حاصل ہے۔ انھوں نے موسیقی کے رموز اور فن پر متعدد مقالے لکھے جو مختلف رسالوں میں شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ ان مقالوں کا مجموعہ "رنگ ترنگ" کے نام سے شائع ہوا۔ وہ خود بھی گاتے اور ستار بجاتے تھے۔

ادیب سہیل نے "پاکستانی ادب سال بہ سال" کے عنوان سے ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۳ء تک پاکستانی ادب کا جائزہ لیا جو ریڈیو پاکستان، کراچی سے پیش کیا گیا۔ ڈراما "میاں تان سین" کے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے ایک ڈرامہ چھ قسطوں میں لکھا جس کی ڈرامائی تشکیل حسینہ معین نے کی اور پی ٹی وی پر پیش کیا گیا۔

ادیب سہیل گزشتہ تین چار سال سے برین ہیمرج کا شکار ہو کر معذوری کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اللہ رحم فرمائے! ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں۔

جمیل عظیم آبادی

(قادرالکلام شاعر، بلند کردار انسان)

محمد جمیل احسن نام اور جمیل عظیم آبادی قلمی نام ہے۔ ۱۹۲۳ء میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کرلی۔ تقسیم کے بعد ان کا تبادلہ مشرقی پاکستان ہو گیا۔ وہ محکمہ تار اور ٹیلی فون سے وابستہ تھے۔ ڈھاکا آنے کے بعد انھوں نے آئی۔ کام اور بی۔ کام کے امتحانات پاس کیے اور محکمے میں ترقی کرتے ہوئے اعلیٰ عہدے پر پہنچے۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد کراچی آگئے۔ وہ ڈھاکے میں شاعر کی حیثیت سے زیادہ معروف نہ تھے۔ کراچی آنے کے بعد شاعر وادیب کی حیثیت سے مشہور ومعروف ہوگئے اور ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔

جمیل عظیم آبادی نے ریٹائرمنٹ کے بعد ہومیوپیتھی ڈاکٹر کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کی۔ اللہ نے انھیں دستِ شفا عطا کیا تھا۔ وہ علاج معالجے کی دنیا میں ڈاکٹر جمیل احسن کے نام سے مشہور تھے۔

جمیل عظیم آبادی شعروسخن کی محفل سجانے میں بھی خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ ایک عرصے تک ان کے یہاں نعتیہ مشاعرے اور ادبی نشستیں ہوتی رہیں۔ وفات سے چند ماہ قبل تک ہر بدھ کو ان کے یہاں ادبی نشست ہوتی رہی۔ جمیل صاحب فراخ دل، کشادہ دست اور پسندیدہ اخلاق و کردار کے حامل انسان تھے۔ مہمانوں کی خاطر داری اور دل جوئی میں ان کا کوئی جواب نہ تھا۔ ایسے صاحب کردار شاعر وادیب بہت کم نظر آتے ہیں۔

جمیل صاحب کے حسب ذیل شعری مجموعے کراچی سے شائع ہوئے:

۱۔ دل کی کتاب (غزلوں کا مجموعہ)	۱۹۸۳ء
۲۔ گیان درپن (دوہے اور گیت)	۱۹۸۵ء
۳۔ آب و سراب (نظمیں)	۱۹۹۳ء
۴۔ گلہائے صد نگار (غزلیں)	۱۹۹۷ء
۵۔ گلِ سر برگ (ثلاثی، ماہیے، ہائیکو)	۱۹۹۷ء
۶۔ وحدت و مدحت (حمد و نعت)	۱۹۸۷ء
۷۔ الرحمٰن (حمد)	۲۰۰۰ء
۸۔ المدثر (نعت)	۲۰۰۰ء
۹۔ دوہا سنسار (دوہے)	۲۰۰۳ء

نثر نگاری

جمیل عظیم آبادی ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ ان کے حسب ذیل افسانوی مجموعے شائع ہوئے:

۱۔ روایت کے قیدی	کہانیاں	۲۰۰۳ء
۲۔ روشنی	کہانیاں	۲۰۰۵ء
۳۔ ثمر اداور دوسری کہانیاں		۲۰۰۹ء

مضامین اور تبصروں کا ایک مجموعہ "میری نظر میں" ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا۔

حمد و نعت

جمیل عظیم آبادی ایک مذہبی انسان تھے۔ وہ اسلامی اور اخلاقی اقدار کے پاسدار و ترجمان تھے۔ انھیں آخری دور میں حمد و نعت سے بہت شغف ہو گیا۔ وہ اپنے یہاں نعتیہ اور حمدیہ مشاعرے بھی کیا کرتے تھے جو ایک مدت تک جاری رہے۔ ان مشاعروں کی وجہ سے بہت سے شعرا

نعت گو بن گئے اور ان کے نعتیہ مجموعے بھی شائع ہوئے۔ جمیل صاحب کے حمد و نعت کے تین مجموعے شائع ہوئے۔ "وحدت و مدحت"، "الرحمٰن" اور "المدثر"۔ ان کی ایک خوب صورت حمد کے چند اشعار:

جلوۂ تاباں سے تیرے لامکاں میں روشنی
کہکشاں در کہکشاں ہے آسماں میں روشنی
روشنی سے تیری ذات منفرد تعبیر ہے
جس کے پرتو سے فضائے بے کراں میں روشنی
ذرہ ذرہ میں نمایاں نورِ وحدت کی ضیا
دشت و دریا، کوہ و صحرا، گلستاں میں روشنی
صدق دل سے جس نے تیرے نام کی تسبیح کی
غیب سے در آئی اس کے جسم و جاں میں روشنی

دوہے:

جمیل عظیم آبادی نے دوہا نگاری میں خاص کمال حاصل کیا۔ ان کے دوہوں کے دو مجموعے "گیان درپن" اور "دوہا سنسار" شائع ہوا۔ چند دوہے بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں:

جیون کی ہے ریت نرالی اپنا اپنا بھاگ
کوئی رو رو جان گنوائے کوئی کھیلے پھاگ

☆☆☆☆☆

سچ کے رستے جو چل دے گا اس کا ہے نروان
گھر گھر اس کی لوک کہانی جگ جگ اس کا مان

☆☆☆☆☆

آدم کے تو پوت ہیں سارے ہوّا سب کی مائی
کاہے کا پھر جھگڑا ہے جب اک دوجے کے بھائی

☆☆☆☆☆

تیری یاد کو بھولوں کیسے تو ہے پالنہار
تیری کرپا ہو تو دیالو میرا بیڑا پار

☆☆☆☆☆

غارِ حرا کے دیپک سے ہے دونوں جگ اجیارا
اقرا ساگر کی لہروں میں گیان کا بہتا دھارا

☆☆☆☆☆

دودھ ملائی راجا کھائے پرجا کھائے لات
اونچی ذات کا ٹھاکر ہے وہ یہ دکھیاری ذات

☆☆☆☆☆

مے کا دھارا کون سنبھالے مانجھی نا پتوار
سچ کی رسّی جو پکڑے گا اس کا بیڑا پار

☆☆☆☆☆

جھوٹ کے کوئی پاؤں نہیں ہیں کہتے ہیں یہ گیانی
اس دلدل سے بچ کے رہنا جھوٹ ہے گدلا پانی

☆☆☆☆☆

دہشت گردی پاپ ہے مورکھ بچ کے اس سے رہنا
ہاتھ نہ آئے کچھ بھی اس سے بے کارن ہے مرنا

☆☆☆☆☆

غزل

جمیل عظیم آبادی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں کے دو مجموعے "دل کی کتاب" اور "گلہائے صد نگار" شائع ہوئے۔ ان کی غزلوں میں بھی ایک خاص انفرادیت ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

دل کے گہرے زخم کا مرہم ہم کو ملا دلداری سے
زعم مسیحا تجھ کو خبر کیا پوچھ لے ہم بیماروں سے
مشرق و مغرب کے اندر تو شام و سحر کی دوری ہے
دل کو آخر جوڑیں کیسے سات سمندر پاروں سے
اہلِ خرد کی دنیا نے کیا اونچا اڑنا سیکھا ہے
توڑ کے ناتا دل والوں سے نسبت ہے سیاروں سے
صبح و مسا کا پھیرا ہے کوئی گھاٹ نہ کوئی ڈیرا ہے
ٹھور ٹھکانہ پوچھو ہو کیا ہم جیسے بنجاروں سے

کیا اک اک غزل کا انتخاب آہستہ آہستہ
مکمل ہو گئی "دل کی کتاب" آہستہ آہستہ

تارے شبِ فراق کے ٹوٹے بکھر گئے
دامن غمِ حیات کے پھولوں سے بھر گئے

توبہ پھر کیوں ٹوٹ نہ جائے موسمِ باد و باراں میں
جام سے آ کر جام کوئی جب چپکے سے ٹکرائے تو

اپنے پرائے ہم کو سبھی اجنبی لگے
مدت کے بعد ہم جو کبھی اپنے گھر گئے

آئے گی صبح لے کے کبھی مژدۂ بہار
اس طولِ انتظار میں کچھ لوگ مر گئے

افسر ماہ پوری ''دل کی کتاب'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دوہری ہجرت کا آشوب جمیل عظیم آبادی کی شاعری کی روح میں رنگ کی مانند گھلا ہوا ہے۔ یہ تجربہ ان کا انفرادی تجربہ بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ ایسا تجربہ جس کا گہرا اثر ان کی شاعری میں موجود ہے۔

غریبِ شہر ہوں یارب کہیں امان تو دے
جو دی ہے دھوپ تو پھر سر پہ سائبان تو دے

راس آئی نہ فصلِ بہاراں ہمیں
تم وہاں کھو گئے، میں یہاں کھو گیا

☆☆☆☆☆

سب کچھ لٹا کے راہِ وفا میں ہیں مطمئن
ہم اہلِ دل کا جذبۂ ایثار دیکھنا

☆☆☆☆☆

ہنستا ہوا یہ شہر سرِ شام سو گیا
سیلِ بلا کے ہوں نہ یہ آثار دیکھنا

☆☆☆☆☆

صحرا کے خار و خس کو بھی اک زندگی ملی
جب رنگ و بو کے قافلے گلزار سے چلے

''دوہری ہجرت کا یہ تجربہ جمیل عظیم آبادی کی شاعری کا بنیادی تجربہ ہے اور اسی لیے ''دل کی کتاب'' پڑھنے والے کے دل پر اثر کرتی ہے۔''

(''جمیل عظیم آبادی۔ شخصیت اور فن۔'' ص: ۱۷۶، ۱۷۷)

جمیل عظیم آبادی کی شخصیت اور فن پر مضامین کا ایک ضخیم مجموعہ (صفحات ۴۰۰) یاور امان اور ابن عظیم فاطمی نے بڑے سلیقے سے مرتب کیا جو "جمیل عظیم آبادی۔ شخصیت اور فن" کے نام سے ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔ کراچی یونیورسٹی کی علیزہ صدیقی نے اپنے ایم۔اے کا مقالہ "جمیل عظیم آبادی۔فن اور شخصیت" کے نام سے لکھا جو شائع بھی ہوا۔

جمیل عظیم آبادی کی وفات کراچی میں کینسر کے مرض میں ۹ رمئی ۲۰۱۱ء کو ہوئی۔ پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں یادگار چھوڑیں۔ سب شادی شدہ اور صاحب اولاد ہیں۔

اخلاق و کردار

جمیل صاحب اپنے اعلیٰ اخلاق و کردار کی وجہ سے ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ اے خیام لکھتے ہیں:

"جمیل عظیم آبادی کٹر مذہبی شخص ہیں لیکن مُلائیت نام کو نہیں۔ سماجی اور فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، کئی فلاحی اداروں کی سرپرستی کرتے ہیں اور عملی طور پر انتظامی امور میں شامل ہوتے ہیں۔ وہ تہذیبی اقدار کے امین ہیں۔ انتہائی وضع دار، خوش مزاج اور ہر ایک کے لیے اچھے خیالات رکھنے والے انسان ہیں۔ اپنی تکلیف بھول کر دوسروں کی تکلیف پر افسردہ ہو جاتے ہیں۔ وضع داری اور مستقل مزاجی کا یہ عالم ہے کہ کوئی بیس سال پہلے مجلسِ احبابِ ملّت' قائم کی، ہفتہ وار نشستوں کا اہتمام ہونے لگا اور کسی بھی رکاوٹ کو خاطر میں لائے بغیر، بلاتوقف، یہ سلسلہ آج تک قائم ہے۔ سارا اہتمام خود کرتے ہیں اور اس میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔"

("جمیل عظیم آبادی۔ شخصیت اور فن"۔ ص:۱۰)

❖❖

خواجہ منظر حسن منظؔر

(منفرد شاعر، ممتاز تاریخ گو)

خواجہ منظر حسن منظرؔ ایک صاحبِ فکر و نظر شاعر ہیں۔ بہار شریف (پٹنہ) میں ۱۹ / دسمبر ۱۹۲۳ء کو پیدا ہوئے۔ پٹنہ کالج سے بی۔اے کرنے کے بعد ۱۹۴۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ریاضی میں ایم۔اے کیا اور ہجرت کر کے مشرقی پاکستان چلے گئے۔ کچھ عرصے تک ایک کالج میں لیکچرار رہے، پھر سرکاری ملازمت کر لی۔ ۱۹۶۸ء میں ان کا تبادلہ کراچی ہو گیا۔ اس دوران ان کی اہلیہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ لہٰذا دل شکستگی کے عالم میں پانچ بچوں (ایک بیٹا، چار بیٹیاں) کو لے کر کراچی آ گئے۔

مشرقی پاکستان میں خواجہ منظر کا قیام زیادہ تر چاٹگام، راج شاہی اور سلہٹ میں رہا۔ اس دوران وہ قومی، ملی اور سیاسی موضوعات پر نظمیں لکھتے رہے۔ زیادہ تر طنزیہ نظمیں لکھیں۔ انھیں فنِ تاریخ گوئی سے خاص دلچسپی رہی۔ وہ اس فن کے ماہر ہیں۔ کراچی سے ان کے حسبِ ذیل چار شعری مجموعے شائع ہوئے۔

۱۔ "ضربِ گُل"۔ ۱۹۸۷ء (نظموں اور غزلوں کا مجموعہ)

۲۔ "ضربِ تیشہ"۔ ۱۹۸۸ء (نظمیں)

۳۔ "زیر، زبر، پیش" ۱۹۹۹ء (نظمیں، تاریخی قطعات، غزلیں)

۴۔ "تشہیدِ تاریخ"۔ پہلی اشاعت ۲۰۰۲ء اور دوسری اشاعت ۲۰۰۶ء

(تاریخی قطعات اور نظموں کا مجموعہ)

خواجہ منظر حسن ایک اچھے اور منفرد شاعر ہونے کے علاوہ اعلیٰ اخلاق و کردار کے حامل انسان بھی ہیں۔ انھوں نے دوسری شادی نہیں کی اور ملازمت کی مصروفیتوں کے باوجود اپنے بچوں کو ماں بن کر پالا۔ اب ان کے بچے بھی صاحب اولاد اور اپنے اپنے گھر میں خوش حال ہیں۔ ایک عرصہ ہوا وہ ریٹائر ہو چکے ہیں اور گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

ذیل میں خواجہ منظر کی چاروں کتابوں پر کسی قدر تفصیلی نظر ڈالی جاتی ہے۔

''ضربِ گُل''

خواجہ منظر حسن منظر کا یہ پہلا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۷ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ اس میں افسر ماہ پوری، انجم اعظمی اور شاعر کے دیباچے ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں ۲۶ نظمیں، ۳۰ غزلیں اور متعدد قطعات ہیں۔ خواجہ صاحب کو نظموں سے خاص دلچسپی ہے۔ انداز طنزیہ اور اصلاحی ہے۔ ان کی غزل گوئی منفرد انداز کی حامل ہے اور معنویت سے بھرپور ہے۔ ذیل میں ان کی غزلوں سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ خواجہ منظر مذہبی اور اخلاقی اقدار کے علم بردار ہیں لیکن مذہبی انتہا پسندی کے مخالف ہیں۔

منتخب اشعار:

جو نورِ بصیرت کی ضو عام کر دے
وہ گنبد، وہ محراب ڈھونڈا کیے ہم

☆☆☆☆☆

ہے یہاں بحرِ عرب یا ہے خلیج بنگال
راستہ تم نے دکھایا ہے جو کاشانے کا
اذن ہے عام یہاں شیخ بھی ہے جام بکف
کون کہتا ہے کہ در بند ہے میخانے کا

قوس و گنبد تو حرم کے ہیں دل آویز بہت
کیجئے کیا کہ ہے ماحول صنم خانے کا

☆☆☆☆☆

جلا کے گھر کو مناتے ہیں جشنِ تاریکی
گہن نہ چاند میں اس شان سے لگا ہوگا
بچا کے آنکھ پیچھے جا رہے ہو تم منظر
کوئی جہان میں تم سا نہ پارسا ہوگا

☆☆☆☆☆

کوئی جا کر یہ کہہ دے راہبر سے
کہ منزل دور ہے اس رہ گزر سے
وہ جن کی آستیوں میں صنم ہیں
نظر آئے ہیں کتنے معتبر سے
لنڈھائے خم کے خم محفل میں کوئی
کوئی اک جرعۂ مے کو بھی ترسے
یہ حالِ زار ہے جن کی بدولت
نظر آتے ہیں کتنے بے خبر سے
قدم پہ اُن کے جا گرتے جو منظر
نہ گرتے تم کبھی ان کی نظر سے

☆☆☆☆☆

نہ جانے آج کیوں لٹنے کا غم ہے
کوئی دولت ہمارے پاس تھی کیا

یہاں تو آگ سی دل کو لگی ہے
لگی دل کی ہے کوئی دل لگی کیا

☆☆☆☆☆

تسخیرِ مہر و ماہ کیے جارہے ہیں وہ
تفسیرِ لا الٰہ کیے جا رہا ہوں میں
منظرؔ غمِ حیات کو دل میں سمیٹ کر
تقدیر سے نباہ کیے جا رہا ہوں میں

☆☆☆☆☆

لٹا ہے قافلہ آ کر جو یوں سرِ منزل
ہے رہبری مرے رہبر کی رہزنی کی طرح
وہ زندگی ہے فرشتوں کی زندگی سے بھلی
جیے اگر کوئی انسان آدمی کی طرح
زمینِ شعر میں منظرؔ کا مشرقی انداز
نہ لکھنوی کی طرح نہ دہلوی کی طرح

ضربِ تیشہ

خواجہ منظر کا دوسرا مجموعۂ کلام ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا جس میں تمام تر نظمیں ہیں۔ اس میں مختار زمن، نصر اللہ خاں اور خواجہ منظر کے دیباچے ہیں۔ کتاب ۱۷۶ صفحات اور ۶۱ نظموں پر مشتمل ہے۔ نظموں میں طنز کی کاٹ نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا نام "ضربِ تیشہ" رکھا گیا ہے۔ اس مجموعے کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۸ء میں چھپا۔

خواجہ صاحب کی تمام نظمیں پابند ہیں۔ وہ آزاد نظم کے قائل نہیں۔ بعض شعرا یہ سمجھتے ہیں کہ اگر انھوں نے آزاد نظمیں نہ لکھیں تو ان کا شمار جدید شعرا میں نہ ہوگا اور بعض نقاد بھی یہی تاثر دیتے

کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ محض ان کا خیال خام ہے۔ کلام میں جدت و ندرت، فکر و نظر کی تازگی و گہرائی اور اسلوب کی دلآویزی سے آئی ہے، محض چھوٹے بڑے مصرعے جوڑ دینے سے نہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شاعری نغمہ و ترنم کا دوسرا نام ہے۔ جو چیز گائی نہ جا سکے اسے صحیح معنوں میں شاعری نہیں کہہ سکتے۔

اس میں شک نہیں کہ "آزاد نظم" دورِ جدید میں شاعری کی ایک تسلیم شدہ فارم یا ہیئت ہے، جس میں شاعر کو اوزان کا لحاظ بھی رکھنا پڑتا ہے۔ اس میں اسے اظہارِ خیال کے لیے زیادہ آزادی میسر ہوتی ہے۔ لیکن آزاد نظم لکھنے والے علامتوں کا استعمال بہت زیادہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے اکثر آزاد نظمیں معمہ بن جاتی ہیں اور اس کو بھی شاعر کا کمال سمجھا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب نے اس موضوع پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ یہ نظم دیکھئے:

آزاد نظمیں سننے کے بعد

جو مری سمجھ میں نہ آ سکا وہ ضرور تھا کوئی فلسفہ
مرے ذہن میں نہ سما سکا، مرے ذہن کا یہ قصور تھا
وہ جو ہو رہا تھا مشاعرہ کہ نہ بحر ہی تھی نہ وزن تھا
کوئی نثر تھی کہ وہ نظم تھی، مری کچھ سمجھ میں نہ آ سکا
مری فہم کا یہ قصور تھا، یہ مری سمجھ کا فتور تھا
کہ جو کہنے والا تھا فلسفی، کوئی فلسفہ وہ ضرور تھا
وہ جو جعفری بھی مصوری کے کمال کو نہ سمجھ سکا
کوئی شکل تھی وہ حسین سی کہ تپائی پہ تھا رکھا گھڑا
وہی حال، سن کے ہر ایک کو، مرے قلبِ زار کا بھی ہوا
میں سنا کیا کہ سمجھ سکوں نہ سمجھ سکا تو میں رو دیا

خواجہ صاحب معاشرے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔اس کے بگاڑ پر ان کا دل ملول ہوتا ہے اور وہ اپنے دل کے درد کو نظموں کی صورت میں منتقل کردیتے ہیں۔طنز کی ایک لہر بھی ان میں موجود ہوتی ہے۔ذیل میں ان کی دو اور نظمیں درج کی جاتی ہیں:

یہ دانش ور

شبِ دیجور کو یہ صبحِ صادق کہنے والے ہیں
یہ جنت میں ہمیشہ احمقوں کی رہنے والے ہیں
خس و خاشاک کی ہمت کہ رُخِ سیلاب کا موڑیں
جدھر سیلاب کا رُخ ہو اُدھر ہی بہنے والے ہیں
بھروسا ہے انھیں نقلی خدا کے من و سلویٰ پر
یہ سچ کہہ کر بھلا ظلم و ستم کب سہنے والے ہیں

جمہوریت کی لاش

کل جس نے دو حریف کو دی تھی شکستِ فاش
وہ قوم اور آج ہو اس طرح ذی فراش
گم کردہ راہ آج ہوئے رہبرانِ قوم
ہے آج ان کو منزلِ مقصود کی تلاش
ہے ان کی جیب مال و زر و سیم کا گدام
کاسہ ہے اپنے ہاتھ میں گندم، نہ جو، نہ آش
رشوت کے دم قدم سے فزوں زورِ اقتدار
ہے دوشِ اقتدار پہ جمہوریت کی لاش

کیوں رکھ نہ دیں ادھیڑ کے ملت کے تار و پود
ہے خدمتِ عوام سے مقصود یاں معاش!
کچھ اس قدر ہے سخت یہاں سنگِ اقتدار
ٹکرائے گر اصول تو ہو جائے پاش پاش
گم کردگانِ راہ، نمائندگانِ قوم
یہ رہبری کی لاج ہے یا رہبری کی لاش
کیوں ہو نہ بارِ گوش، یہ آواز، یہ خروش
رہ رہ کے اٹھ رہی ہے صدائے جگر خراش
یا کشورِ حسین! کجا منزلِ مراد!
یا مرکزِ یقین! کجا تو ہے شاد باد!

”زیر زبر پیش“

خواجہ منظر حسن منظر کا تیسرا مجموعۂ کلام ”زیر، زبر، پیش“ ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔ اس میں نظمیں، چند تاریخی قطعات اور غزلیں شامل ہیں۔ صفحات ۱۶۰، مصنف کا لکھا ہوا ایک طویل مضمون ”کچھ اپنے بارے میں“ دیباچے کے طور پر شامل ہیں۔

کتاب کے آغاز میں ایک حمد، پانچ نعتیں اور دو منقبتیں ہیں۔ ایک منقبت حضرت ابو بکر صدیقؓ کی اور دوسری حضرت علیؓ کی ہے۔ خواجہ صاحب پختہ اور صحیح عقائد کے حامل مسلمان ہیں۔ ان کی ”حمد“ دیکھیے:

جو بھی دیتا ہے کسی کو وہ خدا دیتا ہے
ورنہ انساں کسی انسان کو کیا دیتا ہے
اس کے دربار میں جو سر کو جھکا دیتا ہے
ایسے بندوں کی وہ توقیر بڑھا دیتا ہے

پل میں وہ شاہ کو محتاج بنا دیتا ہے
اور شہنشاہی سرِ غارِ حرا دیتا ہے
ان نشانات کو مہر و مہ و انجم نہ کہو
اپنے بندوں کو نقوشِ کفِ پا دیتا ہے
اپنی منزل کی طرف کوئی بڑھائے تو قدم
وہ تو قدموں میں ستارے بھی بچھا دیتا ہے
مانگ کر منظرِ عاصی نے یہی دیکھا ہے
مانگنے والوں کو وہ حد سے سوا دیتا ہے

''زیر، زبر، پیش'' آٹھ بندوں پر مشتمل ایک پُر اثر نظم ہے جس کے عنوان کو زیرِ نظر کتاب کا نام قرار دیا گیا ہے، اس نظم کے تین بند دیکھیے:

اے فکرِ رسا، قلبِ صفا، ذہنِ وفا کیش
ہر مصلحت اندیش ہے نا عاقبت اندیش
کیا نفع و ضرر، سود و زیاں، فکرِ کم و بیش
لکھنے کو جو بیٹھے ہو تو پھر کیا ہے پس و پیش

تزویر نے اوڑھا ہے اگر خرقۂ درویش
لکھو کہ نظر آئے ہمیں زیر، زبر، پیش

اقدار کی بکتی ہوئی اجناس پہ لکھو
افراد کی محرومیٔ احساس پہ لکھو
افکارِ زیاں کار کے افلاس پہ لکھو
لکھو تو سبھی صفحۂ قرطاس پہ لکھو

جو کچھ بھی لکھو کم ہو نہ اک سرِ مو بیش
لکھو کہ نظر آئے ہمیں زیر، زبر، پیش

لکھو کہ نہ لکھو گے تو لکھے گی مشیت
اُٹھو کہ نہ اٹھو گے تو اٹھے گی قیامت
رکتی نہیں روکے سے گزرتی ہوئی ساعت
سنبھلو کہ بگڑ جائے نہ اغیار کی نیت

دیکھو کہ کہیں اور بگڑ جائے نہ یہ دیش
لکھو کہ نظر آئے ہمیں زیر، زبر، پیش

اس میں شک نہیں کہ "زیر، زبر، پیش" نظموں اور غزلوں کا ایک خوب صورت اور دل آویز مجموعہ ہے۔ اکثر و بیشتر نظمیں طنزیہ اور اصلاحی انداز کی ہیں۔ کچھ تاریخی نظمیں اور قطعات بھی ہیں جو خواجہ صاحب کا مخصوص فن ہے۔

"تشیدِ تاریخ"

خواجہ منظر کا چوتھا مجموعہ "تشیدِ تاریخ" ہے جو ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۶ء میں چھپا۔ اس مجموعے میں خواجہ صاحب کی کہی ہوئی تاریخی نظمیں اور قطعات ہیں۔ یہ کتاب ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

تاریخ گوئی ایک مشکل فن ہے، جس کے ماہرین بہت کم ہی ملتے ہیں۔ خواجہ صاحب اس فن کے ماہروں میں ہیں اور انھیں تاریخ گوئی میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ لکھتے ہوئے مشفق خواجہ فرماتے ہیں:

"تاریخ گوئی ایک مشکل فن ہے اور ایک عمر کی ریاضت کے بعد ہی تاریخ گو پر اس فن

کے اسرار و رموز کھلتے ہیں۔ موضوع کی مناسبت سے موزوں اور برمحل تاریخ کہنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں اور پورے پورے مصرعوں سے تعمیہ اور تخرجہ کے بغیر تاریخ نکالنا اور بھی مشکل کام ہے۔ اس مشکل کام کو ماضی میں مولانا حامد حسن قادری اور حفیظ ہوشیار پوری نے اور موجودہ دور میں خواجہ منظر حسن منظر نے نہایت آسانی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔"

نمونے کے طور پر خواجہ صاحب کی تاریخی نظم "قائدِ اعظم" کے پانچ اشعار دیکھیے۔ اس کے ہر شعر کے پہلے مصرع سے ان کی پیدائش کا سال اور دوسرے مصرع سے سالِ وفات نکلتا ہے۔

اے چارہ گرِ جنس بہا قائدِ اعظم
——— ۱۸۷۶ء ———
اے دیدہ ورِ شہرِ وفا قائدِ اعظم
——— ۱۹۴۸ء ———

تو موجِ کفِ لطف و عطا قائدِ اعظم
——— ۱۸۷۶ء ———
تو اوجِ مہِ صدق و صفا قائدِ اعظم
——— ۱۹۴۸ء ———

اک نخلِ عمل، دستِ دُعا، نصر من اللہ
——— ۱۸۷۶ء ———
گھر اک جو کیا تو نے عطا قائدِ اعظم
——— ۱۹۴۸ء ———

ہو مملکتِ نو کی فضا مہدِ معطر
——— ۱۸۷۶ء ———
بُستاں کی پڑی ہے جو بِنا قائدِ اعظم
——— ۱۹۴۸ء ———

کل تھی تو کلی سی جو ہے اب پھول شگفتہ
——— ۱۸۷۶ء ———
اس پھول پہ احسان ترا قائدِ اعظم
——— ۱۹۴۸ء ———

خلاصۂ کلام

مختصر یہ کہ خواجہ منظر حسن منظر ایک بلند پایہ، صاحبِ نظر اور صاحبِ دل شاعر ہیں۔ انھیں زبان پر عبور حاصل ہے۔ ان کی حیثیت ایک قادر الکلام شاعر کی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ انھیں

دین کا فہم حاصل ہے۔ ہمارے اکثر ادبا، شعرا اور دانشور سارے جہان کا علم حاصل کر لیتے ہیں، لیکن دین کے علم سے نا آشنا رہتے ہیں۔ رہا دین کا فہم تو یہ خالق کائنات کا خاص عطیہ ہے۔ خواجہ صاحب میں فہمِ دین کے ساتھ اصلاحِ معاشرہ کی لگن اور تڑپ بھی موجود ہے جس کا اظہار ان کے کلام سے ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ دورِ حاضر کی اُردو شاعری میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ وہ ایک مبصر و ناقد بھی ہیں۔ انھوں نے بہت سی کتابوں پر تبصرے کیے ہیں اور تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔

❖❖

اختر پیامی

(شاعر، ناقد، صحافی)

نام سید سعید اختر اور قلمی نام اختر پیامی۔ یکم فروری ۱۹۳۰ء کو مونگیر (بہار) میں پیدا ہوئے۔ پٹنہ اور رانچی میں تعلیم حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان دینے سے پہلے ان کی شادی ہو گئی۔ بڑے ذہین اور ہونہار طالب علم تھے۔ ابھی اسکول ہی میں تھے کہ نظمیں لکھنے لگے اور ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد ۱۹۴۷ء میں کلکتہ آ گئے۔ وہاں ایک ہفتہ وار رسالہ "نئی منزل" کے مدیر مقرر کیے گئے، لیکن ایک سال کے بعد ہی وہ مزید تعلیم کے لیے رانچی چلے گئے۔ معاشیات میں رانچی کالج سے بی۔ اے آنرز کیا اور اسی سال (۱۹۵۱ء) مشرقی پاکستان آ گئے۔

مشرقی پاکستان آنے کے بعد کچھ دنوں ایک اسکول میں معلّم رہے۔ پھر ڈھاکا کے مشہور و معروف انگریزی اخبار "مارننگ نیوز" سے وابستہ ہو گئے۔ سقوطِ ڈھاکا تک وہیں بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر کام کرتے رہے۔ ڈھاکا ریڈیو سے بھی ان کا تعلق رہا۔ وہ کچھ عرصے تک ڈھاکا ریڈیو سے اُردو خبریں بھی پڑھتے رہے۔

اختر پیامی ڈھاکا آنے سے پہلے ہی ایک ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔ قیامِ ڈھاکا کے دوران بھی ان کی شاعری اور ادبی سرگرمیاں جاری رہیں۔ وہ مشاعروں میں شریک ہوتے رہے اور ان کی نظمیں اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتی رہیں۔ اس دوران انھوں نے تنقیدی مضامین، تبصرے اور انشائیے بھی لکھے، وہ انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں لکھتے

رہے۔

سابق مشرقی پاکستان کے اکثر ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے بنگالیوں کی ہر تحریک کا ساتھ دیا۔ لیکن ۱۹۷۱ء کے ہنگاموں کے دوران اور خاص طور پر سقوطِ ڈھاکا کے بعد بنگالی قوم پرستوں اور مکتی باہنی نے انھیں بھی نہ چھوڑا۔ اختر پیامی بھی انھیں ترقی پسندوں میں تھے۔ ان کے بنگالی ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں اور دانشوروں سے وسیع تعلقات تھے۔ لیکن سقوطِ ڈھاکا کے بعد انھیں جن صعوبتوں سے گزرنا پڑا، ان کے بارے میں وہ خود ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

"مشرقی پاکستان کی زندگی میں ادب سے میرا رشتہ قائم رہا۔ لیکن ۱۹۷۲ء کے بعد میں زخم خوردہ دل کے ساتھ کراچی آ گیا۔ اس صبر آزما دور میں مجھ پر اور میرے خاندان پر کیا گزری وہ ایک الم ناک داستان ہے۔ میں اسے بیان کرنا نہیں چاہتا۔ مگر ہوا یہ کہ میری شاعری کے سوتے خشک ہو گئے۔ میں گزشتہ تیس برسوں میں شاید ہی کوئی شعر کہہ سکا۔ میری صحافتی زندگی نے اس پر آخری مہر لگا دی۔"

(سہ ماہی "روشنائی" کراچی۔ شمارہ۔ ۶، گوشۂ اختر پیامی)

کراچی آنے کے بعد اختر پیامی نے کچھ عرصہ "مارننگ نیوز" کراچی میں کام کیا، پھر روزنامہ "ڈان" سے منسلک ہو گئے۔ ریٹائر ہونے کے بعد بھی وہ جز وقتی طور پر اس سے وابستہ ہیں۔ ان کے انگریزی مضامین اور کتابوں پر تبصرے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ ایک اچھے مقرر بھی ہیں۔

اختر پیامی نے کراچی آنے کے بعد شاعری تقریباً ترک کر دی۔ ان کے بھائی پروفیسر جابر حسین نے (جو بہار کے صوبائی وزیر بھی رہ چکے ہیں) ان کے دو شعری مجموعے "تاریخ" اور "کلس" پٹنہ سے شائع کیے۔ "کلس" کا دوسرا ایڈیشن کچھ اضافے کے ساتھ احمد زین الدین نے "آئینہ خانے" کے نام سے ۲۰۰۲ء میں کراچی سے شائع کیا۔

نمونۂ کلام

”عہدِ وفا“ (نظم)

ہر گزرگاہ پہ جلووں سے نکھرتی ہوئی رات
مجھ سے کہتی ہے شبِ ہجر کا سودا کر لو
وقت کا سیلِ رواں کس کے لیے ٹھہرا ہے
تم بھی ہر موج کو وابستۂ دریا کر لو
کل بھی فرصتِ گفتار رہے یا نہ رہے
آج، بس آج غنیمت ہے مداوا کر لو

روشنی خوب سہی، روشنیٔ طبع نہ ہو
تیرگی مطلعِ انوار کا پہلو ہی تو ہے
رُخِ زیبا نہ سہی، خالِ رُخِ یار سہی
اک حسیں شام ہے، پھیلا ہوا گیسو ہی تو ہے
صبح کی لاش پہ کھل اٹھے گا پھولوں کی طرح
رات کی آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو ہی تو ہے

مسکراؤ کہ ابھی زخم ہرے ہیں شاید
اب کوئی اور سرِ بام نہیں آئے گا
دل کو سمجھاؤ نئی شمع جلائی جائے
اس اندھیرے میں کوئی کام نہیں آئے گا

لو، زباں کاٹ کے رکھ دی کہ شکایت نہ رہے
اب تو بھولے سے بھی وہ نام نہیں آئے گا

اس بھری بزم میں پھر عہدِ وفا کرتا ہوں
شب گزیدوں سے کہو وقتِ سحر سو جائیں
زندگی بیت چکی اور جو باقی ہے ابھی
استعاروں میں بسر کرتے ہوئے کھو جائیں

ایک نظم "رہبروں کے نام" کے دو بند:

کب تک سنوں میں آپ کی نمناک داستاں
کیوں ڈھونڈتے ہیں برق کی آغوش میں اماں
اپنوں کے آگے خیر سے کھلتی نہیں زباں!
اور آستانِ غیر پہ ہے سجدہ ریزیاں
تاریخِ انقلاب بھی شرما رہی ہے آج

دنیا بدل رہی ہے نگاہیں اٹھائیے
اس ارتقائی دور سے آنکھیں ملائیے
آپس کی نفرتوں کو ابھی بھول جائیے
مل جل کے صبحِ نو کی سیاہی مٹائیے
ہر سانس اب جھنجھوڑ کے چونکا رہی ہے آج

چند اشعار:

تنہائیوں کے کوہ گراں سے اتر کے ہم
آبادیوں میں شعر سنانے کو آئے ہیں

اعلان کر دو کوچۂ رخسارِ یار میں
ہم خوشبوؤں کے ناز اٹھانے کو آئے ہیں

ارزاں کرے نہ کوئی متاعِ سخن کہ ہم
لفظوں کا اعتبار بڑھانے کو آئے ہیں

شہرِ وفا میں کوئی خریدار بھی تو ہو
ہم کس کو دل کے داغ دکھانے کو آئے ہیں

اختر پیامی ایک خوش اخلاق، کم گو، کم آمیز اور فرض شناس انسان ہیں۔ انھوں نے ایک خوش گوار اور کامیاب ازدواجی زندگی گزاری۔ ان کی اہلیہ (رضیہ بانو) کا چند سال قبل انتقال ہو گیا۔ چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں (ایک بیٹی کی وفات ہو گئی)۔ سب بچے شادی شدہ اور خوش حال ہیں۔ فی الحال اختر پیامی صاحب مکمل گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

اختر لکھنوی

(المیۂ سقوطِ ڈھاکا کا نوحہ خواں)

ایک عظیم المیہ

سقوطِ ڈھاکا تاریخِ پاکستان کا خصوصاً اور تاریخِ ملت کا عموماً ایک المیۂ عظیم تھا۔ لیکن افسوس کہ اس المیہ کی سنگینی کا ادراک واحساس نہ اربابِ حکومت کو ہوا نہ عوام کی اکثریت کو۔ پروفیسر نظیر صدیقی مرحوم "دیدۂ تر" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"اس المیے کے کئی پہلو ہیں۔ یہ مسلمانوں کی تاریخ کے عظیم ترین المیوں میں سے ہے۔ یہ پاکستان کی تاریخ کا عظیم ترین المیہ ہے۔ یہ انسانی کردار یا انسانی نفسیات کی تاریخ کے بدترین المیوں میں سے ہے لیکن اپنی تمام وسعت وشدت اور عظمت کے باوجود یہ المیہ ہمارے شعروادب کا موضوع اس حد تک بھی نہیں بن سکا ہے جس حد تک کہ ایک زمانے میں قحطِ بنگال بن گیا تھا۔"

("دیدۂ تر" ص:۱۲)

اس المیہ کے دو پہلو

المیۂ سقوطِ ڈھاکا کے دو پہلو ہیں۔ پہلا یہ کہ پاکستان کے دو ٹکڑے ہو گئے اور مشرقی پاکستان "بنگلہ دیش" بن گیا۔ اس سلسلے میں پاکستانی فوج کو بھارتی فوج کے آگے ہتھیار ڈالنے کی

ذلت بھی اٹھانی پڑی اور قیدی بھی بننا پڑا۔

دوسرا پہلو یہ کہ بنگلہ دیش بننے سے پہلے اور اس کے بعد بنگالیوں نے اُردو بولنے والے مہاجروں (جنھیں یہ لوگ حقارت سے 'بہاری' کہتے تھے) کا قتلِ عام کیا، ان کی عورتوں کو رسوا کیا اور ان کے گھروں اور جائیداد پر قبضہ کر کے انھیں ریڈ کراس کے قائم کردہ کیمپوں میں محصور کر دیا۔ یہ ایک ایسا عظیم المیہ ہے جس کی مثال مسلمانوں کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔

اختر لکھنوی اور سقوطِ ڈھاکا

اختر لکھنوی مرحوم کا تعلق ریڈیو پاکستان، ڈھاکا سے تھا۔ انھوں نے اپنی کتاب "دیدۂ تر" میں "کچھ اپنے بارے میں" کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت دردناک اور لرزا دینے والا ہے۔ "سقوطِ ڈھاکا" سے پہلے اور اس کے بعد کے حالات انھیں کی زبان سے سنیے۔ یہ کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں بیٹھ کر محض سنی سنائی اور قیاسی باتوں کی بنیاد بنا کر تاریخ نگاری کی بات نہیں، جس میں ہمارے دانشور اور اخباری کالم نگار ماہر ہیں۔ چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں:

ا۔ "یکم مارچ ۱۹۷۱ء کو جب دوپہر بارہ بجے کی خبروں کے ذریعہ ڈھاکے میں ہونے والا قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کیا گیا تو شہر میں احتجاجی مظاہرے شروع ہو گئے جنھوں نے سِول نافرمانی کی شکل اختیار کر لی۔ ریڈیو پاکستان سے پاکستان نکال دیا گیا۔ نشریات بنگلہ زبان میں ہونے لگیں اور اس کا نام ڈھاکا بتیار کیندرو (ڈھاکا ریڈیو مرکز) ہو گیا۔ یہ سلسلہ ۲۵ر مارچ ۱۹۷۱ء تک جاری رہا۔ اسی تاریخ کی رات ملٹری ایکشن ہوا۔ ساری رات فوج اپنا کام کرتی رہی۔ تمام رابطے منقطع تھے۔ بجلی بند اور ٹیلی فون خاموش۔ میری رہائش محمد پور میں تھی (محمد پور چھوٹے چھوٹے ہزاروں کوارٹروں پر مشتمل کئی لاکھ آبادی کا ایک بڑا علاقہ تھا، جسے جنرل ایوب خاں کے زمانے میں مہاجروں کے لیے بنایا گیا تھا)۔ اس بستی کی اکثریت محبِ وطن پاکستانیوں کی تھی۔ اقلیت بستی چھوڑ چکی تھی۔ قانہ

بریگیڈ کی گاڑیوں کے ذریعہ پٹرول چھڑک کر بستی کو جلا دینے کے منصوبے کی تکمیل پاکستان کے مخالفوں کو اسی رات کرنی تھی مگر ملٹری ایکشن کی وجہ سے منصوبے پر عمل نہ ہو سکا۔ بستی کے لوگ ساری رات جاگتے رہے تھے۔ علی الصبح بریگیڈیر صدیق سالک (اس وقت میجر تھے) ایک بریگیڈیر، ایک میجر اور ریڈیو کے اسسٹنٹ ریجنل ڈائرکٹر سمیع قریشی ۲۰، ۲۵ فوجی جوانوں کے ساتھ میرا گھر پوچھتے ہوئے آئے۔ میں گھر سے نکلا، ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور کہا ریڈیو چلو۔ میں نے کہا نہیں، پہلے ٹرانسمیٹر چلیے، وہاں کوئی نہ ہوا تو ریڈیو سیٹ خاموش رہیں گے۔ چنانچہ اس قافلے کو لے کر میرپور (یہ محمد پور سے بھی بڑی بستی تھی جو کئی میل تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بھی ایوب خاں کے زمانے میں مہاجروں کے لیے بسائی گئی تھی) کے قریب ٹرانسمیٹر گیا۔ میرے گھر سے ٹرانسمیٹر کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ مگر وہاں تک پہنچنے میں ایک گھنٹہ لگا۔ راستے میں جگہ جگہ جڑ سے کٹے ہوئے موٹے موٹے درخت پڑے تھے، جن کو فوجی جوانوں نے آریوں سے کاٹ کر راستہ بنایا۔ ٹرانسمیٹر کے قریب پہنچے تو ایک نالے کے پل پر سرکاری بسوں کو کھڑا کر کے راستہ بند کر دیا گیا تھا۔ فوجی جوانوں نے بسوں کو ہٹایا۔ ہم لوگ ٹرانسمیٹر میں داخل ہوئے۔ وہاں رات کا عملہ موجود تھا۔ اسے کچھ ہدایات دینے کے بعد قافلہ مولانا عبدالرحمٰن بیخود (عبدالرحمٰن بیخود ڈھاکا کے مشہور و معروف عالم و خطیب تھے۔ وہ اُردو بولنے والے مہاجر اور اُردو کے اچھے شاعر و ادیب تھے۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد مکتی باہنی کے غنڈوں نے انھیں بہت تکلیف پہنچائی) کے گھر پہنچا۔ ان کو ساتھ لے کر انجینئرنگ اسٹاف کے گھر پر دستک دی۔ ہر جگہ جواب ملا مطلوب گھر پر نہیں۔ بڑی مشکلوں سے ایک ٹیکنیکل آپریٹر ہاتھ لگا۔ ریڈیو اسٹیشن میں روداد خاں پہلے سے موجود تھے۔ وہ اس وقت اطلاعات و نشریات کے سکریٹری تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا سب کچھ تم کو کرنا ہے، کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اس طرح مجھے یہ اعزاز

حاصل ہوا کہ ۲۳ روز بعد ایک عالم نے ٹوٹے ہوئے رابطوں اور اپنے بند گھروں میں میری آواز سے یہ جانا کہ اب ڈھاکا بیتار کیندرو، ریڈیو پاکستان ڈھاکا ہے۔"

("دیدۂ تر"۔ص:۲۹، ۳۰)

۲۔"سقوطِ ڈھاکا عملاً ۱۳ ردسمبر کو ہو چکا تھا۔ ۲ اور ۳ دسمبر کی شب میں ڈھاکا پر بمباری شروع ہو گئی تھی۔ میں ۳ ردسمبر کی صبح گھر سے یہ کہہ کر ریڈیو گیا تھا کہ میرا انتظار نہ کیا جائے۔ ریڈیو پر میری آواز جب نہ ملے تو سمجھا جائے میں دنیا میں نہیں۔ بمباری ہوتی رہی، اینٹی ایئر کرافٹ گنیں چلتی رہیں اور پہلے دن دشمن کے جہاز گرتے رہے۔ پہلی رات لوگوں نے سائرن پر خندقوں میں پناہ لی۔ پھر رات کی نشریات بند ہونے کے بعد سب اسٹوڈیو میں سوتے اور بمباری کا سلسلہ جاری رہتا۔ ۳ ردسمبر سے ۱۰ ردسمبر تک غیر محسوس طریقے سے غیر اُردو داں ملازمین ریڈیو سے غائب ہو گئے۔ صرف اُردو بولنے والا عملہ رہ گیا جس میں حفیظ اللہ حیرتؔ، پرویزؔ فیض آبادی مرحوم، نوشیرواں، رفیع احمد رفیعؔ اور محمد طفیل وغیرہ تھے۔ ۱۳ ردسمبر کو میرے اور ٹیکنیکل آپریٹر رفیع احمد کے سوا کوئی نہ تھا۔ شام کے وقت رفیع نے مجھے بتایا کہ جو فوجی جوان اور پولیس کے آدمی یہاں چھولداریاں لگائے ہوئے تھے، وہ غائب ہیں۔ چھولداریاں بھی نہیں ہیں۔ اس وقت شام کے سائے ڈھل چکے تھے۔ دل تھا کہ بیٹھا جا رہا تھا۔ میں نے انٹرنیشنل کمیٹی آف ریڈ کراس کو فون کیا۔ وہاں سے بتایا گیا،'ڈھاکا کا فال ہو چکا ہے۔ اب آپ پاکستان کے شہری نہیں رہے۔' اس انکشاف نے بدن کا خون نچوڑ لیا۔ ہم دونوں نے براڈ کاسٹنگ ہاؤس چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ اسٹوڈیوز کی دیواروں پر ہاتھ پھیرے، اندھیرے میں اس کی خوب صورت عمارت اور اس پر لہراتے ہوئے قومی پرچم کو حسرت سے دیکھا، اپنی وفاؤں کا آخری نذرانہ آنسوؤں کی صورت پیش کر کے الوداع کہا اور دبیز اندھیروں میں مشین

گنوں سے نکلنے والی گولیوں کی زد سے بچتے اور چھپتے اپنے اپنے گھروں کی طرف نکل گئے۔ پھر جو نہ ہونا تھا، وہ ہوا اور جو دیکھا نہیں جا سکتا تھا، دکھایا گیا۔"

("دیدۂ تر" ص: ۳۰، ۳۱)

۳۔ "دوسری ہجرت کی تاریخ ۶/ مارچ ۱۹۷۴ء ہے۔ انٹرنیشنل کمیٹی آف ریڈ کراس کے روسی ہوائی جہاز سے کراچی پہنچا.......... ۱۳/ دسمبر ۱۹۷۱ء اور ۶/ مارچ ۱۹۷۴ء کے درمیان ۸۱۴ دنوں میں اس سرزمین پر جہاں زندگی کے بہترین دن گزرے، نفس نفس، قدم قدم ایسے مناظر بھی تھے جن کی دید سے ذہن منجمد اور آنکھیں پتھرا گئیں۔

"وہ وقت بہت عجیب، ٹھہرا ہوا اور لاتعداد رنگ رکھتا تھا۔ مگر ایک رنگ مشترک تھا، بے بسی کا۔ ہر گھر میں زندگی اور پیاروں کا ماتم تھا۔ لٹے پٹے برہنہ پا قافلوں کا رُخ محمد پور اور میر پور کی بستیوں کی جانب تھا۔ پہلے اسکول کیمپ بنے، پھر میدانوں کی باری آئی۔ کچھ ساور (میر پور سے آگے ایک جگہ کا نام) کے مقام پر، ندی کنارے، گولیوں کا نشانہ بنے اور کچھ جیلوں میں ٹھونسے گئے (ڈھاکا سینٹرل جیل جس میں دو ڈھائی ہزار قیدیوں کی گنجائش تھی، دس بارہ ہزار بہاریوں کو جن کا تعلق محمد پور اور میر پور سے تھا، بند کر دیا گیا۔ و۔ر)، میں بھی جیل میں رہا، کیمپوں میں رہا۔ کیمپوں کا انچارج رہا۔ اس وقت محمد پور ڈھاکے میں جو کیمپ 'جنیوا کیمپ' کے نام سے جانا جاتا ہے اس کا پہلا انچارج میں تھا۔ اس وقت اس میں ۴۵ ہزار افراد تھے۔ بے شمار لوگوں کی طرح میری آنکھوں پر بھی پٹی باندھی گئی، دریا کنارے بنی ہوئی قتل گاہ لے جایا گیا۔ جب پہنچا، وہاں چار آدمی دیوار سے لگے بیٹھے تھے۔ مجھے بھی ان میں شامل کر دیا گیا۔ ایک شخص کے ہاتھ پاؤں بندھے تھے۔ سینے پر ایک نوعمر لڑکا چڑھا ہوا تھا۔ پاکستان مردہ باد کہو چھوڑ دیے جاؤ گے۔ مگر جواب میں بہ تکرار بہ آواز بلند 'پاکستان زندہ باد' کہا جا رہا تھا۔ پھر آواز گھٹ گئی اور سر تن

سے جدا کر کے پانی میں پھینک دیا گیا۔ اس منظر نامے سے میں کیسے باہر نکلا اس کے بیان کے لیے ایک عمر چاہیے۔"

("دیدۂ تر"، ص: ۳۱، ۳۲)

دیدۂ تر

"دیدۂ تر" کی غزلوں کے بارے میں اختر لکھنوی مرحوم لکھتے ہیں:

"۱۹۷۵ء میں جب سکتہ ٹوٹا تو اس شاعری کا ورود ہوا جس سے یہ مجموعہ عبارت ہے۔ اس میں وہی شاعری ہے جو اس المیے سے وجود میں آئی جس نے لاکھوں افراد کا شیرازۂ ہستی بکھیر دیا، جس سے لاتعداد گھر اُجڑے۔ مکینوں کے ساتھ مکان جلے، معصوم بچے ماؤں کی گود سے چھین کر نیزوں پر چڑھائے گئے۔ گلیوں، کوچوں اور بازاروں میں قتلِ عام ہوا۔"

("دیدۂ تر"، ص: ۳۲)

اختر لکھنوی وہ واحد شاعر تھے جو اس المیۂ عظیم پر جب تک زندہ رہے، آنسو بہاتے رہے۔ وہ بڑے حساس انسان تھے۔ وہ مرتے دم تک ان دردناک واقعات کو بھول نہ سکے۔ وہ غزل کے شاعر تھے۔ غزلوں میں اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتے رہے۔ ان کی ان غزلوں کا پہلا مجموعہ "دیدۂ تر" ۱۹۸۶ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ "شاخِ نہالِ غم" ان کی وفات (۱۹۹۵ء) کے دوسرے سال ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔

افسر ماہ پوری (وفات: ۱۹۹۵ء) نے "دیدۂ تر" کے دیباچہ "دیدہ و شنیدہ" میں بالکل درست کہا کہ:

"اختر لکھنوی کا یہ امتیاز قابلِ لحاظ اور لائقِ تحسین ہے کہ انھوں نے اپنی تمام شعری صلاحیتوں اور فن کارانہ قابلیتوں کو اسی المیے کی عکاسی و نقاشی پر صرف کر دیا ہے اور جس تسلسل اور تنوع کے ساتھ وہ اس المیہ کا ماتم کر رہے ہیں وہ اپنی نوعیت کا ایک شعری

کارنامہ ہے۔ چنانچہ انھیں المیۂ مشرقی پاکستان کا نوحہ خواں، ماتم گسار اور عزادار کہا جائے تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ اختر کی موجودہ پوری شاعری اس المیے کے زخموں کی جاں گسل ٹیسوں اور اس کی روح فرسائیوں اور اس کی دل سوزیوں کی دلدوز اور خوں چکاں داستاں ہے، جو بغیر آنسو بہائے نہ کہی جا سکتی ہے اور نہ سنی جا سکتی ہے۔ اس قومی تاریخی المیے کے الم ناک پس منظر میں اختر کی گلوگیر آواز آج بھی گونجتی ہے اور دیدۂ تر کی گہرائیوں میں دھیمے دھیمے اُترتی محسوس ہوتی ہے۔"

("دیدۂ تر۔" ص:۱۸)

"دیدۂ تر" کی ابتدا ان دو دعائیہ اشعار سے ہوتی ہے:

عیاں ہے آپ پہ ہم بے گھروں کا افسانہ
قبول کیجیے دو ہجرتوں کا نذرانہ
بس اک نگاہ کے طالب ہیں آبلہ پا ہم
عذابِ در بدری بڑھ رہا ہے روزانہ

منتخب اشعار

اب تو یوں بسر لمحے روز و شب کے ہوتے ہیں
تھوڑی دیر ہنستے ہیں، تھوڑی دیر روتے ہیں
گردِ یادِ رفتہ کی اور جمتی جاتی ہے
دامنِ خیال اپنا جیسے جیسے دھوتے ہیں
ایسے با کمالوں کے درمیاں رہے ہیں ہم
جو حدودِ ساحل میں کشتیاں ڈبوتے ہیں

جب بھی شام آتی ہے، بیٹھ کر کہیں ہم لوگ
ایک دوسرے کا منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں
اب ہماری نسلیں بھی فیض پائیں گی اختر
اپنے پاس اشکوں کے لازوال سوتے ہیں

☆☆☆☆☆

کتنے محبوب گھروں سے گئے کس کو معلوم
واپس آئے ہیں تو آئے ہیں خبر کی صورت

گنیں گے سینوں کے داغ کب تک، چنیں گے تلووں کے خار کب تک
بہ چشمِ نم ہم سیا کریں گے یہ دامنِ تار تار کب تک
زمیں کی تہہ میں اترنے والے وہ بے کفن گل وہ ماہ و انجم
قدم قدم پر نفس نفس پر کریں گے ان کا شمار کب تک
جو قتل ہونے سے بچ گئے ہیں، جو اپنے پیاروں کو رو رہے ہیں
تلاشِ زنجیرِ عدل میں وہ رہیں گے پروردگار کب تک

پلک جھپک نہ سکی، کیا خدا کی شان ہوئی
زباں کے نام پہ مخلوق بے زبان ہوئی
عجیب نشے میں وہ شہر مسجدوں کا تھا
نماز پہلے ہوئی بعد میں اذان ہوئی
مجھے خراج دیا قہقہوں کی محفل نے
دو نیم جب مرے ہاتھوں مری کمان ہوئی
وہاں تھا سبزہ و سائے کا التفات نصیب
یہاں سروں پہ کڑی دھوپ مہربان ہوئی

کبھی بہار کے ہم راز داں تھے اے اختر
خزاں ہمارے کوائف کی ترجمان ہوئی

وہ پرچم، وہ سر کے طرّے اور وہ سفینے اپنے تھے
جن کو دیکھ کے شعلے بھی روئے تھے جلتے وقت بہت
دو نسلوں کی کشتی تھی وہ، پچھلے دنوں جو ڈوب گئی
بھیگے جسموں والو! لگے گا تم کو سنبھلتے وقت بہت

جو قتل ہوئے ان سے زیادہ ہیں کہیں وہ
غفلت کی صلیبوں پہ جو مصلوب ہوئے ہیں
تقدیر میں جس کی نہیں تحریر کی صورت
ہم ایسی ہی تاریخ سے منسوب ہوئے ہیں
مائل بہ کرم جب بھی ہوئی خانہ بدوشی
ہم لوگ ہی اختر اسے مطلوب ہوئے ہیں

اس وقت میں تھا ٹھہراؤ بہت، جب شوق و جنوں ناکام ہوا
جب شہرِ وفا میں، اہلِ وفا پر، عہدِ وفا دشنام ہوا
ہم کیا جانیں اسباب تھے کیا، ہم نے تو بس یہ دیکھا تھا
داناؤں نے پہلے سر جوڑے، پھر گھر گھر قتلِ عام ہوا

جوئے خوں، آنکھوں سے پہلے یوں کبھی جاری نہ تھی
زندگی کے نام پر گھر گھر عزاداری نہ تھی

یوں وفا کے نام پر پرچم کھلا رہنے دیا
ہم نے اپنے گھر کو بھی جلتا ہوا رہنے دیا

بخشی ہے ہمیں دوسری ہجرت نے یہ وسعت
دل صورتِ دریا تھا سمندر نہ ہوا تھا
اک پاس تھا وعدے کا جو ٹھہرے نہ کہیں ہم
ایسا نہ تھا وا ہم پہ کوئی در نہ ہوا تھا

☆☆☆☆☆

سرزمین آب پر رکھے گئے بے آب ہیں
ہم نے دیکھی ہیں مہینوں کربلا کی صورتیں
(میرپور اور محمد پور میں بجلی اور پانی مہینوں بند رہے)

وہ در و دیوار وہ چھینٹے لہو کے جا بجا
تھیں خزاں کے دور میں بھی، عہدِ گل کی صورتیں
کچھ تھیں زنداں کے لیے، کچھ قتل گاہوں کے لیے
سر کی جنبش میں نہاں تھیں، کیسی کیسی صورتیں
پوچھنے والے مری وحشت زدہ آنکھوں سے پوچھ
موت کے دیکھے ہیں کتنے روپ، کتنی صورتیں

یہ معجزہ نہیں ہے تو کیا اس کا نام ہے
دو ہجرتوں کے بعد بھی تابِ کلام ہے

ہم خانہ بدوشوں سے پوچھے نہ پتا کوئی
اک شہر میں دن گزرا، اک شہر میں رات آئی

☆☆☆☆☆

جو چہرہ بدلنے میں بہت طاق رہے ہیں
اب ایسے ہی لوگوں سے مری ہم سفری ہے

جو ہوا اس میں بہت دخل تھا اپنوں کا بھی
ہم بھی کیا کرتے ہمیں بے دست و پا ہونا ہی تھا

اس میں شک نہیں کہ اختر لکھنوی کی یہ شاعری الم ناک بھی ہے اور عبرت خیز بھی۔ یہ تاریخِ پاکستان کے المیۂ عظیم کی ترجمان وعکاس ہے۔ بقول پروفیسر نظیر صدیقی:

"ان غزلوں میں اس المیہ کے واقعاتی، کیفیاتی اور تجزیاتی تینوں پہلو آگئے ہیں اور اس انداز سے آئے ہیں کہ اختر کی شاعری ہنگامی موضوعات کی ہنگامی شاعری معلوم نہیں ہوتی۔ اس شاعری میں جو تاثیر وتاثر ہے وہ زود اثر بھی ہے اور دیرپا بھی۔ اختر نے ان غزلوں میں سقوط سے سکوت تک کی داستان مرتب اور محفوظ کردی ہے۔"

("دیدۂ تر" ص:۱۴)

مختصر حالاتِ زندگی

محمود الحسن نام اور اختر تخلص تھا۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ مکتب میں تعلیم حاصل کی۔ ان کے والد حافظِ قرآن تھے۔ غالباً اختر لکھنوی نے بھی قرآن پاک حفظ کیا۔ ۱۹۵۰ء میں ڈھاکا آئے۔ شعرو شاعری کا آغاز پہلے ہی ہو چکا تھا۔

اختر لکھنوی نے ڈھاکا آنے کے بعد کچھ عرصے تک انجمن ترقی اُردو مشرقی پاکستان کے آفس سکریٹری رہے۔ اس کے بعد صحافت سے منسلک ہو گئے اور ڈھاکا کے مختلف اخباروں میں کام کرتے رہے۔ آخر میں ریڈیو پاکستان ڈھاکا سے وابستہ ہو گئے۔ ٹیلی ویژن اور فلم سے بھی ان کا تعلق رہا۔ ٹی وی پر وہ خبریں پڑھتے تھے اور چند فلموں کے گانے اور مکالمے لکھے۔ اختر صاحب مشرقی پاکستان کے پہلے اُردو شاعر تھے جن سے پاکستان گراموفون کمپنی نے معاہدہ کیا تھا۔

اختر لکھنوی ایک منفرد غزل گو تھے۔ اپنے دردانگیز اور دل کش ترنم کی وجہ سے مشاعروں پر چھا جاتے تھے۔ وہ مشاعروں اور ادبی محفلوں میں برابر شریک ہوتے رہے۔ ان کا کلام بھی اخباروں

اور رسالوں میں شائع ہوتا رہا۔ ایک ادبی رسالہ "فن کار" بھی جاری کیا جس کے چھ شمارے نکالا۔

سقوطِ ڈھاکا کے بعد اختر لکھنوی مع اہل وعیال کراچی آ گئے۔ یہاں بھی ریڈیو پاکستان سے منسلک رہے۔ وفات سے ایک سال پہلے (۱۹۹۴ء) ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۹۵ء میں اورنگی میں وفات پائی۔ اللہ مغفرت فرمائے!

اختر مرحوم کے چار مجموعے "دیدۂ تر" (غزلوں کا مجموعہ)، "حضورؐ" (نعتوں کا مجموعہ)، "سرکارؐ" (نعتوں کا مجموعہ) اور "شاخِ نہالِ غم" (غزلوں کا مجموعہ) کراچی سے شائع ہوئے۔ آخری مجموعہ ان کی وفات کے ایک سال بعد شائع ہوا۔

مرحوم ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ انھوں نے دو سو فیچر اور بہت سے مضامین لکھے۔ چند کتابوں پر مقدمے بھی لکھے۔

اختر لکھنوی بڑے ہمدرد، ملنسار اور خلیق انسان تھے۔ کئی بار عمرے کی سعادت بھی حاصل کی۔ آخر میں نماز پنجگانہ کے بھی پابند ہو گئے تھے۔ (بڑے خشوع وخضوع سے نعتیں لکھا کرتے تھے)۔

مرحوم اپنا سالِ پیدائش ۱۹۳۲ء یا ۱۹۳۵ء لکھا کرتے تھے۔ غالباً یہ وہ سالِ پیدائش تھا جو ان کی ملازمت کے کاغذات میں درج تھا۔ ان کی پیدائش اس سے کئی سال پہلے ہوئی ہوگی۔
("محفل جو اجڑ گئی)

مرحوم نے غالباً تین بیٹے اور تین بیٹیاں یادگار چھوڑیں۔

❖❖

پروفیسر محمد عثمان رمزؔ

(شاعر، دانشور، نقاد)

نام: محمد عثمان

تخلص: رمزؔ

والد کا نام: محمد سلطان انصاری مرحوم

تاریخ پیدائش: ۲۹ر جولائی ۱۹۲۹ء

مقام پیدائش: الٰہ آباد (یو۔ پی، انڈیا)

تعلیم: ایم۔ اے (فلسفہ)، ڈھاکا یونیورسٹی

شادی: ۱۹۳۹ء

رفیقۂ حیات: بیگم فاطمہ عثمان

شاعری کی ابتدا: ۱۹۳۹ء

شاعری میں استفادہ: حضرت نوحؔ ناروی اور تابشؔ دہلوی

پہلی ہجرت: ۱۹۵۱ء مشرقی پاکستان۔ قیام ڈھاکا، کشتیا، چاٹگام وغیرہ

پیشہ: درس و تدریس

دوسری ہجرت: ۱۹۷۱ء، سقوطِ ڈھاکا سے چند ماہ قبل۔ کراچی

اولاد: بیٹے: طلحہ عدنان، طلحہ عرفان، طلحہ سلمان، طلحہ نعمان، طلحہ عمران

بیٹیاں: فیروزہ خانم، رخسانہ خانم، شہناز خانم
نظریاتی اور سیاسی وابستگی: جماعتِ اسلامی، پاکستان (دورِ طالب علمی سے وفات تک)
وفات: ۸ر مئی ۱۹۹۸ء۔ کراچی

''زخمِ تنہائی''

پروفیسر محمد عثمان رمزؔ ایک بلند پایہ شاعر، ادیب اور ناقد تھے۔ وہ زندگی بھر شعر کہتے اور ادبی، فلسفیانہ اور نظریاتی مضامین لکھتے رہے۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ تحریکِ اسلامی سے نظریاتی اور سیاسی وابستگی کے باوجود انھیں شعر و ادب کا گہرا شعور حاصل تھا۔ ان کی غزلیں بڑی منفرد اور دل آویز ہیں۔ سادگی اور پُرکاری کے علاوہ ان کے کلام میں جدت طرازی اور علامت پسندی بھی نمایاں ہے۔

۱۹۴۹ء سے ۱۹۷۱ء تک رمزؔ صاحب نے جو کچھ کہا تھا وہ سقوطِ ڈھاکا کی نذر ہو گیا۔ کراچی آنے کے بعد ۱۹۷۲ء سے ۱۹۹۰ء تک لکھی ہوئی غزلیں جس بیاض میں تھیں، وہ بیاض کہیں گم ہو گئی۔ لہٰذا ان کے مجموعہ ''زخمِ تنہائی'' میں صرف ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۷ء تک کا کلام ہے۔

پروفیسر عثمان رمزؔ نے اپنی وفات سے چند ماہ قبل اپنی غزلوں کا مجموعہ ۱۹۹۷ء میں کراچی سے شائع کیا۔ یہ مجموعہ ۱۲۷ غزلوں اور ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع میں ایک حمد اور ایک نعت ہے۔

نمونۂ کلام

ذیل میں چند غزلیں درج کی جاتی ہیں:

بشر کی خود آرائیاں اللہ اللہ
سرِ آب پرچھائیں اللہ اللہ

امیدوں کی سولی پہ خوابوں کے پیکر
لہو رنگ تنہائیاں اللہ اللہ
اُجالوں کے سر پر اجالوں کے آنچل
چراغوں کی انگڑائیاں اللہ اللہ
مرے بال و پر کے ہیں مرہونِ منت
خلاؤں کی پہنائیاں اللہ اللہ
کسی کو ڈبوئیں، کسی کو ابھاریں
محبت کی گہرائیاں اللہ اللہ
انا کی چٹانیں شکستہ شکستہ
جنوں کی توانائیاں اللہ اللہ
عیاں ہو گئیں رہرَو کی تشنگی سے
سرابوں کی سچائیاں اللہ اللہ

دل شگفتے کا نشاں رکھتے ہیں
قریۂ جاں میں دھواں رکھتے ہیں
غم کو وابستۂ جاں رکھتے ہیں
زندگی زیرِ اماں رکھتے ہیں
جن کے لہجے سے برستی ہے آگ
کیا وہ سورج کی زباں رکھتے ہیں
ان کی تقدیر میں ہے خود سوزی
دل میں جو وہم و گماں رکھتے ہیں

مذہبِ عشق کے پیرو بھی اب
ترکشِ تیر و کماں رکھتے ہیں
خونِ حسرت سے جو لکھتے ہیں غزل
شعر میں زورِ بیاں رکھتے ہیں
رہبر زخموں کی بدولت دل میں
موسمِ گُل کا سماں رکھتے ہیں

حُسنِ معراجِ تمنا دیکھو
چاند دیکھو، کوئی چہرہ دیکھو
تم امیدوں کے تسلسل کے لیے
خواب دیکھو تو ادھورا دیکھو
کشتیاں اپنی جلا کر اُترو
جب اُمڈتا ہوا دریا دیکھو
شرک سے شکل بگڑ جاتی ہے
آئینہ دیکھو تو تنہا دیکھو
پہلے پردے کی حقیقت سمجھو
پھر پسِ پردہ تماشا دیکھو
زخم بھرنے کی دعائیں مانگو
جب کسی پھول کو ہنستا دیکھو
بوسۂ چشمِ غزالاں لے کر
رہبر تم پاؤں کا چھالا دیکھو

مدعاؤں کا مدعا مانگوں
درد بڑھ جائے تو دوا مانگوں
اپنے اشکوں کی واپسی کے سوا
چاند تاروں سے اور کیا مانگوں
تھک کے مر جاؤں تیرے رستے میں
تجھ سے میں اتنا فاصلہ مانگوں
دیدنی ہوگی اس کی حیرانی
آئینہ کی اگر ادا مانگوں
عرش میری پہنچ سے دور سہی
پھر بھی کیوں آہِ نارسا مانگوں
دور ہے یہ انا پرستوں کا
کیا خودی کے عوض انا مانگوں
کیوں نہ اللہ سے جنابِ رمزؔ
اپنی ہستی کا میں پتا مانگوں

''زخمِ تنہائی'' کی تمام غزلیں چھوٹی بحروں میں ہیں۔ تابشؔ دہلوی کے دو صفحوں کا ایک مضمون اور شاعر کے دو مضامین ''اظہاریہ'' اور ''میرا تصورِ ادب'' بھی کتاب کے دیباچہ اور مقدمہ کے طور پر شامل ہیں۔ رمزؔ صاحب نے ''میرا تصورِ ادب'' میں زندگی اور ادب سے متعلق اپنے نظریات کا بڑی وضاحت سے اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں ادب میں جس نظریہ کا قائل ہوں وہ یہ ہے، ایک خدا۔ ایک انسان۔ ایک سماج............ادب میں نظریہ کا قائل ہوتے ہوئے بھی میں ادب کو نظریہ کا میگافون نہیں سمجھتا لیکن میں فی نفسہٖ نظریہ کی تبلیغ و ترویج کا منکر بھی نہیں۔ میرا موقف یہ ہے کہ شعر و

ادب کے ذریعہ دنیا میں کبھی کوئی انقلاب برپا نہیں ہوا۔ اور نہ ہی آئندہ برپا ہو سکتا ہے.......... میں ادب کو زندگی، معاشرہ اور نظریۂ حیات کا ترجمان سمجھتا ہوں اور ان میں باہم دگر اشتراک، توازن اور تعدیل کا قائل ہوں۔"

"مسلم بنگالہ کا ماضی، حال اور مستقبل"

پروفیسر محمد عثمان رمزؔ کا ایک اہم علمی کارنامہ ان کی کتاب "مسلم بنگالہ کا ماضی، حال اور مستقبل" ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے چھٹی صدی قبل مسیح سے زمانہ حال تک مشرقی بنگال کی تاریخ و ثقافت اور مذہبی و معاشی حالات بیان کیے ہیں۔ خاص طور پر بارھویں صدی عیسوی سے (جب مسلمان حکمراں فاتح کی حیثیت سے بنگال میں وارد ہوئے) دورِ حاضر تک مسلم بنگالہ کی بڑی دیدہ وری اور عرق ریزی سے عکاسی کی ہے۔

اس کتاب کا ایک بڑا حصہ قیامِ پاکستان سے سقوطِ مشرقی پاکستان تک کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ۲۷۶ صفحات اور چھوٹے چھوٹے ابواب پر مشتمل ہے۔ جن میں حسب ذیل گیارہ ابواب پاکستانی دور سے متعلق ہیں:

قیامِ پاکستان۔ بنگلہ زبان۔ سیاسی حالات و واقعات۔ سیاسی تحریکیں۔ یحییٰ خاں کو اقتدار کی منتقلی۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات۔ بہاریوں کا قتلِ عام۔ آویزش۔ پاکستان کی سفارتی سرگرمیاں اور اس میں ناکامی۔ اگرتلہ سازش۔ اسبابِ سقوط۔

آخری تین ابواب بنگلہ دیش کے مستقبل سے متعلق ہیں۔

سقوطِ ڈھاکا کے حوالے سے یہ کتاب بہت اہم اور مستند ہے۔ مصنف نے اس پورے دور کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور سقوط سے پہلے مع اہل و عیال بڑے ہولناک اور دلدوز مرحلوں سے گزرے۔ انھوں نے کوئی قیاسی عمارت تعمیر نہیں کی ہے بلکہ تمام واقعات حقائق اور شواہد کی بنیاد پر لکھے ہیں۔ اس کے باوجود مصنف کے بعض خیالات و بیانات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔

پروفیسر عبدالغفور احمد (نائب امیر جماعتِ اسلامی) اس کتاب کے "پیش لفظ" میں لکھتے ہیں:

"پروفیسر محمد عثمان رمزؔ جواب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، اسلامی تحریک کے سرگرم کارکن، رہنما اور اکابرین میں سے تھے۔ پاکستان کی قومی اسمبلی کے ممبر رہ چکے تھے۔ وہ میرے دیرینہ رفیق تھے اس لیے انھیں بہت قریب سے جاننے اور دیکھنے کا موقع ملا۔ انھوں نے دو ہجرتیں کیں۔ پہلی بار ہندوستان سے مشرقی پاکستان اور دوسری بار سقوطِ ڈھاکا کے نتیجے میں ہجرت کر کے نئے پاکستان آ گئے۔"

"مرحوم کو تحریکِ اسلامی کی وابستگی کے ساتھ ساتھ شعر و ادب سے بھی شوق تھا۔ کراچی آنے کے بعد اس شوق میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ انھوں نے 'دبستانِ حرا' کے نام سے ایک ادبی ادارہ بھی قائم کیا جس کی نشست ہر ماہ ان کی قیام گاہ پر ابھی تک ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے شعری مجموعے کو کتابی شکل دی جسے 'زخمِ تنہائی' کے نام سے شائع کیا گیا۔"

"انھوں نے 'مسلم بنگالہ۔ ماضی، حال اور مستقبل' کے نام سے ایک کتاب بھی تحریر کی۔ اس کتاب کا میں نے بہت ہی توجہ سے مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب میں نوجوان نسل کے لیے بالخصوص اور عوام الناس کے لیے بالعموم بہت ہی معلوماتی مواد موجود ہے۔"

"قیامِ پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان (مسلم بنگالہ) کی جو سیاسی، معاشی اور معاشرتی صورتِ حال رہی اور بنگلہ دیش بننے میں جو عوامل کارفرما رہے، رمزؔ صاحب نے انتہائی تفصیل سے ان کا ذکر کیا ہے۔ تحریکِ بنگلہ دیش کے دوران لاکھوں غیر بنگالیوں کے خون سے دریاؤں کے اس دیس کا رنگ سرخ ہو گیا۔ رمزؔ صاحب نے اس قتلِ عام کے چشم دید گواہ کے طور پر متعلقہ باب کو لکھا، خود بھی خون کے آنسو بہائے ہیں اور اپنے قاری کو بھی محسوسات کی اس دنیا میں لے گئے ہیں۔ افسوس کہ مرحوم اس کی طباعت اپنی

زندگی میں نہ کرا سکے۔"

پروفیسر عثمان رمزؔ کی وفات کے چھ ماہ بعد ان کے صاحب زادے طلحہ عمران نے اس کتاب کو نومبر ۱۹۹۸ء میں شائع کیا۔

تاثرات

پروفیسر عثمان رمزؔ نوجوانی میں (عمر ۲۲ سال) گریجویشن کرنے کے بعد ۱۹۵۱ء میں مشرقی پاکستان پہنچے۔ اس سے پہلے ۱۹۴۹ء میں ان کی شادی ہو چکی تھی۔ ڈھاکا یونیورسٹی سے انھوں نے فلسفہ میں ایم۔ اے کیا۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۸ء تک ان کا قیام ڈھاکے میں رہا۔ اس دوران وہ پانچ سال تک جماعتِ اسلامی، ڈھاکا کے ہمہ وقتی کارکن رہے۔ اس کے بعد کالجوں میں درس و تدریس کے سلسلے میں وہ میمن سنگھ، ماگورا (جیسور)، کشتیا اور چاٹگام میں قیام پذیر رہے۔ وہ شروع ہی میں جماعتِ اسلامی سے وابستہ ہو گئے تھے۔ جماعتِ اسلامی کے فکر و فلسفہ کی نشر و اشاعت میں لگے رہتے تھے۔ اس تبلیغی جذبے کے تحت انھوں نے بنگلہ زبان بھی سیکھ لی اور اس میں پڑھنے، لکھنے اور بولنے کی اچھی صلاحیت پیدا کر لی۔ وہ جماعتِ اسلامی کے جلسوں میں بنگلہ میں تقریریں کیا کرتے تھے۔

پروفیسر رمزؔ کو اُردو ادب سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ وہ ایک اچھے ادیب و شاعر تھے۔ ان کے مضامین وقتاً فوقتاً رسالوں میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ ادبی محفلوں اور مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ مشرقی پاکستان میں پروفیسر فروغ احمد کے بعد پروفیسر عثمان رمزؔ دوسرے ایسے شاعر و ادیب تھے جو ایک مخصوص مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے کے باوجود ہر مکتبِ فکر کے شعرا و ادبا سے رابطہ رکھتے تھے اور ان کی محفلوں میں شریک بھی ہوتے تھے۔ ایسی وسیع النظری اور فراخ دلی، نظریاتی ادیبوں میں کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔

سقوطِ ڈھاکا کے نتیجے میں پروفیسر رمزؔ کو اپنے گھر بار اور مال و اسباب کے علاوہ اپنی عزیز

کتابوں اور ادبی کاوشوں سے بھی محروم ہونا پڑا۔ بہر حال وہ مع اہل وعیال کراچی آ گئے۔ چند سال کے بعد انھوں نے "دبستانِ حرا" قائم کیا، جس کی ماہانہ ادبی نشستیں ان کے گھر پر ہوتی تھیں۔ ہر مکتبِ فکر کے ادبا اس سے منسلک تھے۔

پروفیسر عثمان رمز ایک مجلسی انسان تھے۔ بڑی محبت کرنے والے، کشادہ دل، کشادہ نظر۔ انھیں تحریر وتقریر دونوں پر عبور حاصل تھا۔ انھیں گفتگو کا سلیقہ آتا تھا۔ جب وہ بولنے لگتے تو ساری محفل محوِ سماعت ہو جاتی تھی۔ تعصب وتنگ نظری اور غیبت وعداوت کا ان کے یہاں گزر نہ تھا۔ ۹ر مئی ۱۹۹۸ء کو ۶۹ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ چند ماہ پہلے ہی ان کا مجموعہ "زخمِ تنہائی" شائع ہوا تھا۔ اللہ مغفرت فرمائے!

پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں یادگار چھوڑیں۔

شاعر صدیقی

(شاعر، صحافی، مضمون نگار)

نام: عبدالرزاق خاں

قلمی نام: شاعر صدیقی

سالِ پیدائش: ۱۹۳۳ء (میٹرک سرٹیفکیٹ کے مطابق)

مقامِ پیدائش: کلکتہ

تعلیم: میٹرک۔ کلکتہ یونیورسٹی۔ انٹر، بی۔ اے، ایم۔ اے اُردو، ڈھاکا یونیورسٹی

پہلی ہجرت: ۱۹۵۰ء، ڈھاکا

پیشہ: ملازمت۔ واپڈا، اسٹینو گرافر۔ صحافت سے بھی تعلق رہا۔ ڈھاکا کے مختلف اخباروں میں کام کیا۔ آخری دور میں فلمی رسالہ "چترالی" کے مدیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ فلموں میں گانے اور مکالمے بھی لکھے۔

دوسری ہجرت: سقوطِ ڈھاکا کے بعد، نیپال ہوکر کراچی پہنچے۔

ملازمت سے سبک دوشی: ۱۹۹۳ء میں واپڈا کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد پرائیوٹ ملازمت کرتے رہے

اولاد: ایک بیٹا، دو بیٹیاں، سب شادی شدہ ہیں۔

شاعری:

شاعر صدیقی سابق مشرقی پاکستان کے ممتاز و معروف شعرا میں تھے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن کبھی کبھی نظمیں بھی کہہ لیتے ہیں۔ انھوں نے بہت سے فلمی نغمے بھی لکھے۔ وہ ایک کہنہ مشق، زود گو شاعر ہیں۔ ان کے اب تک دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ۲۰۰۶ء میں اسلام آباد سے ان کا پہلا ضخیم شعری مجموعہ ''آنکھوں میں سمندر'' شائع ہوا جس کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ ان کے کلام میں رومانیت، موسیقیت اور لطف و اثر بھی ہے اور اخلاقی و مذہبی اقدار کی پاسداری بھی۔

نمونۂ کلام

دو غزلیں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں:

دشت کو گھر بنا لیا ہم نے
ریت میں منھ چھپا لیا ہم نے

اپنی قسمت کی تیرگی کی قسم
دل کو سورج بنا لیا ہم نے

پاس جو کچھ تھا سب لٹا بیٹھے
اک ترا غم بچا لیا ہم نے

ان کو آنا تھا وہ نہیں آئے
جذبِ دل آزما لیا ہم نے

بند جب ہو گئے دریچے سب
گھر کا تب راستا لیا ہم نے

مست آنکھوں میں ڈوب کر ان کی
بے خودی کا مزا لیا ہم نے

نام پہ دوستی کے پھر شاعرؔ
زخم اک اور کھا لیا ہم نے

حصارِ ذات سے باہر نکل کے دیکھو تو
مری طرح غمِ ہستی میں ڈھل کے دیکھو تو
وفا کی راہ میں پتھر کدھر سے آتے ہیں
دو چار گام مرے ساتھ چل کے دیکھو تو
کہیں زمانہ کوئی چال چل گیا تو نہیں
یہ شور کیسا ہے، باہر نکل کے دیکھو تو
بہت حسین محبت کی آگ ہوتی ہے
کسی کی چاہ میں اک بار جل کے دیکھو تو
تمھارے گیت بھی دل پر اثر کریں گے ضرور
نیا زمانہ ہے تم لَے بدل کے دیکھو تو
ہمارے دور سے پہلے کسے نصیب ہوا
ہمارے دور میں تیور غزل کے دیکھو تو
طلسمِ ظلمتِ شب ٹوٹنے کو ہے شاعرؔ
سحر کا جلوہ ذرا آنکھ مل کے دیکھو تو

"پانی کا ملک پتھر کے لوگ"

المیہ سقوطِ ڈھاکا اس لحاظ سے دوآتشہ ہوگیا کہ اس کے ساتھ ہی وہاں مہاجروں کا قتلِ عام ہوا اور ظلم و بربریت کے ایسے ایسے مناظر دیکھنے میں آئے جو پہلے کبھی نہ دیکھے گئے۔

ہجرتوں کے تمام شاعروں کے کلام میں اس کی کچھ نہ کچھ جھلک ضرور نظر آتی ہے۔ شاعر صدیقی جیسا حساس اور دردمند شاعر اس سے کس طرح پہلو تہی کر سکتا تھا۔ انھوں نے ''پانی کا ملک پتھر کے لوگ'' کے عنوان سے ایک الگ مجموعہ مرتب کیا جو اب تک غیر مطبوعہ ہے۔ اس کے کچھ اشعار ''آنکھوں میں سمندر'' میں درج کیے گئے ہیں۔ نمونتاً چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

آ پھنسے جال میں ستم گر کے ملک پانی کا لوگ پتھر کے
آگ کا جسم اور دل پتھر جس کو دیکھو وہ ظلم کا پیکر
بولتے ہیں یہ پیار کی بولی کھیلتے ہیں یہ خون کی ہولی
ہیں یہ انسانیت سے بے بہرہ رنگ چنگیزیت کا ہے گہرا
ظلم کی ان کے ایک زندہ مثال ہے یہ انیس سو اکہتر سال
خون ہی خون ہے نگاہوں میں مسجدوں میں گھروں میں راہوں میں
اس میں شامل ہے خون بچوں کا ننھے ننھے نحیف جسموں کا
مرد کا خون، خون عورت کا خون عزت کا خون عصمت کا
خون ہے ملک کے جوانوں کا اپنی سرحد کے پاسبانوں کا
توبہ توبہ درندگی توبہ ہائے انساں کی بے بسی توبہ
لے کے چٹگام سے بیناپل تک عصمتیں لٹ رہی تھیں بیچ سڑک
ڈھایا امن و اماں کا تاج محل مسجدوں کو بنا دیا مقتل
لائے جاتے تھے ایک اک کر کے سارے افراد ایک اک گھر کے
بچہ ہو نوجواں ہو یا بوڑھا ظلم سے ان کے کوئی بچ نہ سکا
یوں دکھاتے تھے ظلم کا جوہر مارتے تھے اذیتیں دے کر
ایک حالت میں تھے امیر و غریب نہ کسی لاش کو کفن تھا نصیب
جرم یہ تھا کہ تھے محبِ وطن اور پیارا تھا ان کو اپنا چمن

آہ، تاریخ کا یہ بابِ سیاہ شرم سے اب نہ اُٹھ سکے گی نگاہ
خون یہ رائیگاں نہ جائے گا اک نہ اک روز رنگ لائے گا

جناب شاعر صدیقی کا دوسرا مجموعۂ کلام "بجھتے سورج نے کہا" ۲۰۰۹ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ یہ خوب صورت مجموعہ ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے جس میں ۹۰ نظمیں اور غزلیں ہیں جن میں سے بیشتر ڈھاکے میں لکھی گئیں۔

نثر نگاری

شاعر صاحب ایک اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ شروع میں افسانے بھی لکھے۔ میدانِ صحافت میں آنے کے بعد مضامین، فیچر، کالم اور اداریے بھی کچھ لکھتے رہے۔ اپنے بعض دوستوں اور اہم شخصیت کے خاکے بھی لکھے۔ ان کے مضامین اور خاکوں کا مجموعہ "میرے ہمدم، میرے دوست" غالباً اب تک غیر مطبوعہ ہے۔

اخلاق و کردار

شاعر صدیقی نے سخت جدوجہد کی زندگی گزاری۔ ۱۹۴۹ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۵۰ء میں ڈھاکا آگئے۔ وہاں سرکاری ملازمت کرلی۔ تعلیمی سلسلہ اور ادبی مشاغل بھی جاری رہے۔ ڈھاکا یونیورسٹی سے اُردو میں ایم۔ اے کیا۔ افسانہ نگاری اور شاعری کے ساتھ ادبی محفلوں میں شرکت بھی ہوتی رہی۔ متعدد ادبی انجمنوں کے سرگرم کارکن اور عہدے دار بھی رہے۔ جز وقتی طور پر صحافت سے بھی منسلک رہے۔ جب مشرقی پاکستان میں اُردو فلمیں بننے لگیں تو فلمی نغمہ نگار اور اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے ان کی مصروفیتیں اور بڑھ گئیں۔ ریڈیو اور ٹی وی سے بھی تعلق رہا۔ ان کا کلام بڑے تسلسل سے ہندوستان اور پاکستان کے ادبی جرائد میں شائع ہوتا رہا۔ سرکاری ملازمت بھی بغیر کسی تعطل کے جاری رہی۔ حیرت ہے کہ وہ اتنا سارا کام کیسے کرلیتے تھے۔ اتنی

مصروفیتوں کے باوجود ان کی خوش مزاجی۔ خوش اخلاقی اور ملنساری ہمیشہ برقرار رہی۔ اس کے علاوہ دوسروں کی مدد کرنا اور ان کے کام آنا ان کی ایک اضافی مصروفیت تھی۔

سقوطِ ڈھاکا کے بعد شاعر صاحب نے بہت تکلیفیں اٹھائیں۔ ۱۹۷۳ء میں نیپال ہوتے ہوئے مع اہلِ عیال کراچی پہنچے۔ یہاں بھی مصروفِ تگ و دو رہے۔ اسٹینو کی حیثیت سے واپڈا کی ملازمت جاری رہی۔ شعر و شاعری، نثر نگاری، ریڈیو اور ٹی وی کے لیے نغمہ نگاری اور صحافت کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ واپڈا کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو پرائیوٹ ملازمت کر لی۔ اب مکمل ریٹائر ہو چکے ہیں۔ دوستوں کے اصرار پر کبھی کبھی ادبی نشستوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ ایسے منکسر مزاج، با اخلاق، مخلص، ہمدرد اور نیک کردار شاعر و ادیب بہت کم ملتے ہیں۔ ان کے اس شعر پر یہ مضمون ختم کرتا ہوں:

اس حسین وادی میں نفرتوں کی آندھی میں
جل رہے ہیں ہم تنہا پیار کا دیا بن کر

کاوش عمر

(منفرد شاعر، اُستادِ سخن)

سید محمد مشتاق عالم نام اور قلمی نام کاوش عمر ہے۔ ضلع پٹنہ (بہار) کے موضع بہ پورہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید محمد عمر فیضی ایک جید عالم، ماہر طبیب اور عربی و فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ کاوش عمر نے عربی، فارسی اور اُردو انھیں سے پڑھی۔ ادیب اُردو و فارسی کی سند حاصل کی۔ غالباً ۱۹۵۰ء میں ڈھاکا آ گئے۔ ڈھاکا اس وقت شعر و ادب کا مرکز بنا ہوا تھا۔ کاوش عمر بھی مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ معلّمی کا پیشہ اختیار کیا۔ صحافت سے بھی دلچسپی تھی۔ کچھ عرصہ روزنامہ "پاسبان" سے وابستہ رہے۔ چند سال کے بعد وہ چاٹگام چلے گئے۔

چاٹگام میں کاوش عمر کی ادبی سرگرمیاں اور بڑھ گئیں۔ شعر و شاعری اور ادبی محفلوں میں شرکت کے علاوہ متعدد ادبی رسالوں سے بھی وابستہ رہے۔ "پیامِ مشرق" چاٹگام، ماہنامہ "کرنافلی" چاٹگام، ماہنامہ "پرچم" چاٹگام اور ماہنامہ "سیماب" چاٹگام کے مدیر رہے۔ ماہنامہ "روش" چاٹگام کے مشیر تھے۔ روزنامہ "شجاعت" چاٹگام سے بھی تعلق رہا۔

کاوش عمر کا شمار مشرقی پاکستان کے ممتاز شعرا میں ہوتا تھا۔ انھیں زبان و بیان پر ماہرانہ قدرت حاصل تھی۔ وہ زود گو اور پُر گو بھی تھے۔ اپنی غزلوں اور نظموں میں خوب صورت اور ہم آہنگ الفاظ بڑی چابک دستی سے استعمال کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کے کلام میں ایک خاص دل کشی اور انفرادیت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان کی فارسی نظمیں اور غزلیں بھی بڑی

دلکش اور پُر اثر ہوتی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ مشرقی پاکستان میں ان کی ادبی زندگی کا بہترین دور گزرا۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد کاوش عمر بڑی مشکلوں سے مع اہل و عیال کراچی پہنچے۔ اس المیۂ عظیم نے انھیں زخم خوردہ اور دل شکستہ کر دیا تھا۔ شعر گوئی اور ادبی سرگرمیاں تقریباً ترک کر دیں اور بچوں کی پرورش و کفالت کے لیے درس و تدریس میں منہمک ہو گئے۔

ملتے نہیں اب کسی سے کاوشؔ
گوشے میں پڑے ہیں اپنے گھر کے

ایک عرصے کے بعد بعض شاگردوں کے اصرار پر دوبارہ ادبی سرگرمیوں میں دلچسپی لینے لگے لیکن بڑی حد تک گوشہ نشیں ہی رہے۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہو گئے خاک انتہا یہ ہے

"سنگ و سمن"

ہمارے اکثر اساتذہ کی طرح کاوش عمر کی طبیعت میں بھی ایک بے نیازی رہی ہے۔ اتنا کچھ کہا لیکن اپنا کلام جمع کیا نہ کوئی مجموعہ شائع کرنے کی کوشش کی۔ اللہ بھلا کرے یوسف راہی چاٹگامی کا کہ انھوں نے بڑی مشکلوں سے انھیں مجموعہ شائع کرنے پر آمادہ کیا۔ کچھ کلام رسالوں وغیرہ سے جمع کیا اور زیادہ تر غزلیں کاوش عمر صاحب اپنی یادداشت سے انھیں لکھ لکھ کر دیتے رہے۔ اس طرح وہ یہ خوب صورت مجموعہ "سنگ و سمن" مرتب کرنے اور ۲۰۱۰ء میں اسے شائع کرنے میں کامیاب ہو گئے (دیکھیے دیباچہ مرتب "عرضِ حال")۔

"سنگ و سمن" ۲۸۴ صفحات اور حمد و نعت اور متفرق اشعار کے علاوہ ۱۵۹ غزلوں پر مشتمل ہے۔

نمونۂ کلام

یہ پتنگے اگر شمع گل ہو گئی، مضمحل، خوں بدل، غم بسر جائیں گے
کچھ اِدھر جائیں گے، کچھ اُدھر جائیں گے، کچھ اندھیرے سے گھبرا کے مر جائیں گے
ایک دن دورِ عیش و طرب کی طرح غم کے یہ سلسلے بھی گزر جائیں گے
اشک تھم جائے گا، آہ رک جائے گی، درد مٹ جائے گا، زخم بھر جائیں گے
ہر تمنا حسیں، ہر ارادہ جواں، عزمِ منزل قوی، شوق جادہ جواں
خواہ آندھی چلے، خواہ طوفاں اٹھے، خواہ بجلی گرے، بے خطر جائیں گے
یہ نگاہیں، یہ چتون، یہ عارض، یہ لب، یہ جوانی کے جلوے غضب ہیں غضب
ایسے عالم میں دیکھیں نہ آپ آئینہ، ورنہ اپنی ہی صورت پہ مر جائیں گے
کیا کرے خاک ان کا بھروسہ کوئی، ہے طبیعت میں ان کی تلون ابھی
لا اُبالی ہیں وہ، ان کا کیا ٹھیک ہے، آج وعدہ کیا کل مُکر جائیں گے
یوں تو شیوہ ہے دونوں کا جلنا مگر، ان کے انداز میں فرق ہے کس قدر
شمع جلتی رہے گی یوں ہی رات بھر، اور پتنگے ابھی جل کے مر جائیں گے
اے گرفتارِ غم، ہو نہ مایوس چل، کیا عجب کھل اٹھیں آرزو کے کنول
گرم ہے یہ خبر، لے کے رنگیں غزل، بزمِ خوباں میں کاوش عمر جائیں گے

ہو گیا نذرِ آشوب دورِ طرب، میری چشمِ تمنا کی مٹھی میں اب
کوئی موتی کہاں، کوئی تارا کہاں، کوئی تتلی کہاں، کوئی جگنو کہاں
یوں تو ہیں ایک سے ایک بڑھ کر حسیں، پھر بھی اس کی طرح اس جہاں میں کہیں
کوئی شمشاد قد، کوئی مہتاب وش، کوئی زہرہ جبیں، کوئی گل رُو کہاں
حسن کے روح پرور نظارے گئے، عشق کے سب فسوں گر سہارے گئے
اب وہ آنچل کہاں، اب وہ دامن کہاں، اب وہ عارض کہاں، اب وہ گیسو کہاں

وصل کا عہد رنگیں فسانہ ہوا، اس کو بچھڑے ہوئے اک زمانہ ہوا
اب وہ راتیں کہاں، اب وہ باتیں کہاں، اب وہ گھاتیں کہاں، اب وہ جادو کہاں
قہر جاں ہیں جدائی کی شام و سحر، کنجِ غم میں اکیلا ہے کاوش عمر
کوئی محرم کہاں، کوئی مونس کہاں، کوئی ہمدم کہاں، کوئی دلجو کہاں

خونِ ناحق یہ برملا کیا ہے
شہر بھی، دشتِ کربلا کیا ہے
کیوں زبردست ظلم والے ہیں
کشت و خوں کا یہ سلسلہ کیا ہے
کیوں ہیں تصویرِ بے کسی چہرے
دمبدم جورِ ناروا کیا ہے
راستے چپ ہیں، بام و در خاموش
کس سے پوچھوں کہ ماجرا کیا ہے
گھر سے باہر اگر کوئی جائے
اس کی قسمت میں جز قضا کیا ہے
ہو رہے ہیں جو بے گناہوں پر
ان مظالم کی انتہا کیا ہے
سب کو مولا امان میں رکھے
اور کاوشؔ مری دعا کیا ہے

میرے نغمے ہیں، مرے دل کا لہو
خون رونے کے لیے زندہ ہوں میں

جن کی جرأت کھو گئی بنگال میں
اُن شہیدوں کا نمائندہ ہوں میں

☆☆☆☆☆

ہر چوٹ جگر پر ہنس کے سہنا سیکھو
سب سہ کے زباں سے کچھ نہ کہنا سیکھو
یہ گلبدنوں کی انجمن ہے کاوش
کانٹوں کی طرح خموش رہنا سیکھو

سرور و کیف و نشاط و خوشی میں ڈھلتی ہے
فغان و سوز و گداز و غمی میں ڈھلتی ہے
میں اپنے عہد میں اپنی روش کا شاعر ہوں
مری زباں پہ لغت شاعری میں ڈھلتی ہے

کاوش عمر ایک مہذب، شائستہ اور ہمدرد انسان ہیں۔ ایک عرصے سے اصلاحِ شعر کی خدمت بھی انجام دے رہے ہیں۔ ان کی حیثیت استادِ سخن کی ہے۔ کئی سال سے عارضۂ قلب میں مبتلا اور مکمل طور پر گوشہ نشیں ہیں۔ اولاد میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ بڑا بیٹا اور تینوں بیٹیاں شادی شدہ ہیں۔

کاوش عمر کی نظموں کا ایک مجموعہ "منبرِ خوں" سقوطِ مشرقی پاکستان کے حوالے سے حال ہی میں (۲۰۱۱ء) میں شائع ہوا ہے جس میں دفاعِ وطن کے سلسلے میں پاک فوج کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔

❖❖

منظر علی خاں منظرؔ

(شاعر، خاکہ نگار، مزاح نگار)

منظر علی خاں منظرؔ کے مجموعۂ کلام "کربِ آگہی" میں دوسری ہجرت کے نقوش بہت نمایاں ہیں۔ یہ مجموعہ کراچی سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ چند نظموں اور متفرقات کے علاوہ یہ مجموعہ تمام تر غزلوں پر مشتمل ہے۔ صفحات ۱۶۳ ہیں۔

کتاب کا انتساب دیکھیے:

"اپنی امی جان مرحومہ کے نام!

جن کی محبتوں اور شفقتوں نے سانحہ مشرقی پاکستان کا غم برداشت کرنے کا حوصلہ بخشا"

"کربِ آگہی" کا پہلا دیباچہ جناب مشفق خواجہ نے اور دوسرا دیباچہ خود شاعر نے لکھا ہے۔

منظرؔ صاحب اپنے دیباچہ کے عنوان "از گنگ تا سنگ" کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میرا آبائی شہر بھاگلپور، پھر مونگیر جس سے جذباتی لگاؤ رہا اور میرے خوابوں کی سرزمین ڈھاکا اور راج شاہی سب ہی دریائے گنگا کے کنارے آباد ہیں اور اب میں پہاڑوں کی قریب ہوں۔"

منظر صاحب نے اس دیباچے میں اپنی ابتدائی زندگی کے حالات، پہلی ہجرت، مشرقی

پاکستان میں اپنی ملازمت وغیرہ کی روداد لکھی ہے اور خاص طور پر راج شاہی کی محفلِ شعروادب اور شعرا کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

منظر علی خاں بھاگلپور (بہار) میں ایک تعلیم یافتہ، خوش حال اور مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی تاریخ پیدائش نہیں لکھی۔ حصولِ تعلیم کے بعد (تعلیم کہاں تک حاصل کی، یہ بھی نہیں لکھا) ۱۹۵۶ء میں انھیں مونگیر میں ملازمت مل گئی۔ ۱۹۶۰ء میں اپنی والدہ کے حکم پر اپنے خاندان کے دیگر افراد کے پاس ڈھاکا چلے آئے۔ یہاں پہلے یونائیٹڈ بینک سے وابستہ ہوئے، پھر حبیب بینک سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۶۵ء میں ان کا تبادلہ راج شاہی (شمالی مشرقی پاکستان کا ایک چھوٹا سا خوب صورت شہر) میں ہو گیا۔ یہاں انھوں نے شعروشاعری اور مشاعروں میں خاص دلچسپی لی۔ راج شاہی یونیورسٹی کے مہاجر اساتذہ کی وجہ سے یہاں ایک خاص علمی وادبی ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ منظر صاحب نے یہاں بہت سے چھوٹے بڑے مشاعروں کا اہتمام کیا۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد منظر صاحب اپنے لواحقین کے ساتھ بڑی تکلیفیں اٹھا کر نیپال ہوتے ہوئے کراچی پہنچے۔

مشفق خواجہ مرحوم ''کربِ آگہی'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''منظر صاحب نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ سابق مشرقی پاکستان میں گزارا ہے۔ یہ ان کا وطنِ ثانی تھا جسے انھوں نے اپنے خوابوں کی تعبیر سمجھا تھا اور جس کی آبیاری میں ان کا اور ان جیسے لاکھوں افراد کا خون صرف ہوا تھا۔ اس نئے وطن سے انھیں اتنی ہی محبت تھی جتنی کسی سرزمین سے اس کے فرزندوں کو ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک ایسا لمحہ بھی آیا جب وطن کی سرزمین اپنے ان فرزندوں کے لیے تنگ ہو گئی۔ چوتھائی صدی تک اپنے خون سے چمن کی آبیاری کرنے والے چمن کی فضا میں سانس لینے کے بھی حق دار نہ سمجھے گئے۔ منظر صاحب نے اس خوں چکاں عہد کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ تماشائی کی حیثیت سے نہیں، جزوِ تماشا بن کر۔ اس زمانے میں ان کو جن اذیت ناک حالات کا سامنا کرنا پڑا اس کی

جھلک ان کے کلام میں جا بجا ملتی ہے............ یہ ہمارے عہد کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے لیے دریائے خوں پار کرنے والوں کو ایک مرتبہ پھر ۱۹۷۱ء میں پاکستان ہی کے لیے دریائے خون پار کرنا پڑا۔"

منتخب اشعار

"کربِ آگہی" سے چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں:

گھر بناتے ہیں ہم لٹانے کو
ہائے کتنے عجیب ہیں ہم لوگ

پہنچا ہے یہاں خون کے دریا سے گزر کر
"منزل ہے ابھی دور تری اور سفر کر"
کیا بات ہے پھر راہ میں حائل نظر آئی
وہ موجۂ خوں آئے تھے ہم جس سے گزر کر

بایں حقیقت کہ غم کے مارے ہوئے ہیں زخموں سے چور ہیں ہم
وفا کی وادی میں پھر بھی یارو کوئی نہیں پر ضرور ہیں ہم
ہمیں یہ غم ہے کہ اپنے زخموں کی داد تک بھی نہ دی کسی نے
گلہ ہے اربابِ انجمن کا کہ کس قدر ناصبور ہیں ہم
وہ جن کی خاطر ہوئے تھے رسوا وہی حقارت سے دیکھتے ہیں
انھیں نگاہوں میں چبھ رہے ہیں کہ جن نگاہوں کے نور ہیں ہم

کراچی ۱۹۷۲ء

کراچی پہنچنے کے بعد غالباً یہ پہلی غزل ہے جس سے اربابِ انجمن کے رویے کا بھی اظہار ہو رہا ہے۔ اس مجموعے کی ایک خوبی یہ ہے کہ ہر غزل اور نظم کے نیچے مقام اور سال تحریر بھی درج ہے۔

وہ جن کا پیشہ ہی رہزنی ہے وہ درس دیتے ہیں رہبری کا
جو خود اندھیروں کے ہیں پجاری علم اٹھائے ہیں روشنی کا
سکونِ دل کی تلاش میں ہم چلے تو آئے ہیں انجمن میں
مگر کہاں پوچھتا ہے کوئی سبب مرے دل کی بے کلی کا
تلاش ہے جس کی ہر کلی کو ترے علاوہ ہے کوئی منظر
بہارِ حسنِ چمن کی خاطر خراج دے اپنی زندگی کا
کراچی ۱۹۷۴ء

آگہی اس کو ہو آدابِ جنوں کی کیسے؟
جس نے جذباتِ محبت کی تجارت کی ہے
☆☆☆☆☆
اجنبی میں ہوں ترے واسطے میرا کیا ہے
کل بھی بے نام تھا میں، آج بھی بے نام اے دوست
☆☆☆☆☆
محفل میں غنیمت ہیں یہ اربابِ وفا بھی
ہر چوٹ پہ ہنستے بھی ہیں دیتے ہیں دعا بھی
مقتول تڑپتا ہی رہا چشمۂ خوں میں
قاتل کو ملا حرفِ ستائش بھی صلہ بھی

غم نہیں گر غریب ہیں ہم لوگ
دورِ نو کے نقیب ہیں ہم لوگ
ایک طوفان سے نکل آئے
دوسرے کے قریب ہیں ہم لوگ
گھر بناتے ہیں ہم لٹانے کو
ہائے کتنے عجیب ہیں ہم لوگ
بد نصیبی بھی رشک کرتی ہے
کس قدر خوش نصیب ہیں ہم لوگ
ایک عالم ہے درپئے آزار
کب کسی کے حبیب ہیں ہم لوگ

کراچی ۱۹۷۲ء

نظم "حدیثِ دل" کے چند اشعار:

حقیقت صاف ظاہر ہے نہیں کچھ بھی نہاں اب تو
پرستارانِ حق آتا ہے دورِ امتحان اب تو
خدا کے نام پر یہ مملکت ہم نے بنائی تھی
مگر مشکل خدا کا نام لینا ہے یہاں اب تو
خداوندا تری عظمت کی خاطر سر بکف ہیں ہم
ہمارے خون سے رنگین ہے تیرا جہاں اب تو
حدیثِ دل سنا کر ان کو اپنائیں تو ہم کیسے
خلوص، دل سے پیاری ہے انھیں اپنی زباں اب تو

جنھیں اپنا سمجھتے ہیں انھیں کے ہاتھ سے منظر
تجھے سہنی ہے کچھ دن اور چہرہ دستیاں اب تو

راج شاہی، ۱۹۷۰ء

اس نظم پر منظر مرحوم نے یہ نوٹ لگایا ہے (یکم مارچ ۱۹۷۰ء کو ایک سیاسی جماعت کا جلسہ پلٹن میدان، ڈھاکا میں تاراج ہونے کی خبر سے متاثر ہو کر)۔ یہ جلسہ دراصل جماعتِ اسلامی کا تھا جس سے امیر جماعتِ اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی خطاب کرنے والے تھے۔ ابھی وہ جلسہ گاہ نہ پہنچے تھے لیکن جلسے کی کارروائی شروع ہو چکی تھی کہ جلسے کو چاروں طرف سے عوامی لیگی غنڈوں نے گھیر لیا اور سنگ باری شروع کر دی۔ راقم اس جلسے میں موجود تھا۔ ہر طرف سے پتھروں کی بارش ہو رہی تھی، لوگ زخمی ہو رہے تھے کہ عصر کی اذان ہو گئی۔ اسی حال میں عصر کی نماز ادا کی گئی۔ سینکڑوں لوگ زخمی ہو گئے۔ حاضرین منتشر ہونے لگے۔ جو لوگ کرتا پاجامہ، ٹوپی یا شیروانی پہنے ہوئے جلسہ گاہ سے نکلتے انھیں پکڑ کر زدوکوب کیا جاتا رہا۔ مغرب کے وقت چند سو افراد رہ گئے جنھوں نے میدان سے متصل مسجد میں پناہ لی، لیکن سنگ باری ختم نہ ہوئی۔ مغرب کی نماز کے بعد پولیس کی چند گاڑیاں آئیں اور انھیں وہاں سے نکال کر لے گئیں۔ راقم عصر کی نماز کے بعد جلسہ گاہ سے کسی طرح نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

تصانیف

منظر صاحب نے کراچی آنے کے بعد نثر نگاری بھی شروع کر دی اور مزاح نگار اور خاکہ نگار کی حیثیت سے مشہور و مقبول ہوئے۔ ان کی حسبِ ذیل کتابیں شائع ہوئیں۔

۱۔ "کربِ آگہی" (شاعری) ۲۔ "بدلتے چہرے" (مضامین)
۳۔ "مکرر کہے بغیر" (مضامین) ۴۔ "یہ بات چلی مجھ سے" (شاعری)
۵۔ "چھپائے نہ بنے" (مضامین) ۶۔ "خاکہ نما" (شخصی خاکے)

"خاکہ نما"

منظر علی خاں منظر ایک منفرد خاکہ نگار تھے۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ "خاکہ نما" کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں ۲۲ اہلِ قلم کے خاکے ہیں۔ یہ سب خاکے ایک مخصوص انداز میں لکھے گئے ہیں جس میں طنز و مزاح نمایاں ہے۔ سید محمود واجد ہاشمی کا خاکہ "فکشن کا ڈاکٹر" کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ اس سے ایک اقتباس دیکھیے:

"ایک کم چالیس سال قبل ہم اور برادرم سید محمود واجد ہاشمی ایک ساتھ مارواڑی کالج، بھاگلپور میں داخل ہوئے۔ ان کا معاملہ کچھ عقدِ ثانی والا تھا جب کہ میرا کنوارپن ابھی ابھی رخصت ہوا تھا۔ محمود واجد نے انٹر ٹی۔ این۔ بے کالج سے کیا تھا اور تھرڈ ایئر میں داخل ہوئے تھے۔ جب کہ میں فرسٹ ایئر فول بنا بڑی شان سے کامن روم کے آس پاس گھوما کرتا تھا۔ مجھ میں اور برادرم محمود واجد میں دو سال کا فاصلہ ہونے کے باوجود بہت سی باتیں تقریباً ایک جیسی تھیں۔ یعنی یہ کہ محمود صاحب کلاس روم کے باہر کبھی دیکھے نہیں گئے۔ مجھے کلاس روم کے اندر کسی نے نہیں دیکھا۔ محمود صاحب کبھی کھیل کے میدان کے اندر یا باہر پائے نہیں گئے، میں ان دونوں جگہوں کے علاوہ کہیں اور پایا نہیں گیا۔ محمود صاحب کو پڑھنے سے کبھی فرصت نہ ملی۔ مجھے پڑھنے کی کبھی فرصت نہ ملی۔"

۱۸ رجنوری ۱۹۹۶ء کو کراچی میں ان کی وفات ہوگئی۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۶۰ سال یا اس سے کچھ زیادہ تھی۔ منظر مرحوم نے "کربِ آگہی" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ۱۹۵۷ء میں ان کی شادی ہوئی لیکن اپنی کسی اولاد کا ذکر نہیں کیا۔

❖❖

شاہین بدر
(شاعر، مضمون نگار)

سوانحی خاکہ

نام: سیّد محمد ابو ہاشم عابدین

قلمی نام: شاہین بدر

ولدیت: سیّد محمد زین العابدین (مرحوم)

تاریخ پیدائش: ۷؍جولائی ۱۹۳۶ء

مقامِ پیدائش: بھاگلپور (بہار)

تعلیم: بی۔اے

پہلی ہجرت: مشرقی پاکستان۔ پاربتی پور

پیشہ: تدریس و صحافت

دوسری ہجرت: سقوطِ ڈھاکا کے بعد، کراچی

وفات: ۱۰؍جون ۲۰۰۳ء۔ کراچی

اولاد: دو بیٹے، تین بیٹیاں

''زرد موسم کی ہوا''

شاہین بدر کا مجموعۂ کلام ''زرد موسم کی ہوا'' ۲۰۰۰ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے جس میں ۶۳ نظمیں اور ۹۹ غزلیں ہیں۔ نظمیں سب آزاد ہیں، کوئی پابند نظم نہیں۔ اس مجموعے کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کی ہر نظم اور غزل کے نیچے سالِ تحریر درج ہے۔ شاہین صاحب نے ۱۹۵۳ء یا اس سے پہلے سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے ۱۹۷۱ء تک جو کچھ کہا وہ نذرِ سقوطِ ڈھاکا ہو گیا۔ اس مجموعے میں اس کے بعد کا کلام ہے۔

شاہین بدر مشرقی پاکستان میں ایک جدید نظم نگار کی حیثیت سے معروف تھے۔ ان کی شاعری بڑی حد تک علامتی شاعری ہے۔ لیکن ناقابلِ فہم نہیں۔ اس مجموعے میں ''دھوپ'' کی اصطلاح بکثرت استعمال کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ''دھوپ'' سختی، تلخی اور مصائب کی علامت ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شاہین بدر کی ساری زندگی اور خاص طور پر دوسری ہجرت کے بعد زندگی بڑی سخت کوشی، تنگی اور پریشاں حالی میں گزری۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی شاعری میں ان کی زندگی اور ماحول کی سچی عکاسی ملتی ہے۔

ہجرتوں کی تھکن

شاہین بدر بھاگلپور (بہار) کے ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد میں زمیندارانہ خو بو کچھ زیادہ تھی۔ وہ اپنے مزارعوں پر تشدد بھی کرتے تھے جو شاہین صاحب کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ ایک نرم دل اور ہمدرد انسان تھے۔ والد کے رویے سے تنگ آ کر گھر سے نکل پڑے اور مشرقی پاکستان کے شہر پاربتی پور جا پہنچے۔ یہاں انھیں مشہور و معروف ''جناح ہائی اسکول'' میں ملازمت مل گئی۔ سقوطِ ڈھاکا تک وہ بڑے اطمینان اور سکون سے اپنے تدریسی فرائض انجام دیتے رہے اور ان کی نظمیں ہند و پاک کے موقر جرائد میں شائع ہوتی رہیں۔ یہ ان کی زندگی کا سب سے اچھا دور تھا۔ لیکن سقوطِ ڈھاکا ان پر بلائے ناگہانی بن کر ٹوٹ پڑا۔ انھیں مقتل لے جایا گیا جہاں

بہاریوں کو ذبح کیا جا رہا تھا۔ ان کی باری آئی تو انھیں لٹا کر چھری گلے پر رکھ دی گئی کہ اچانک ان کا کوئی جاننے والا بارسوخ بنگالی وہاں آ پہنچا اور ان ظالموں کے ہاتھ سے انھیں چھڑا لایا۔ کئی دن تک انھیں اپنے گھر میں چھپا کر رکھا۔ پھر اس نے شاہین صاحب کو مع اہل و عیال بارڈر پار ہندوستان پہنچا دیا۔

کئی سال کی صحرا نوردی کے بعد شاہین صاحب پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ مصائب نے انھیں اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا لیکن بچوں کی پرورش و کفالت کا معاملہ تھا۔ لانڈھی میں سکونت اختیار کی اور اورنگی کے اسکولوں میں پڑھانے لگے۔ بہر حال اس نیک اور شریف انسان نے رزق حلال کے لیے ایک طویل عرصے تک سخت محنت و مشقت کی اور اس دنیا سے سرخرو ہو کر اپنے رب کے حضور جا پہنچا۔ ۱۰ر جون ۲۰۰۳ء کو ان کی وفات ہو گئی۔ اللہ مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے!

اولاد میں دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ تینوں بیٹیوں کی شادی دوستوں کے تعاون سے بڑی اچھی طرح اور اچھے گھرانوں میں انجام پا گئی تھی۔ دل کا مرض بھی لاحق ہو گیا تھا اور اسی مرض میں وفات پائی۔ ع دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا۔

شاہین بدر بڑے نیک، مخلص اور سیدھے سادے انسان تھے۔ اپنے کام سے کام رکھتے تھے اور اپنے فرائضِ منصبی بڑی دیانت داری اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے۔ ساری زندگی درس و تدریس اور تنگی ترشی میں گزار دی۔ وہ میرے بڑے اچھے دوستوں میں تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ ان سے تقریباً ہر روز ہی ملاقات ہوتی تھی۔ وہ "الحرا ہائی اسکول، اورنگی" میں پڑھاتے تھے اور میں "الحرا کالج برائے خواتین" میں۔ ہم دونوں ہی درد و غم کے مارے ہوئے تھے، لہٰذا قربت بھی کچھ زیادہ رہی:

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

منتخب کلام

چند غزلیں درج کی جاتی ہیں:

خشک پتہ ہوں میں سینے سے لگا لے مجھ کو
زندگی! کر نہ ہواؤں کے حوالے مجھ کو

تجھ میں پھولوں کی ادا، مجھ میں صفت شبنم کی
مسکرا لے مری حالت پہ، رُلا لے مجھ کو

میرا سایہ مرے قدموں سے لپٹ کر رویا
جب بھی بخشے گئے سورج کے دوشالے مجھ کو

جب بھی شاہینؔ، لہو پیتی ہے بنجر دھرتی
یاد آتے ہیں سحر رنگ اُجالے مجھ کو

(۱۹۸۲ء)

دیکھ کر خشک برگ و شجر دھوپ میں
رقص کرنے لگی دوپہر دھوپ میں

وقت سورج کی تلوار لے کر بڑھا
ہو گئے ہم بھی سینہ سپر دھوپ میں

ظلمتِ شب کے اسرار کھل جائیں گے
روشنی سے نگاہیں ہیں تر دھوپ میں

ایک بے نام منزل کی خوشبو لیے
قافلوں کا ہے جاری سفر دھوپ میں

ہو مبارک تمھیں چاندنی کا محل
ہم نے شاہینؔ بنایا ہے گھر دھوپ میں

(۱۹۷۹ء)

تم سمجھتے ہو جسے دنیا میاں
وہ تو ہے اک کانچ کی گڑیا میاں
خوب صورت بھی ہے نازک بھی بہت
زندگی ہے مثلِ آئینہ میاں
رات کے لشکر کو پسپا کر دیا
تھا ستارہ صبح کا تنہا میاں
سرد رُت میں کام آئے گا بہت
تم لگاتا دھوپ کا پودا میاں
اس کی ہر تعبیر الٹی ہو گئی
قوم نے دیکھا تھا جو سپنا میاں
یہ سدا دے گا مہک بارود کی
ہے بدیسی پھول کا پودا میاں
میں کبھی رکھتا نہیں شاہین بدر
بند اپنے دل کا دروازہ میاں
(۱۹۹۴ء)

یہ شہر کم نظراں ہے کدھر نکل آئے
یہ کس خیال میں گھر چھوڑ کر نکل آئے
چلے تھے فصلِ بہاراں کا لطف اٹھانے ہم
مگر نصیب میں سوکھے شجر نکل آئے
اٹھی وہ جبر کی آندھی کہ اب کے موسم میں
پرندے اڑنے کو بے بال و پر نکل آئے

جہاں ملے نہ لبِ خشک کو حیات کی بوند
قبیلے والے اسی راہ پر نکل آئے
دعائیں مانگی تھیں شاہین سبز موسم کی
یہ اور بات، شجر بے ثمر نکل آئے
(۱۹۹۴ء)

غریب شہر تھا، سورج نے سائبانی کی
مرے نصیب نے بھی مجھ پہ مہربانی کی
شکستہ برگ کی صورت بھٹکتا رہتا ہوں
ہوائیں تند ہیں صحرائے زندگانی کی
میں ایک خوشبوئے آوارہ، میری چاہت میں
خزاں نے دل کے گلستاں میں حکمرانی کی
کسی بھی شاخ پہ ہم آشیاں بنا نہ سکے
ادا ہے شوخ بہت برقِ آسمانی کی
گھڑی گھڑی کے سفر میں تھی ہجرتوں کی تھکن
زہے نصیب کہ صحرا نے میزبانی کی
(۱۹۹۹ء)

دو نظمیں بطور نمونہ درج کی جاتی ہیں:

زندگی کا حاصل

ہرے گلستاں کے خواب دیکھے
تو زرد تعبیریں ہاتھ آئیں

طویل رستے پہ زندگی کے سفر کیا ہے
بہار میں بھی
شگفتگی کی بجائے بوجھل تھکن نے مجھ کو
قدم قدم پر گلے لگایا
میں ساعتوں کی حسین وادی سے جب بھی گزرا
اداس تنہائیاں ہی پائیں
مہکتی کلیوں کی مسکراہٹ سے
مجھ کو محرومیاں ملی ہیں
شگفتگی، تازگی کے موسم نے
خواہشوں کے شجر کو بے برگ و بار رکھا
گھڑی کی سوئی کی طرح میں نے
تمام عمر ایک دائرے میں سفر کیا ہے
میں حاصلِ زندگی کو اپنے
عذاب سمجھوں کہ خواب سمجھوں

(۱۹۹۳ء)

زرد موسم کی ہوا

گلستاں ویران ہے
جل رہا ہے درد کا سورج جہنم کی طرح
سائے سائے کے لبوں پر پپڑیاں
نرگسی آنکھوں میں آنسو بھی نہیں

گل پہ شبنم بھی نہیں
کوئی دریا بھی نہیں، رحمت کا بادل بھی نہیں
کانپتی سوکھی زباں ہر پھول کی
آتشیں پیرہن دھوپ ہے کاڑھے ہوئے
ہر طرف آسیب ہیں
آرزوؤں کی حسیں نازک کلی
آگ میں کافور بن کر رہ گئی
وقت کی تپتی ہوئی اس خاک پر
خشک پتوں کا جنازہ دوش پر اپنے لیے
ہر شجر حیران ہے
گلستاں ویران ہے
چل رہی ہے زرد موسم کی ہوا

(۱۹۷۵ء)

شاہین بدر مرحوم نے اپنا دوسرا مجموعہ بھی مرتب کر لیا تھا لیکن اس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ مرحوم ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ مضامین اور تبصرے وغیرہ لکھتے رہتے تھے۔ صحافت سے بھی دلچسپی تھی۔ آخر میں کتابی سلسلہ "خیال" سے منسلک تھے۔

❖❖

شاہین

(جدت پسند شاعر، ماہر شماریات)

سوانحی خاکہ

نام: سید ولی عالم

قلمی نام: شاہین (پہلے شاہین غازی پوری)

سالِ پیدائش: ۱۹۳۸ء

مقامِ پیدائش: موضع غازی پور، ضلع مونگیر (بہار)

تعلیم: ایم۔ ایس۔ سی (شماریات)، بہار یونیورسٹی۔ ۱۹۶۰ء

پہلا پیشہ: درس و تدریس۔ مارواڑی کالج، بھاگلپور (بہار)

پہلی ہجرت: ۱۹۶۳ء۔ ڈھاکا

دوسرا پیشہ: ملازمت، بحیثیت ماہر شماریات

دوسری ہجرت: ۱۹۷۱ء سقوطِ ڈھاکا سے چند ماہ قبل۔ کراچی

تیسری ہجرت: ۱۹۷۳ء کناڈا (گزشتہ ۳۸ سال سے وہیں مقیم ہیں)

اولاد: دو بیٹے، دو بیٹیاں

سید ولی عالم شاہین ڈھاکے کی محفلِ شعر و ادب میں تاخیر سے پہنچے لیکن اپنے جدید طرزِ اظہار کی شاعری، مشاعروں کی شرکت اور خوش اخلاقی کی وجہ سے بہت جلد ڈھاکے کے ادبی حلقوں

گُل پہ شبنم بھی نہیں
کوئی دریا بھی نہیں، رحمت کا بادل بھی نہیں
کانچی سوکھی زباں ہر پھول کی
آتشیں پھن دھوپ ہے کاڑھے ہوئے
ہر طرف آسیب ہیں
آرزوؤں کی حسیں نازک کلی
آگ میں کافور بن کر رہ گئی
وقت کی تپتی ہوئی اس خاک پر
خشک پتوں کا جنازہ دوش پر اپنے لیے
ہر شجر حیران ہے
گلستاں ویران ہے
چل رہی ہے زرد موسم کی ہوا

(۱۹۷۵ء)

شاہین بدر مرحوم نے اپنا دوسرا مجموعہ بھی مرتب کر لیا تھا لیکن اس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ مرحوم ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ مضامین اور تبصرے وغیرہ لکھتے رہتے تھے۔ صحافت سے بھی دلچسپی تھی۔ آخر میں کتابی سلسلہ "خیال" سے منسلک تھے۔

❖❖

شاہین

(جدت پسند شاعر، ماہرِ شماریات)

سوانحی خاکہ

نام: سیّد ولی عالم

قلمی نام: شاہین (پہلے شاہین غازی پوری)

سالِ پیدائش: ۱۹۳۸ء

مقامِ پیدائش: موضع غازی پور، ضلع مونگیر (بہار)

تعلیم: ایم۔ایس۔سی (شماریات)، بہار یونیورسٹی۔۱۹۶۰ء

پہلا پیشہ: درس و تدریس۔ مارواڑی کالج، بھاگلپور (بہار)

پہلی ہجرت: ۱۹۶۳ء۔ ڈھاکا

دوسرا پیشہ: ملازمت، بحیثیت ماہرِ شماریات

دوسری ہجرت: ۱۹۷۱ء سقوطِ ڈھاکا سے چند ماہ قبل۔ کراچی

تیسری ہجرت: ۱۹۷۳ء کناڈا (گزشتہ ۳۸ سال سے وہیں مقیم ہیں)

اولاد: دو بیٹے، دو بیٹیاں

سیّد ولی عالم شاہین ڈھاکے کی محفلِ شعر و ادب میں تاخیر سے پہنچے لیکن اپنے جدید طرزِ اظہار کی شاعری، مشاعروں کی شرکت اور خوش اخلاقی کی وجہ سے بہت جلد ڈھاکے کے ادبی حلقوں

میں معروف ہو گئے۔ ۱۹۶۷ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ "رگِ ساز" ڈھاکے سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کی بڑی پذیرائی ہوئی۔

اُردو کے مشہور و معروف جدید شاعر اور جدید شاعری اور افسانہ نگاری کے ناقد صبا اکرام جو ۱۹۶۵ء میں ڈھاکا پہنچے، ڈھاکا کی محفلِ شعر و ادب کے آخری دور کی یاد تازہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شاہین صاحب سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں سنہ ساٹھ کی دہائی میں ڈھاکا پہنچا۔ وہ چند سال قبل وہاں آ چکے تھے اور کچھ عرصہ پاکستان ٹی بورڈ میں ماہرِ شماریات کی حیثیت سے ملازمت کے بعد آدم جی گروپ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی تو یوں لگا کہ ہم لوگ مدتوں سے دوست رہے ہیں۔ دراصل گاہے بگاہے وہ بھی میری چیزیں رسالوں میں پڑھتے رہے تھے۔ کچھ ہی ماہ بعد محمود واجد بھی اپنی فیملی کے ہمراہ وہاں آ گئے۔ چونکہ تینوں کا قیام ایک ہی محلہ محمد پور میں تھا، لہٰذا ہماری شامیں اکثر ساتھ ہی گزرنے لگیں۔ ہلال جعفری (مرحوم) بھی اتوار کو اُدھر آ جایا کرتے تھے۔ ہمارے درمیان ادبی موضوعات اور ہند و پاک کے ادبی رسالوں کے بارے میں دیر تک گفتگو ہوتی رہتی۔ یہ بیٹھکیں زیادہ تر شاہین صاحب کی رہائش گاہ پر ہی ہوتی تھیں۔

"جب ہمارا حلقۂ ادب کچھ اور وسیع ہوا تو ہم لوگوں نے سوچا کہ کیوں نہ جدید سوچ رکھنے والے ادیبوں شاعروں کی ایک انجمن بنائی جائے۔ اور 'ادبی مرکز' کے نام سے ایک ادبی انجمن کا قیام عمل میں آیا۔ جس کا صدر شاہین صاحب کو بنایا گیا اور جب تک مشرقی پاکستان قائم رہا وہی اس عہدے پر فائز رہے۔ اس کے نائب صدر محمود واجد، جنرل سکریٹری اور خازن ہلال جعفری (مرحوم) بنائے گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے جدید لکھنے والوں کی ایک کہکشاں اس پلیٹ فارم پر جمع ہو گئی۔ اراکین میں انیس صدیقی، شبنم

یزدانی، فہیم احمد فہمی، اعجاز احمد اعجاز اور محبوب شیدائی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بعد میں پٹنہ سے نورالہدیٰ سید بھی وہاں آ گئے اور وہ بھی 'ادبی مرکز' کی نشستوں میں شرکت کرنے لگے۔ پروفیسر نظیر صدیقی، شہزاد منظر اور معروف اسکالر اور ڈھاکا میں روزنامہ 'جنگ' کے نمائندہ وحید قیصر ندوی بھی اکثر ادبی مرکز کی نشستوں میں شریک ہوتے۔

''انہدامِ ڈھاکا سے چند ماہ قبل شاہین صاحب کراچی آ گئے تھے۔ تھوڑے دنوں بعد چند اور دوست براہ کھٹمنڈو یہاں پہنچے تو ان کی سربراہی میں محمود واجد، شاہد کامرانی، علی حیدر ملک اور اے خیام وغیرہ نے 'انجمن جدید مصنفین پاکستان' کی بنیاد ڈالی......... شاہین صاحب کچھ عرصہ بعد ہی مناپلی کنٹرول اتھارٹی میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر (شماریات) کی حیثیت سے تقرری کے بعد اسلام آباد جا بسے اور جب میں اکتوبر ۱۹۷۳ء میں جنگی قیدیوں کے کیمپ میں دو سال کی قید جھیل کر کراچی پہنچا تو پتا چلا کہ اب وہ کناڈا جا بسے ہیں۔ پہلے تو وہ وہاں کناڈا پوسٹ ڈیپارٹمنٹ آٹوا میں مالیاتی تجزیہ کار کے طور پر اپنی ذمہ داری نبھاتے رہے، پھر ٹرانسپورٹ کناڈا میں ریلوے پالیسی اینڈ کانسٹنگ ایڈوائزر جیسے اعلیٰ عہدے پر فائز ہو گئے اور یہیں سے انھوں نے چند سال پہلے قبل از وقت ریٹائرمنٹ حاصل کر کے کل وقتی شاعر و ادیب کے طور پر تخلیقی اور تنقیدی کاموں میں مصروف ہیں۔ ابھی حال ہی میں انھیں ہندی اُردو ساہتیہ اکیڈمی، لکھنؤ (بھارت) نے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا ہے۔

(''پشتارہ'' ۔ دیباچہ: صبا اکرام ۔ ص: ۳۰، ۳۱)

چالیس سال گزرنے کے باوجود شاہین ڈھاکا کو نہیں بھولے۔ دیکھیے وہ کتنی محبت سے یاد کرتے ہیں:

جہانگیر نگر

میرے ڈھاکا مرا سورج مرا بادل، ہے تو

کرب کی رات میں یہ صبحِ دل آرام تری
سایۂ گل میں اُترتی ہوئی یہ شام تری
گرم دوپہروں میں برسات کی جل تھل ہے تو

روپ تیرا ہے کسی خواب مجسم کی طرح
سادگی تیری ترے بیت مکرم کی طرح
چشمِ فطرت میں مچلتا ہوا کاجل ہے تو

سجدوں پر تری رحمت کی جبیں جھکتی ہے
گردشِ دہر کہیں اور کہاں رکتی ہے!
مسکنِ حور و فرشتہ سے بھی افضل ہے تو

حق و انصاف فضاؤں میں رقم ہوں جیسے
بادباں تیرے رسولوں کے علم ہوں جیسے
اپنے دریاؤں کے طوفان کی ہلچل ہے تو

جان سے اپنی ہے محبوب مجھے جان تری
چاہنے والے ترے رکھتے ہیں پہچان تری
اپنے ہی دیس میں کھویا ہوا بھاول ہے تو

ظلم اور جبر کا شب رنگ پھریرا کیا ہے
تیری آنکھوں میں ہے سورج تو اندھیرا کیا ہے
صبح کے پاؤں میں بجتی ہوئی چھاگل ہے تو
("پشتارہ")

شاہین کے اب تک پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں:

۱۔"رنگِ ساز" (۱۹۶۷ء۔ڈھاکا)

۲۔"بے نشاں" (۱۹۸۴ء۔کراچی)

۳۔"دہلیز پر پھول" (نئی غزلیں، ۲۰۰۵ء۔کراچی)

۴۔"کھلا دروازہ" (۲۰۰۹ء۔دلی)

۵۔"پشتارہ" (۲۰۱۰ء۔کراچی)

شاہین جدید انداز کے ایک اچھے اور طرح دار غزل گو بھی ہیں۔ایک غزل دیکھیے:

جہاں میں بارِ سخن اس طرح اٹھا کے چلے
نہ حرف آیا سخن پر نہ سر جھکا کے چلے
ہمیں اگر نظر انداز کر گئی دنیا
تو کیا کہ ہم بھی تو دامن ذرا بچا کے چلے
قدم جے بھی نہ تھے اور زمیں کھسک بھی گئی
تو پھر تلاش میں کیوں اپنے نقشِ پا کے چلے
ہوائیں تیز تھیں لیکن ہوا نہ لگنے دی
سحر ہوئی تو چراغوں کو خود بجھا کے چلے
بسی ہے رات کی رانی میں لانگ کی مہک
نسیم صبح جو آئے دوئی مٹا کے چلے

اب آخر میں ایک چھوٹی سی نظم "خوش خبری" دیکھیے جس میں ایک جہانِ معنی پوشیدہ ہے:

میرے اور تمھارے پاس
کچھ بھی نہیں
کہ میں تم کو
اور تم مجھ کو دے پاؤ
جو کچھ تھا سب بانٹ چکے
رہ گئے باقی ہم دونوں
سو ہم دونوں اب ایک

("اشارہ")

شاہین گزشتہ ۲۸ سال سے کناڈا میں مقیم ہیں۔ ان کی شاعری اب تک جاری اور ارتقا پذیر ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں اور غزلوں کے انگریزی میں ترجمے بھی کیے جو کناڈا کے موقر جرائد میں شائع ہوئے اور انھیں منتخب نظموں کے مجموعوں میں بھی شامل کیا گیا۔ شاہین کا شمار کناڈا کی ممتاز ادبی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔

شاہین ایک اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ انھوں نے اُردو اور انگریزی میں بہت سے ادبی اور تنقیدی مضامین بھی لکھے۔

❖❖

پروفیسر افتخار اجمل شاہین

(شاعر و ناقد)

سوانحی خاکہ

نام: افتخار اجمل

تخلص: شاہین

تاریخ پیدائش: ۱۰ر فروری ۱۹۴۱ء

جائے پیدائش: شیخپورہ (بہار)

تعلیم: بی۔ اے آنرز (فارسی)، ایم۔ اے (فارسی)، ایم۔ اے (اردو)

سی۔ ٹی، بی ایڈ، ایچ۔ ایم۔ ایس

پیشہ: درس و تدریس

پہلی ہجرت: ۱۹۶۲ء۔ ڈھاکا۔ مشرقی پاکستان

دوسری ہجرت: سقوطِ ڈھاکا کے بعد۔ کراچی

وفات: ۱۱ر مارچ ۲۰۱۱ء

اولاد: دو بیٹے

تصانیف: ۱۔ عقیدت کا سفر (حمد، نعت، منقبت)۔ ۲۰۰۴ء

۲۔ شاعری کا سفر (غزلیں)۔ ۲۰۰۵ء

۳۔ رنگ و بو کا سفر (نظمیں)۔۲۰۰۶ء

۴۔ آگہی کا سفر (تنقیدی مضامین)۔۲۰۰۷ء

۵۔ آگہی کا سفر (حصہ دوم)۔۲۰۰۹ء

۶۔ اُردو افسانہ اور چند افسانہ نگار۔۲۰۱۰ء

پروفیسر افتخار اجمل شاہین سابق مشرقی پاکستان کے معروف شاعر و ناقد تھے۔ ان کی شاعری، تنقید نگاری اور افسانہ نگاری کا آغاز دراصل ڈھاکے سے ہوا۔ ان کے مضامین اور غزلیں وغیرہ رسالوں میں برابر شائع ہوتی رہیں۔ وہ ادبی نشستوں اور مشاعروں میں بھی شریک ہوتے رہے۔ ملازمت کے سلسلے میں ان کا قیام کچھ عرصہ چاٹگام میں بھی رہا۔ ان کا تقرر گورنمنٹ کامرس کالج چاٹگام میں بحیثیت لیکچرر ہوا تھا۔ اس سے قبل وہ ڈھاکا کے ایک سرکاری اسکول میں ٹیچر تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ڈھاکا یونیورسٹی سے اُردو میں ایم۔اے کیا۔ وہ پٹنہ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔اے کر کے ڈھاکا آئے تھے۔ ڈھاکے ہی میں ان کی شادی ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں ہوئی۔ ان کی اہلیہ کے بھائی ڈھاکا ہائی کورٹ کے جج تھے۔ ان کی اہلیہ نے بھی ایم۔اے کیا تھا اور کسی پرائیوٹ اسکول میں پڑھاتی تھیں۔

شاہین صاحب کے تعلقات شروع سے وسیع رہے۔ لیکن ان میں کچھ تنک مزاجی بھی تھی جس کی وجہ سے وہ احباب سے اکثر ناراض ہو جاتے تھے۔ پڑھنے لکھنے کا شوق انھیں ہمیشہ رہا۔ اخباروں اور رسالوں میں بڑے تسلسل سے وہ لکھتے رہے۔ ان کی اہلیہ بڑی نیک خاتون تھیں، انھوں نے ہر حال میں ان کی دل جوئی کی۔ شاہین صاحب کی وفات سے چند سال پہلے ان کی وفات ہو گئی۔ ان کے دو بیٹے، جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اخلاق مند ہیں۔ شادی کے بعد امریکہ جا بسے۔ آخر میں شاہین صاحب بالکل تنہا ہو گئے تھے۔ گلستانِ جوہر کے ایک بڑے فلیٹ میں تنہا رہتے تھے۔ ایک ماسی آ کر کھانا پکا جاتی تھی۔ کار بھی تھی جس کا ڈرائیور پابندی سے ہر صبح پہنچ جاتا تھا۔ ۱۱ مارچ ۲۰۱۱ء کی رات انھیں شدید ڈائریا ہو گیا، گھر میں کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہ تھا، اسی حال میں انتقال کر گئے۔

اللہ مغفرت فرمائے!

شاعری

شاہین صاحب ایک اچھے شاعر تھے۔ غزل کی طرف رجحان زیادہ تھا۔ نظمیں کم لکھتے تھے اور زیادہ تر پابند نظمیں لکھتے تھے۔ بعد میں نعت گوئی کی طرف بھی مائل ہو گئے۔ غالباً جمیل عظیم آبادی مرحوم کے نعتیہ مشاعروں میں شرکت نے انھیں نعت گو بنا دیا تھا۔ سب سے پہلے انھوں نے اپنا نعتیہ مجموعہ ''عقیدت کا سفر'' شائع کیا جس میں چاروں خلفائے راشدینؓ کی منقبت بھی شامل ہے۔ میں نے اپنی مرتب کردہ کتاب ''منقبتِ صحابہ کرامؓ'' (مطبوعہ ''الرحمن پبلشنگ ٹرسٹ، رجسٹرڈ، کراچی) میں ان کی یہ چاروں منقبتیں شامل کر لی تھیں۔

شاہین صاحب کا دوسرا مجموعہ ''شاعری کا سفر'' غزلوں پر اور تیسرا مجموعہ ''رنگ و بو کا سفر'' نظموں پر مشتمل ہے۔ ذیل میں ان کی دو نظمیں اور غزلوں کے چند اشعار بہ طور نمونہ درج کیے جاتے ہیں:

ماں

ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے — اس کو حاصل یہ کتنی عظمت ہے
یہ خدا کی عجیب قدرت ہے — ماں کی صورت میں اس کی رحمت ہے
دکھ اٹھائے وہ سکھ ملے ہم کو — اس کی چاہت عجیب چاہت ہے
ماں کی نظرِ عنایت ہے مجھ پر — یہ عنایت بڑی غنیمت ہے
میرے بچوں سے پیار ہے اس کو — یہ بھی چاہت کی ایک صورت ہے
اس کا سایہ جو سر پہ قائم ہے — گھر میں اس سے ہی خیر و برکت ہے
سارے گھر کا خیال ہے اس کو — کس قدر گھر سے اس کو الفت ہے
وہ بہو کو سمجھتی ہے بیٹی — گھر کے ہر فرد سے محبت ہے

اس کا رکھنا خیال ہے لازم اس کی خدمت گزاری سُنّت ہے
ہو گئی ہے ضعیف ماں شاہیںؔ تم پہ واجب اب اس کی خدمت ہے
جسم پہ اس کے جھریاں ہیں جو ان سے ظاہر خدا کی آیت ہے
یہ سبق ہم نے ماں سے سیکھا ہے زندگی پیار سے عبارت ہے

بیادِ افسر ماہ پوری

(۱۹۱۸ء-۱۹۹۵ء)

شاعرِ با کمال تھے افسر آپ اپنی مثال تھے افسر
ان کی تحریر میں روانی تھی سادگی، حُسن، زندگانی تھی
نثر عمدہ حسین لکھتے تھے تبصرے بھی وہ خوب کرتے تھے
ان کی تنقید معتبر ٹھہری تھی ادب پہ نظر بہت گہری
لکھ گئے ہیں فسانے جو افسرؔ داد دیتے ہیں سب انھیں پڑھ کر
اس مہارت سے ترجمے کرتے ترجمے اصل کی طرح لگتے
کیا کہیں کیسے اپنے افسرؔ تھے علم و دانش کے ایک پیکر تھے
کتنے ہمدرد، با مروّت تھے وہ سراپا خلوص و شفقت تھے
ایسے انسان دیکھے ہیں کم تر جتنے روشن ضمیر تھے افسر
حمد کہتے تھے، نعت لکھتے تھے نامِ احمدؐ کا دم وہ بھرتے تھے
مغفرت ہو اسی وسیلے سے نعت گویوں کے تھے قبیلے سے

شاہین مرحوم کو اپنی پوتیوں سے بڑی محبت تھی۔ بچوں کی ایک نظم ”گھر کی رونق ہیں ہماری پوتیاں“ کے چند اشعار دیکھیے:

اچھی بچی اریبہ ہے یہ قدرت کا تحفہ ہے
میٹھی باتیں کہتی ہے ہنستی کھیلتی رہتی ہے
لاڈلی ہے وہ دادا کی دادی کو بھی ہے پیاری
باجی وہ رامین کی ہے اس سے کھیلتی رہتی ہے
اس سے شاد عدینہ بھی اسکی بھی ہے وہ باجی
امی ابو کی پیاری راج کماری ہے گھر کی

غزل کے اشعار

گرچہ مشکل ہے راستی کا سفر مجھ سے ہوگا نہ واپسی کا سفر
تم دیے سے دیا جلالینا! رکنے پائے نہ روشنی کا سفر
میرے بچے مرا تسلسل ہیں یوں بھی جاری ہے زندگی کا سفر
چھپ گئے ہیں بہت سفر نامے معتبر ہے کسی کسی کا سفر
علم وعرفاں کی ہے طلب جب تک ختم ہوگا نہ آگہی کا سفر
ہو کے مجبور گھر سے نکلے تھے یاد آتا ہے بے بسی کا سفر

وہ رونے لگے ہیں رُلانے لگے ہیں کہانی وہ اپنی سنانے لگے ہیں
حماقت بھی سرزد انھیں سے ہوئی ہے جو شاہیں بہت ہی سیانے لگے ہیں

سچ کی خوشبو نہ پھیلتی کب تک جھوٹ کو بے نقاب ہونا تھا
وہ ستارہ صفت تھا بچپن میں اس کو تو آفتاب ہونا تھا

بڑھ گئی ہے اب مری مصروفیت زندگی اب تو بہت آسان ہے
بے نیازانہ گزر جاتے ہیں وہ آشنا ہونے کی یہ پہچان ہے
جاگتی تھیں جس کی گلیاں رات بھر شام ہی سے شہر وہ سنسان ہے

کس قدر شاہینؔ ہے تسکینِ جاں ان کے ہونٹوں پر جو اک مسکان ہے

تبصرے اور تنقید

پروفیسر افتخار اجمل شاہینؔ نے تبصرے اور تنقیدی مضامین بہت لکھے۔ ان تبصروں اور مضامین کے تین مجموعے انھوں نے شائع کیے:

۱۔ آگہی کا سفر (تنقیدی مضامین)

یہ مجموعہ ۲۰۰۷ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ اس میں ۲۹ مضامین ہیں۔ یہ مجموعہ ۳۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے کو شاہین صاحب نے ''محققِ اعظم قاضی عبدالودود'' اور ''استادِ محترم ڈاکٹر عندلیب شادانی'' کے نام معنون کیا ہے۔ اس کتاب کے چند اہم مضامین یہ ہیں:

پہلا عظیم عوامی شاعر۔ محققِ اعظم قاضی عبدالودود۔ کلیم الدین احمد پر ایک نظر۔ حضرت عمر فاروقؓ کا شعری نظریہ۔ شاد عظیم آبادی شعر کے آئینے میں۔ علامہ جمیل مظہری۔ شخصیت اور فن۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی کی غزل گوئی۔ مولوی عبدالحق تحقیق کے آئینے میں اور بابائے اردو کی خاکہ نگاری وغیرہ۔

۲۔ آگہی کا سفر (حصہ دوم)

مضامین کا یہ مجموعہ ۲۰۰۹ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ کتاب ۴۲۴ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ۳۵ مضامین ہیں۔ چند اہم مضامین کے عنوان یہ ہیں:

بہادر شاہ ظفر، ان کی شخصیت اور شاعری۔ مرزا غالب کی مکتوب نگاری۔ علامہ اقبال، ایک نئی آواز۔ اکبر غزل کے آئینے میں۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی، تاثرات وارتسامات، پروفیسر ارشد کاکوی، پروفیسر نظیر صدیقی، کچھ یادیں کچھ باتیں۔ پروفیسر مظفر حسین رزمی اور جمیل یوسف، ایک منفرد شاعر وغیرہ۔

۳۔ اردو افسانہ اور چند افسانہ نگار

یہ کتاب شاہین صاحب کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو فنِ افسانہ نگاری اور بعض افسانہ

نگاروں پر لکھے گئے ہیں۔ یہ کتاب ۲۰۱۰ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ۲۱ مضامین ہیں۔ اس کے چند اہم عنوانات یہ ہیں:

اُردو افسانے پر ایک نظر۔ اُردو افسانے کا مستقبل۔ پاکستان میں اُردو افسانہ نگاری، ایک جائزہ۔ ابوالفضل صدیقی۔ قرۃ العین حیدر، ایک لیجنڈ۔ پریم چند، شکیل الرحمٰن کی نظر میں۔ ''بے انت سفر'' پر ایک نظر وغیرہ۔

اس میں شک نہیں کہ پروفیسر افتخار اجمل شاہین کا مطالعہ وسیع تھا۔ وہ بڑی توجہ اور محنت سے اپنے تنقیدی مضامین اور تبصرے لکھا کرتے تھے۔ مذکورہ بالا تینوں مجموعے اُردو تنقید میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔

❖❖

عشرت رومانی

(شاعر و مبصر)

سوانحی خاکہ

نام: سید محمد عشرت

قلمی نام: عشرت رومانی

والد کا نام: سید محمد عقیل

آبائی وطن: پٹنہ (بہار)

سال پیدائش: ۱۹۳۹ء

مقامِ پیدائش: چھپرا (بہار)

ابتدائی تعلیم: چھپرا، پٹنہ، کلکتہ

پہلی ہجرت: تقسیم کے بعد۔ ڈھاکا

تعلیم: بی۔ کام (ڈھاکا یونیورسٹی)

پیشہ: محاسب۔ ادبی صحافت

مختلف سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں کلیدی عہدوں پر خدمات انجام دیں۔ اس سلسلے میں ڈھاکا، واہ کینٹ، راولپنڈی، لاہور، کراچی اور مسقط میں قیام پذیر رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد مستقل قیام کراچی میں ہے۔

تصانیف:

۱۔صبح آنے کو ہے (شعری مجموعہ) ۲۰۰۰ء

۲۔شعورِ عصر (مضامین) ۲۰۰۲ء

۳۔چند ہم عصر افسانہ نگار (مضامین) ۲۰۰۴ء

۴۔مقصدی شاعری۔ایک جائزہ (تحقیق)۔۲۰۰۷ء

اولاد: ایک بیٹا۔ایک بیٹی

"صبح آنے کو ہے"

عشرت رومانی ایک اچھے اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔وہ گزشتہ پچاس سال سے شعر کہہ رہے ہیں۔ان کا شعری مجموعہ ۲۷۲ صفحات پر مشتمل ہے جس میں غزلیں، نظمیں، گیت اور تراجم شامل ہیں۔عشرت صاحب انگریزی میں بھی نظمیں لکھتے ہیں جن میں سے چند نظموں کے تراجم بھی شامل کیے گئے ہیں۔

عشرت صاحب کو زبان و بیان پر عبور حاصل ہے۔خیالات میں سادگی، پاکیزگی اور تازگی ہے۔کلام معیاری ہے اور لطف و اثر کی بھی کمی نہیں۔ایک حمد اور غزلوں کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں:

حمد

یہ ارض و سما یہ شمس و قمر، سب تیرے ہیں ہم تیرے ہیں

ہے نور کا عالم شام و سحر، سب تیرے ہیں ہم تیرے ہیں

اس عالمِ امکاں میں مالک ہر لمحہ گلابوں کی بارش

ہر لمحہ یہاں خوشبو کے سفر، سب تیرے ہیں ہم تیرے ہیں

دھڑکن میں تو، سانسوں میں تو، پلکوں پر تو، خوابوں میں تو
اک وجد کا عالم شام و سحر، سب تیرے ہیں ہم تیرے ہیں
اس عالمِ ہستی کے قیدی پر لمحہ اجل سے کہتے ہیں
یہ قید ہے قیدِ حسن و نظر، سب تیرے ہیں ہم تیرے ہیں
اقلیمِ سخن کی دولت دے، افکار کو وسعت مل جائے
الفاظ و معنی کے پیکر سب تیرے ہیں ہم تیرے ہیں

راستے سو گئے، سو گئی ہر گلی، رات جانے کو ہے صبح آنے کو ہے
چاند ڈھلنے لگا تھک گئی چاندنی رات جانے کو ہے صبح آنے کو ہے
شاخ در شاخ جگنو چمکنے لگے شہر در شہر یادوں کی شمعیں جلیں
پھر اشارا ہوا کوئی کھڑکی کھلی رات جانے کو ہے صبح آنے کو ہے
فکر و احساس کی زرفشاں تتلیاں وقت کی دھند میں پر لگا کر اڑیں
گل بداماں ہوئی ذہن کی روشنی، رات جانے کو ہے صبح آنے کو ہے
سوچ کی جھیل میں اک پرندہ گرا خواب تھرا گئے اک دھماکا ہوا
لڑکھڑانے لگی ہر طرف تیرگی، رات جانے کو ہے صبح آنے کو ہے
وقت کی شاخ سے ہم ہیں ٹوٹے ہوئے رشتۂ جسم و جاں لے کے آہی گئے
قافلے چل پڑے جیسے گھنٹی بجی رات جانے کو ہے صبح آنے کو ہے

آوارگی رنگ ہے خوابوں کی طرح ہے
وہ شخص، شفق رنگ گلابوں کی طرح ہے
ہر موڑ پہ ملتے ہیں بچھڑ جاتے ہیں سارے
ہستی کی ہر اک موج، حبابوں کی طرح ہے

اس دور میں چہروں پہ لکھے رہتے ہیں حالات
ہر شخص یہاں جیسے کتابوں کی طرح ہے

راستے گم ہوئے دھندلا گئے سائے جیسے
شہر در شہر کوئی خاک اُڑائے جیسے
دف بجاتی ہے سرِ شام ہوا جنگل میں
برگِ گل رقص کرے گیت سنائے جیسے
پھر وہی موڑ ہے بچھڑی تھی جہاں شامِ وصال
پھر وہی دستِ صبا کوئی بلائے جیسے
پھیل جاتا ہے نگاہوں میں وفا کا کاجل
سرمئی شام کوئی یاد دلائے جیسے

عشرت رومانی ایک منفرد نظم نگار ہیں۔ انھوں نے آزاد نظمیں بھی کہی ہیں اور پابند بھی۔ ایک نظم دیکھیے:

چاند نگر تنہا ہے
(ابنِ انشا کی نذر)

گھپ اندھیرا ہے ہر اک چاند نگر تنہا ہے
تم نہ آئے ہو ابھی چاند کا گھر تنہا ہے
ہم بھی تنہا ہیں ابھی، دیدۂ تر تنہا ہے
کوئی جگنو بھی نہیں اپنا سفر تنہا ہے
دلِ وحشی بھی گیا، اس کی محبت بھی گئی
اب یہاں کوئی نہیں دیکھو گھر تنہا ہے

موج گل پھر کسی عنواں سے وہاں جائے گی
سو گئے خواب جہاں ذوقِ نظر تنہا ہے
اب تو آ جاؤ کہ جاگی ہے ہر اک موجِ بلا
ساحلِ دل پہ ہر اک ریت کا گھر تنہا ہے

''مقصدی شاعری۔ ایک جائزہ''

عشرت رومانی ایک ممتاز محقق و ناقد بھی ہیں۔ ان کی اب تک تین نثری کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ ''مقصدی شاعری۔ ایک جائزہ'' ۶۷۸ صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے جو ۲۰۰۷ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں مقصدی شاعری کا جائزہ بڑی تفصیل سے لیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں جناب عقیل احمد فضا اعظمی کی شعری تخلیقات پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور ان کے محاسن بیان کیے گئے ہیں۔ ساری کتاب اور خاص طور پر اس کا پہلا حصہ غیر ضروری تفصیلات اور طویل اقتباسات سے بھرا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کو ضخیم سے ضخیم تر بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بہرحال شعر و شاعری سے متعلق اس کتاب میں اتنی مختلف اور متنوع معلومات جمع کر دی گئی ہیں کہ یہ کتاب ''شاعری کی انسائیکلوپیڈیا'' بن گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عشرت رومانی کا مطالعہ وسیع اور ان کی تحریری صلاحیت قابلِ تحسین ہے۔

''شعورِ عصر''

عشرت رومانی کی یہ کتاب پچاس شعری مجموعوں کے تبصروں پر مشتمل ہے۔ یہ تبصرے مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔

''چند ہم عصر افسانہ نگار''

۱۳۴ افسانہ نگاروں کے افسانوی مجموعوں پر عشرت رومانی کے تبصروں کو جمع کر دیا گیا ہے۔

صبا اکرام

(شاعر و ناقد)

نام نجم الحق اور قلمی نام صبا اکرام۔ والد کا نام انعام الحق۔ ۲۸ رجون ۱۹۴۵ کو ہزاری باغ، بہار میں پیدا ہوئے۔ گریجویشن کرنے کے بعد ۱۹۶۵ء میں ڈھاکا آ گئے۔ یہاں سے ایم بی اے وغیرہ کے امتحانات پاس کیے اور ایک اچھے عہدے پر فائز ہو گئے۔ شادی کراچی پہنچنے (۱۹۷۳ء) کے بعد ہوئی۔

صبا اکرام ڈھاکا کی محفلِ شعر و ادب میں دیر سے پہنچنے والوں میں تھے۔ شاہین (مقیم کناڈا)، محمود واجد، ہلال جعفری مرحوم، شبنم یزدانی اور نورالہدیٰ سید وغیرہ ایک دو سال آگے پیچھے ڈھاکا پہنچے۔ محمد پور میں ان لوگوں کا قیام تھا اور وہاں ان کی ادبی نشستیں بڑی پابندی اور تسلسل سے ہوتی رہتی تھیں (اس کی ایک مختصر روداد صبا اکرام نے شاہین کے مجموعہ "پشتارہ" کے دیباچے میں لکھی ہے، جس کا اقتباس زیرِ نظر کتاب میں شاہین کے تذکرے میں دیکھا جا سکتا ہے)۔ یہ جدیدیت پسندوں کا گروپ تھا اور ادب میں جدید طرزِ اظہار کا علم بردار۔

صبا اکرام شاعر بھی ہیں اور نقاد و مبصر اور ادبی کالم نگار بھی۔ نظم و نثر دونوں اصناف پر انھیں عبور حاصل ہے۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد کراچی پہنچنے پر ان کی ادبی سرگرمیوں میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ اب تک ان کی نظم و نثر کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں:

صبا اکرام بڑے ذمہ دار، مخلص اور فرض شناس انسان ہیں۔ مضبوط اعصاب و ذہن کے

حامل ہیں۔ وہ ملازمت کے فرائض اور ادبی سرگرمیوں میں توازن برقرار رکھتے ہیں۔ انگریزی اخباروں میں ادبی کالم بھی لکھتے رہتے ہیں۔ گھریلو ذمہ داریوں اور اولاد کی تعلیم و تربیت سے بھی غفلت نہیں برتی۔ اولاد میں دو بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی اعلیٰ تعلیم یافتہ، شادی شدہ اور صاحب اولاد ہیں۔ دوسرا بیٹا ابھی حصولِ تعلیم میں مصروف ہے۔ بیٹا امریکہ میں ہے۔ صبا صاحب ریٹائر ہو چکے ہیں، کنٹریکٹ پر کام کر رہے ہیں۔

شاعری

صبا اکرام کے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''سورج کی صلیب'' ۱۹۸۱ء اور ''آئینے کا آدمی'' ۲۰۰۶ء۔ پہلے مجموعے میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ دوسرے مجموعے میں صرف نظمیں ہیں۔ صبا اکرام آزاد اور علامتی نظمیں لکھتے ہیں۔ انھیں ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی داد دی ہے اور شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی۔ ''سورج کی صلیب'' کا دیباچہ ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے اور ''آئینے کا آدمی'' کا دیباچہ شمس الرحمٰن فاروقی نے۔

فاروقی صاحب اپنے دیباچہ ''آئینے کا آدمی۔ ایک مختصر تاثر'' میں لکھتے ہیں:

''کتاب کے اندر جھانکیے تو ہمیں وہی صبا اکرام نظر آتے ہیں جنھوں نے اپنے نرم لب و لہجہ، متفکر ذہن اور دردمند دل کی وجہ سے نئی نظم کے میدان میں مدتوں پہلے اپنی جگہ بنائی تھی اور گزشتہ تین دہائیوں سے ان کا فن بتدریج ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا ہے۔ صبا اکرام نے عام لوگوں سے بہت زیادہ مختلف اور بہت زیادہ مصروف زندگی گزاری ہے۔ ہجرت کے دو تجربے اور دوسری ہجرت (بلکہ قید و سلاسل کے ساتھ غریب الوطنی) کے مصائب کے بعد اپنی اور اپنے متعلقین کی زندگی کو ازسرِ نو تعمیر کرنے کی کشمکش اور جدوجہد نئے ماحول کو اپنا بنانے کی سعی جو کبھی مشکور ہوتی ہے تو کبھی نامشکور ہوتی ہے۔ ان سب پیچیدگیوں نے ان کے شعر پر اپنے نشان چھوڑے ہیں۔''

(''آئینے کا آدمی''۔ ص:۱۱،۱۲)

سقوطِ ڈھاکا کے بعد صبا اکرام جنگی قیدیوں میں شامل ہو گئے۔ دو سال بھارت کی قید میں رہنے کے بعد ۱۹۷۳ء میں کراچی پہنچے۔ قیدیوں کے کیمپ میں ۱۹۷۲ء میں پہلی عید کے موقع پر ان کی نظم دیکھیے:

جنگی قیدیوں کے کیمپ میں ایک عید

صبح کی شبنمی بوند
احساس کی جب زبانوں پہ ٹپکی
تو کڑواہٹوں کی سیہ چیونٹیاں
جسم کی ہڈیوں کی سرنگوں میں دوڑیں
تعفن زدہ حادثے کی
وہ اک خوں کشیدہ کہانی
جو ہم اپنے جلتے ہوئے گھر کی دیوار پر
لکھ کے مجرم ہوئے
آج ہر شبد اس کا
مرے دل پہ
تیزاب کی بوند کی طرح ٹپکا
دھواں کرب کا
میرے چہرے پہ
کالک کا خط کھینچ کر
ہنس پڑا
ایک دن اور محشر کا
کالی کتابوں میں لکھا گیا (۱۹۷۲ء)

صبا اکرام کے مجموعے "سورج کی صلیب" میں ان کی غزلیں بھی شامل ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

ہوا نصیب بنایا، سفر لکھا اُس نے
تمام عمر پھروں دربدر لکھا اُس نے
سُلگتی دھوپ کی مانند زیست دی لیکن
نہ سائبان، نہ کوئی شجر لکھا اُس نے
یہ اور بات کہ عنواں بنا دیا مجھ کو
غموں کے قصّے کا اک اک سطر لکھا اُس نے

☆☆☆☆☆

دشتِ احساس میں ہم اتنے اکیلے کب تھے
دکھ تو پہلے بھی تھے پر اتنے گھنیرے کب تھے
ہم تو نکلے تھے ہواؤں کا مقدر لے کر
ہم کسی موڑ پہ دم لینے کو ٹھہرے کب تھے
بغض کی دھوپ سے ہم بھاگ کے جاتے تو کہاں
شہرِ احباب میں وا دل کے دریچے کب تھے

☆☆☆☆☆

وقت کے دشت میں چونکے ہوئے آہو کی طرح
ہم پریشان ازل سے رہے خوشبو کی طرح
بند دروازوں کے اندر جو ہوئی تھی اک بات
شہر میں پھیل گئی پھول کی خوشبو کی طرح
شب کی تنہائی میں نغمہ سا بکھر جاتا ہے
سوکھے پتوں میں اک آواز ہے گھنگھرو کی طرح

میں ہونٹوں کے نگر میں تلاش کرتا ہوں
وہ سوندھی باس جو مٹی کے برتنوں میں ہے

☆☆☆☆☆

احساسِ خود فریبی ہے کس درجہ کامراں
ہم خود سے کہہ رہے ہیں کہ جھوٹے ہیں آئینے

تنقید

صبا اکرام ایک اچھے نثر نگار اور ناقد بھی ہیں۔ ''آئینے کا آدمی'' میں ''جدید نظم کا سفر'' کے عنوان سے انھوں نے جو طویل مضمون لکھا ہے وہ ان کی نثر نگاری کا بہت اچھا نمونہ ہے۔

صبا اکرام نے جدید افسانوں کے ناقد کی حیثیت سے ایک امتیاز حاصل کیا ہے۔ ان کی کتاب ''جدید افسانہ۔ چند صورتیں'' (فکشن کی تنقید) کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ اس سے پہلے وہ ایک کتاب ''شہزاد منظر۔ فن اور شخصیت'' پروفیسر علی حیدر ملک کے اشتراک سے لکھ چکے تھے۔

''جدید افسانہ۔ چند صورتیں'' (مطبوعہ ۲۰۰۱ء) ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے جس میں نو نظریاتی مضامین اور چار جدید افسانہ نگاروں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ عنوانات حسب ذیل ہیں:

جدید افسانے کی کہانی۔ جدید افسانہ اور ہجرت کا مسئلہ۔ جدید افسانہ اور کھوئی ہوئی پہچان۔ جدید افسانہ اور روحِ عصر۔ جدید افسانہ اور عدم تحفظ کا احساس۔ جدید افسانہ اور معاشرتی مسائل۔ جدید افسانہ اور حاشیے کا آدمی۔ علامتی افسانہ میں ابلاغ کی صورتیں۔ عصری اردو افسانہ۔

تجزیاتی مطالعہ

''جوگندر پال۔ ہر عہد کے ساتھ، ہر عہد سے الگ۔'' ''علی حیدر ملک کے افسانہ: علامت نگاری۔'' ''اے خیام کا افسانوی مجموعہ ''کپل وستو کا شہزادہ''۔'' ''فر

کے افسانے، ایک ڈائمنشن۔"

اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

"جدید افسانہ۔ چند صورتیں" صبا اکرام کے محنت سے لکھے ہوئے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں جدید افسانے کے مختلف اور نئے پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مضامین پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ صبا اکرام صاف ذہن کے مالک ہیں اور اپنی بات بخوبی کہنا جانتے ہیں۔ جدید افسانہ صبا اکرام کا عشق ہے۔ یہ مضامین لکھ کر انھوں نے نہ صرف اپنے موضوع سے انصاف کیا ہے بلکہ اس موضوع کے تعلق سے دوسروں کے لیے بھی نئے راستے کھولے ہیں۔ ان مضامین کے مطالعہ سے پڑھنے والوں کے علم، شعور اور آگہی میں اضافہ ہوتا ہے۔ جدید افسانے کی تنقید پر ایسی اچھی کتاب لکھنے پر انھیں دلی مبارک باد دیتا ہوں۔"

شفیق احمد شفیق

(ایک باحوصلہ ادیب وشاعر)

نام شفیق احمد اور قلمی نام شفیق احمد شفیق ہے۔ والد کا نام عبدالرشید (مرحوم)۔ ۶ر جولائی ۱۹۳۹ء (غالباً میٹرک سرٹیفیکیٹ کے مطابق) کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں والدین اور گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ ڈھاکا پہنچے۔ یہاں انجمن بوائز ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ روزنامہ ''پاسبان''، روزنامہ ''ہماری آواز'' اور روزنامہ ''وطن'' میں کام کرتے رہے۔ اس دور میں وہ بہت فعال رہے۔ ملازمت کے علاوہ شعروشاعری، مضمون نگاری اور افسانہ نگاری بھی کرتے رہے۔ اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ انٹر اور بی۔ اے کے امتحانات بھی پاس کیے۔ ہفت روزہ ''جریدہ'' ڈھاکا میں ''بنگال کے اُردو فن کار'' کے زیرِ عنوان ہر ہفتہ کسی ادیب یا شاعر پر مضمون لکھتے رہے۔ یہ سلسلہ تقریباً سات آٹھ ماہ ہی چلا تھا کہ سقوطِ ڈھاکا کا المیہ رونما ہو گیا اور یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

سقوطِ ڈھاکا کے چند سال بعد غالباً ۱۹۷۴ء میں شفیق کراچی آ گئے۔ یہاں ان کی علمی اور ادبی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ سندھ یونیورسٹی سے اُردو میں ایم۔ اے اور بی۔ ایڈ کیا۔ ایک انگریزی اخبار ''بزنس ریکارڈر'' میں ملازمت کر لی اور ایک اسکول میں پڑھانے بھی لگے۔ ۱۹۷۷ء میں ان کی شادی ہو گئی۔

حوصلہ مند ادیب

شفیق احمد شفیق نے اپنی دنیا آپ پیدا کی ہے۔ سابق مشرقی پاکستان کے ادیبوں میں دو ادیب اس لحاظ سے بہت نمایاں ہیں، جنھوں نے اپنے کیریر کو بنانے اور علم وادب میں نام اور مقام پیدا کرنے کے لیے انتھک محنت اور مسلسل تگ ودو کی۔ ایک پروفیسر نظیر صدیقی مرحوم، دوسرے شفیق احمد شفیق۔ شفیق کا تعلق ایک نچلے متوسط گھرانے سے ہے۔ اسکول میں تھے کہ ادبی ذوق اور لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ شاعری، مضمون نگاری اور افسانہ نگاری بھی جاری رہی۔ حصولِ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ان جیسے محنتی اور فعال ادیب بہت کم دیکھے گئے ہیں۔

شفیق شروع ہی سے پروفیسر اظہر قادری کے حلقے میں شامل رہے۔ یہ حلقہ زیادہ تر ترقی پسند حضرات پر مشتمل تھا۔ لہٰذا شفیق بھی ترقی پسند تحریک کے ہم نوا ہو گئے۔

شفیق کی ادبی لحاظ سے دو نمایاں حیثیتیں ہیں۔ یعنی شاعر اور تنقید نگار۔ ذیل میں ان کی شاعری اور تنقید نگاری پر ایک نظر ڈالی جاتی ہے۔

شاعری

شفیق احمد شفیق نے بہت کم عمری ہی میں شاعری شروع کر دی۔ پہلے پروفیسر اظہر قادری کو اپنا کلام دکھایا، اس کے بعد علامہ آصف بنارسی سے اصلاح لینے لگے اور بہت جلد ایک شاعر کی حیثیت سے نمایاں ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک فطری شاعر ہیں اور ان کے کلام میں ایک خاص انفرادیت ہے۔ انھیں غزل گوئی سے زیادہ دلچسپی ہے۔ نظمیں کم کہتے ہیں اور وہ بھی صرف آزاد۔

شفیق کا شعری مجموعہ ”پس لفظ آئینہ“ ۱۹۹۸ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس میں جوگندر پال، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر علیم اللہ حالی اور ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کی تقریظیں شامل ہیں۔ اس مجموعے

میں ۱۸ نظمیں، ۳۰ گیت، ۴۲ غزلیں اور ۸ قطعات ہیں۔ صفحات ۱۴۴۔ شاعر نے بھی ''عرضِ حال'' کے عنوان سے ایک دیباچہ لکھا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

''میں پوری شاعری کو بلکہ پورے ادب کو زندگی کا مظہر اور آئینہ دار تصور کرتا ہوں۔ زندگی کی گہما گہمی آدمی کے اندر بھی ہے اور باہر بھی۔ یہ دونوں خطے اپنی فطرت اور غایت میں تنوع، تازگی اور رنگارنگی کے حامل ہیں۔ زندگی کے عکس و نقش پیش کرنے میں فن کار کے داخلی اور خارجی دونوں خطے بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔''

ذیل میں ان کی غزلوں کے چند منتخب اشعار درج کیے جاتے ہیں۔

منتخب اشعار:

تمھارا قرب تو ساون ہے پت جھڑی میں بھی
کہ انگ انگ مرا بھیگ بھیگ جاتا ہے

ترا جمال ہے، تو ہے کہ چاہ ہے تیری
یہ کس کا کیف و اثر دل پہ چھائے جاتا ہے

تو میری فکر نہ کر یوں نہ آبدیدہ ہو
مجھے جدائی کا موسم بھی راس آتا ہے

تمھارے پیار کے پھولوں کی اوڑھ لی ہے ردا
کوئی بھی رُت ہو مرا جسم لہلہاتا ہے

صدف میں دل کے شفیقؔ اس کی چاہ کا گوہر
سحر ہو، شام ہو، ہر وقت جگمگاتا ہے

☆☆☆☆☆

کسی کا دل نہ دکھے تم یہ دھیان میں رکھنا
مٹھاس لہجے میں، نرمی زبان میں رکھنا

ترا قبیلہ بڑی مشکلوں سے جاگے گا
شفیق روحِ بلالی اذان میں رکھنا

میں ابتدا ہوں نہ انتہا ہوں
میں مرکزِ چشمِ کبریا ہوں
گلاب ہوں اک ریاضِ فن کا
میں زلفِ گیتی پہ سج گیا ہوں

میرے اندر کی شکست و ریخت حیرانی میں ہے
قوتِ تعمیر مجھ میں کیسے آ جاتی ہے روز
☆☆☆☆☆
مجھ کو عقیدتوں کے دریچے سے یوں نہ دیکھ
ایسا نہ ہو کہ بعد میں تجھ کو خدا لگوں
☆☆☆☆☆
باطن میں غیریت کے بڑے جنگلات تھے
ظاہر میں وہ بڑا ہی محبت مآب تھا
☆☆☆☆☆
قریہ قریہ، کوچہ کوچہ وادی وادی شفیق
اس کے نام کا چرچا کرنا اچھا لگتا ہے
☆☆☆☆☆
میں ریزہ ریزہ ہوا کیوں، بکھر گیا کیسے
یہ بات کس کو بتاتا، یہ بات سنتا کون
ہمیں تو جان سے زیادہ ترا بھرم تھا عزیز
جو شاخِ دار پہ سجتے نہ ہم تو سجتا کون

روشنی قلب و نظر کی، تازگی احساس کی
فکر و فن کی راہ میں لٹتا ہے سرمایہ بہت
آج بھی کنجشک پہ شاہیں جھپٹتے ہیں شفیق
ہیں فضا میں ناتواں اب بھی فرومایہ بہت

☆☆☆☆☆

اس شہر کے نوخیزوں کی قسمت کو نہ پوچھو
اپنوں سے جدا ہو گئے اور خواب ہوا گھر
ہر دور میں ہجرت کے عذاب اترے ہیں ہم پر
ہم خانہ خرابوں کا بدلتا ہی رہا گھر
اڑ جائے گی اک روز پرندے کی طرح جان
مل جائے گا مٹی میں یہ مٹی کا بنا گھر

نظم

لمحۂ جاں سوز

جھیل میں احساس کی ہیں تیری یادوں کے کنول
آئینے میں فکر کے ہیں خد و خالِ دل نشیں
اور مشامِ جاں میں ہے دستِ حنائی کی مہک
دشتِ افکار و تصور کا سفر
ہجر کے شعلہ فشاں سورج تلے
کتنے دن جاری رہے
جسم ارمانوں کے
حسرت کے گلاب

لحۂ جاں سوز میں جلتے رہیں
ذات کا تنہا سفر
ہجر کا اندھا سفر کرتے رہیں

بالک ابھی اترا نہیں

برف کی صورت
فصیلِ لب پہ خاموشی کی تہہ
روز و شب جمتی رہی
ان کہی کی رسم پختہ تر ہوئی
لب کشائی کی تمنا
دشتِ امکاں کی طرف اٹھتا نہیں
مصلحت کی شیر خواری میں مگن
گود سے بالک ابھی اترا نہیں

تنقید نگاری

شفیق احمد شفیق ایک ممتاز تنقید نگار ہیں۔ ایک مدت سے تنقیدی مضامین لکھ رہے ہیں۔ ان کے مضامین مؤقر جرائد اور رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ۱۹۹۱ء میں ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "ادراک" کے نام سے شائع ہوا (اس کتاب کو بھارت میں فراق گورکھپوری اعلیٰ ادبی ایوارڈ بھی ملا)۔ اس میں پروفیسر اظہر قادری اور ڈاکٹر علیم اللہ حالیؔ کے مضامین ہیں۔ مصنف نے "عرضِ حال" کے عنوان سے دیباچہ لکھا ہے۔ کتاب ۱۳۶ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں حسب ذیل بارہ مضامین ہیں:

جوش ملیح آبادی۔ فیض احمد فیض۔ غلام عباس۔ وزیر آغا کی انشائیہ نگاری۔ اظہر قادری۔ نظیر صدیقی۔ حرف تازہ کا شاعر۔ سحر انصاری، شہزاد منظر اور فکشن کی تنقید۔ فہیم اعظمی کے افسانے۔ عارف ہوشیار پوری اور ایوب جوہر۔

پروفیسر اظہر قادری اپنے مضمون ''ادراک کے بارے میں'' میں لکھتے ہیں:

''ادراک شفیق احمد شفیق کے چند تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس سے ان کے تنقیدی نظریات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ دیانت داری ان کی تنقید کی ایک اہم خصوصیت ہے.........ادب کا انسانی حوالوں سے جائزہ لیتے ہوئے انھیں جس ادیب کے یہاں جو کچھ نظر آیا اسے بلا کم و کاست پیش کر دیا ہے۔''

شفیق احمد شفیق کی دوسری تنقیدی کتاب ''جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک'' ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب فکری اور نظریاتی مباحث پر مشتمل ہے۔ صفحات ۱۴۴۔ اس کتاب میں تین دانشور وائس چانسلروں کے توصیفی مضامین ہیں۔ ان وائس چانسلروں کے نام یہ ہیں: ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر منظور احمد اور ڈاکٹر پیرزادہ قاسم۔ ڈاکٹر پیرزادہ قاسم لکھتے ہیں:

''مجموعی طور پر یہ کتاب مصنف کے گہرے مطالعہ کی غماز ہے۔ نیز مصنف کی غور و فکر کی صلاحیت نے کئی وقیع سوالات بھی اٹھائے ہیں۔ اتنے دقیق اور اہم موضوعات کو ایک مخصوص زاویہ نگاہ کے زیر اثر تحریر کرنا یقیناً شفیق احمد شفیق کا کارنامہ ہے اور وہ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ اہلِ نقد و نظر کو غور و فکر کی دعوت دی۔''

ابھی حال ہی میں (۲۰۱۰ء) شفیق صاحب کی ایک کتاب ''مقصدی شاعری۔ ایک جائزہ کا ناقدانہ تجزیہ'' شائع ہوئی ہے جو عشرت رومانی کی کتاب ''مقصدی شاعری۔ ایک جائزہ'' پر لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب ۲۵۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں چند دوسرے حضرات کے تبصرے بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔

۲۰۱۱ء میں فیض صدی کے سلسلے میں شفیق کی ایک کتاب "فیض۔ایک عہد ساز شخصیت" شائع ہوئی ہے۔

چند دیگر کارنامے

شفیق کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے استاد پروفیسر اظہر قادری کے مضامین کا مجموعہ "فکر وفن کے محرکات" مرتب کر کے شائع کیا۔ اس کے علاوہ "صبا اکبر آبادی۔بحیثیت غزل گو" کے نام سے مضامین کا ایک مجموعہ مرتب کیا۔

شفیق نے ایک سہ ماہی رسالہ "پیش رفت انٹر نیشنل" کے نام سے ۲۰۰۱ء میں جاری کیا جو کچھ عرصہ بعد شش ماہی ہوا، پھر سالانہ ہوگیا اور اب پچھلے دو تین سال سے اس کا کوئی شمارہ شائع نہیں ہوا۔ شاید مالی لحاظ سے وہ اس کے متحمل نہیں ہو سکے۔ اس رسالے کے کئی خاص نمبر بھی شائع ہوئے۔

شفیق کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے ایک ادبی انجمن "حلقۂ آہنگِ نو" کے نام سے قائم کی جس کی ماہانہ نشستیں بیس، بائیس سال تک ان کے گھر پر ہوتی رہیں۔ اب اس میں تعطل پیدا ہو گیا ہے۔

شفیق نے انگریزی لکھنے کی بھی اچھی استعداد حاصل کر لی ہے۔ انگریزی اخبار میں کام کرنے کے علاوہ وہ انگریزی میں مضامین اور تبصرے ایک عرصے سے لکھ رہے ہیں۔ ان مضامین کے دو مجموعے بھی مرتب کر لیے ہیں۔ اتنی مصروفیات کے باوجود وہ آج بھی تازہ دم ہیں اور لکھتے چلے جا رہے ہیں۔

شفیق بڑے خلیق، ملنسار، خوش مزاج اور ہمدرد انسان ہیں۔ ان کی گھریلو زندگی بھی بڑی خوش گوار ہے۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹے کی شادی ہو چکی ہے۔

❖❖

باب دوم

شعرا (ب)

علامہ ماہر فریدی

(شاعر و استادِ فن)

مشرقی پاکستان کی محفلِ شعر و ادب کے ممتاز ترین اساتذہ علامہ رضا علی وحشت، علامہ تمنا عمادی اور ڈاکٹر عندلیب شادانی تھے۔ ان کے بعد علامہ آصف بنارسی اور ماہر فریدی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں بزرگوں نے ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کیے بغیر جس طرح اُردو شاعری کی خدمت انجام دی اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک شمالی بنگال کا تعلق ہے ماہر فریدی اس علاقے کے ممتاز ترین شاعر اور استاد تھے۔ اس علاقے میں ان کے شاگردوں اور معتقدین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

ماہر فریدی مشرقی پاکستان آنے سے پہلے ایک پختہ گو شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔ تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں ان کی بعض نظمیں اہلِ علم سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی تھیں۔ ماہر فریدی فطری طور پر غزل گو تھے اور انھوں نے زیادہ تر غزلیں ہی لکھیں۔ ان کے کلام میں جہاں فنی پختگی ملتی ہے وہاں فکری گہرائی بھی پائی جاتی ہے۔ زبان و بیان کی سادگی، فکر و نظر کی پاکیزگی اور تخیل کی بلندی ان کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں۔

ماہر صاحب کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ ان کی پرورش تصوف کے آغوش میں ہوئی تھی تو بے جا نہ ہوگا۔ داد یہال اور نانیہال دونوں جانب سے ان کا تعلق صوفی گھرانے سے تھا۔ ان کے والد حضرت شاغل فریدیؒ اور نانا حضرت شاہ علی حسینؒ دونوں صاحبِ دل صوفی اور اُردو و فارسی

کے شاعر تھے۔ گویا تصوف اور شاعری ماؔہر مرحوم کو ورثے میں ملی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اخلاق و تصوف ان کی شاعری کے اہم مضامین ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

ہمیں دیر سے غرض کیا ہمیں کام کیا حرم سے!
نہ ہوں پاس جب تو ڈھونڈیں کہیں دور ہیں وہ ہم سے
مرے دل کے آئینے میں ہے خدائی بھی خدا بھی
کسی نقش سے ہے نسبت نہ فنونِ جامِ جم سے

کیفیتِ خودی نہیں لذتِ بے خودی نہیں
شیخ تری نماز میں حاصلِ زندگی نہیں
ماؔہر مے پرست کو، مست الست چھوڑ دو
اس نے ازل سے آج تک اور شراب پی نہیں

☆☆☆☆☆

ہوا یہ بندۂ بے چارہ قدر و جبر کا حامل
خدا کی شان ہے مجبور کا مختار ہو جانا

غزل کی شاعری بنیادی طور پر حُسن و عشق کی شاعری ہے۔ معاملاتِ حُسن و عشق سے متعلق ماؔہر صاحب کے یہاں بڑے دلکش اور پُر اثر اشعار ملتے ہیں:

خدا گواہ ہے بجلی سی دل پہ ٹوٹ پڑی
جو یاد آئی ادا تیرے مسکرانے کی

☆☆☆☆☆

یہ اور بات ہے جو وہ وفا سے کام نہ لیں
مگر غلط کہ نہیں جانتے وفا کیا ہے؟

جفاؤں میں کیا کیا مزے آ رہے ہیں
وہ ظالم کہیں مہرباں ہو نہ جائے
کوئی چشمِ بیمار پھر ملتفت ہے
توانا دلِ ناتواں ہو نہ جائے

☆☆☆☆☆

مانا کہ زباں سے کوئی اقرار نہیں ہے
لیکن کہے دیتی ہے نگاہوں کی زباں اور

مختصر حالاتِ زندگی

نام سید مصطفٰے حسن، ماہر تخلص اور تاریخی نام حسن اختر ہے۔۱۹۰۱ء میں اپنے ننھیال خانقاہ بارگاہِ فیاضیہ، بسملی شریف، پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن بہار شریف (پٹنہ) ہے۔ ان کے والد شاغل فریدی مشہور عالم، صوفی اور شاعر تھے۔ ابتدائی تعلیم انھیں سے حاصل کی۔ ۱۹۲۱ء میں میٹرک کا امتحان دینے والے تھے کہ تحریکِ ترکِ موالات کے سلسلے میں امتحان میں شریک نہ ہوئے۔ پہلے کانگریس کی ہم نوائی کی، بعد میں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ تحریکِ پاکستان میں حصّہ لیا اور متعدد نظمیں لکھیں۔

۱۹۲۹ء میں انھیں ریلوے میں ملازمت مل گئی اور وہ کھڑگپور آ گئے۔ ۱۹۴۷ء میں ان کا تبادلہ سید پور (مشرقی پاکستان) ہو گیا۔ ۱۹۶۸ء میں ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے چند سال بعد کراچی آ گئے۔ ۱۹۸۱ء میں انتقال کیا۔ اللہ مغفرت فرمائے!

ماہر مرحوم کی شاعری کی عمر بہت طویل تھی۔ انھوں نے بے شمار چھوٹے بڑے مشاعروں میں شرکت کی۔ بہت کچھ کہا اور داد بھی خوب وصول کی۔ لیکن انھیں چھپنے چھپانے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام اخباروں اور رسالوں میں بہت کم شائع ہوا۔ سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کا کوئی مجموعۂ کلام بھی شائع نہ ہو سکا۔ مرحوم لاولد تھے۔ غالباً ان کا کلام سب

ضائع ہوگیا۔

بحیثیت انسان بھی ماہر صاحب کا مرتبہ بلند تھا۔ وہ بڑے شریف النفس، خوش اخلاق اور منکسر المزاج انسان تھے۔ اپنے شاگردوں اور خوردوں سے ہمیشہ شفقت ومحبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ اپنے ہم عصروں سے جھک کر ملتے تھے۔ ان میں غرور وتکبر نام کو نہ تھا۔ انھوں نے صوفیوں کی عبادت وریاضت اگرچہ اپنائی نہ تھی لیکن ان کے اخلاق کو ضرور اپنایا تھا۔ وہ ریلوے میں ایک معمولی ملازم تھے لیکن ان کے افسران بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ اس کی وجہ کمالِ فن کے علاوہ ان کی بلند اخلاقی بھی تھی۔ وہ ایک مجلسی انسان تھے اور گفتگو کا سلیقہ بھی انھیں خوب حاصل تھا۔ وہ بڑے دلکش انداز میں گفتگو کرتے اور اہلِ محفل کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے تھے۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ سید پور چھوڑ کر میر پور (ڈھاکا) میں پناہ لینی پڑی۔ لیکن ان کی استقامت اور زندہ دلی ہمیشہ برقرار رہی۔ یہاں بھی وہ اپنے معتقدوں اور مداحوں میں گھرے رہتے تھے۔ یہیں میری ان سے ملاقات ہوئی۔ جب بھی ملتے بڑی محبت سے ملتے تھے۔ ہوٹلوں میں اکثر نشست رہتی تھی۔ عثمان نیرنگ (علیگ) اور حسن رضا دائروی اکثر ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ کئی بار غریب خانے پر بھی تشریف لائے۔ گورے چٹے انسان تھے۔ قد بھی اونچا تھا۔ شیروانی اور ٹوپی ان کا مستقل لباس تھا۔ ہاتھ میں ایک چھڑی ہوتی تھی۔ پان خوب کھاتے تھے۔ کبھی میں نے ان کی زبان سے شکوۂ گردشِ دوراں نہیں سنا۔

دو غزلیں

شاعر کے کمال کا اندازہ اس کی مکمل غزلوں سے ہوتا ہے۔ دو غزلیں درج کی جاتی ہیں:

یہ شیریں ترانہ فغاں ہو نہ جائے
مسرت غمِ جاوداں ہو نہ جائے
نظر دردِ دل کی زباں ہو نہ جائے
محبت کسی پر عیاں ہو نہ جائے

کہیں پھول بن کر ستارے نہ ٹوٹیں
زمینِ چمن آسماں ہو نہ جائے
محبت میں لازم ہے بے لوث رہنا
کہیں فکرِ سود و زیاں ہو نہ جائے
جفاؤں میں کیا کیا مزے آ رہے ہیں
وہ ظالم کہیں مہرباں ہو نہ جائے
کوئی چشمِ بیمار پھر ملتفت ہے
توانا دلِ ناتواں ہو نہ جائے
بغور اپنی ہستی کو پہچان ماہرؔ
نظر پردۂ درمیاں ہو نہ جائے

آئے گا یقیں آپ کی باتوں پہ کہاں اور
قول اور عمل اور ہے دل اور زباں اور
فطرت میں دیا خیر و شر اور اس پہ ملی عقل
مجبور کے سر رکھ دیا اک بارِ گراں اور
مانا کہ زباں سے کوئی اقرار نہیں ہے
لیکن کہے دیتی ہے نگاہوں کی زباں اور
سمجھیں تو وہی سمجھیں اغیار نہ سمجھیں
میں کہہ گیا ان سے بحدیثِ دگراں اور
کیوں خستگیٔ طبع ہے اشعار میں ماہرؔ
شاعر تو ہوا کرتے ہیں پیری میں جواں اور

❖❖

شوق عظیم آبادی

(اسلامی اور اخلاقی اقدار کے ترجمان)

سوانحی خاکہ

نام: زین الدین فخری

قلمی نام: شوقؔ عظیم آبادی

پیدائش: ۱۹۰۰ء بمقام پٹنہ (عظیم آباد)

پیشہ: ہومیوپیتھی ڈاکٹر (سند یافتہ)

پہلی ہجرت: ۱۹۶۴ء۔ ڈھاکا

دوسری ہجرت: جولائی ۱۹۷۰ء۔ کراچی

وفات: ۱۶ اپریل ۱۹۸۷ء۔ کراچی

"کفِ گل فروش"

مجموعۂ کلام "کفِ گل فروش" کے نام سے ۱۹۹۶ء میں کراچی سے ان کے صاحبزادے انور فخری نے شائع کیا۔ صفحات: ۲۴۰

کتاب کے شروع میں "شوقؔ عظیم آبادی اور ان کا فن" کے عنوان سے پروفیسر نظیر

صدیقی نے دیباچہ لکھا ہے۔ اس کے بعد "شوق عظیم آبادی اور ان کی زندگی" کے عنوان سے مضمون ان کے صاحبزادے انور فخری کا ہے۔

کلام کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں غزلیں، نظمیں اور قطعات وغیرہ ہیں اور دوسرے حصے میں نعتیں ہیں۔

اس مجموعے میں متعدد طویل اسلامی۔ اخلاقی اور سیاسی نظمیں ہیں۔ ایک نظم "نذرانہ عقیدت" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

"نذرانۂ عقیدت"

یہ نظم محترمہ حسن آرا رئیسی بیگم کا قصیدہ ہے جو برِّ صغیر کے مشہور و معروف لیڈر شیرِ بنگال مولوی اے۔ کے۔ فضل الحق کی صاحبزادی تھیں۔ رئیسی بیگم اسلام اور نظامِ اسلام کی مبلغہ اور پاکستان اور اُردو کی شیدائی تھیں۔ وہ اُردو کی بڑی اچھی مقررہ، شاعرہ اور ادیبہ تھیں۔ ان کے شوہر خلیل الرحمن بھی اسلام اور پاکستان کے فدائی اور اُردو کے ایک اچھے ادیب و مصنف تھے۔ وہ مغربی بنگال کے مشہور و معروف عالم، معلم اور مصنف مولانا محمد اسحٰق بردوانی کے بیٹے تھے۔

رئیسی بیگم عوامی لیگ کی بنگالی قومیت کی تحریک کی سخت مخالف اور مہاجروں کی ہمدرد و غم گسار تھیں۔ اُس دورِ فتن میں جب عوامی لیگ یا شیخ مجیب الرحمن کے خلاف بولنا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا، وہ کھلم کھلا ان کے خلاف تقریریں کرتی تھیں۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد مکتی باہنی اور بنگالی غنڈوں کے ہاتھوں انھیں اور ان کے گھر والوں کو بہت تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ ان کے شوہر اور اکلوتے چھوٹے بھائی کو ڈھاکا سینٹرل جیل میں قید کر دیا گیا۔ رئیسی بیگم کی وفات ۱۹۸۲ء میں ڈھاکے میں ہوئی۔ اللہ مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے! آمین۔

رئیسی بیگم کے کردار کی تعریف و توصیف میں شوق عظیم آبادی کی نظم دیکھیے۔ یہ نظم ان کی دوسری ہجرت (جولائی ۱۹۷۰ء) سے کچھ پہلے کی لکھی ہوئی ہے، جس میں اس پورے دور کی عکاسی

بھی موجود ہے۔

نذرانۂ عقیدت

شیرِ بنگال کی بیٹی تری جرأت کو سلام
تیری بے لوث نگارش کو اخوت کو سلام
تیری بے خوف مسلماں سے محبت کو سلام
تیری اسلام سے وابستہ عقیدت کو سلام

تیری اسلام کی اک خاص عبادت کو سلام
یعنی کمزور مہاجر کی حمایت کو سلام

مرہمِ زخمِ جگر تو ہے رئیسی بیگم
اے بہن رشکِ قمر تو ہے رئیسی بیگم
بے گماں نورِ نظر تو ہے رئیسی بیگم
یعنی اک تازہ سحر تو ہے رئیسی بیگم

زلزلہ ہے تری تقریر سے ایوانوں میں
مخملیں رنگ کی بدلی ہیں عزا خانوں میں

رہنما کوئی نہیں جس کا دلوں میں ہو وقار
غنڈہ گردی پہ ہے اربابِ سیاست کا مدار
رہ نما سب سے بڑا وہ ہے جو ہو بدکردار
قوم کی قوم ہے گویا کہ جہنم بہ کنار

بیٹھے چپ سادہ کے تھے ان میں جو مخلص دوچار
دیکھیے ہوتا ہے کیا گر ہیں یہی لیل و نہار!

نہ رہا کوئی بھی اس دور میں پاکستانی
لوگ اس ملک کے سب بھول گئے قربانی
قول انساں کا رہا اب نہ فعلِ انسانی
آگئی سب میں کہاں سے صفتِ حیوانی

صرف نفرت پہ ہے اب اہلِ سیاست کا مدار
بس اسی مال سے ہے ان کی دکانوں میں بہار

حد تو یہ ہے نہ بچا کوئی تعصب سے وکیل
یہ پڑھے لکھے ہیں لے کر جو اٹھے ہیں یہ دلیل
غیر بنگالی کو جینے کی نہ دی جائے ڈھیل
کیا مسلمان بھی ہو سکتے ہیں اس درجہ ذلیل

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا کہیے
ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے

تیری تحقیق کے صدقے، تری ہمت کے نثار
تیری تحریر کی لذّت سے ہر اک دل سرشار
تو تعصب کے لیے ایک چمکتی تلوار
تیرے انداز، تکلم میں ہے شانِ انصار

روشنی دم سے ترے میرے سیہ خانوں میں
روح پھونکی تری تقریر نے ارمانوں میں

تیرے اندازِ نگارش کے ہوئے قائل ہم
تیری حق گوئی کے آگے ہیں ہمارے سر خم

ہاں نکل آئے دوپٹے کا بنا کر پرچم
شہرِ بنگال کی ہم کھاتے ہیں عظمت کی قسم

حرزِ جاں اپنا ترا حکم بنا لیں گے ہم
سر عقیدت سے ترے آگے جھکا لیں گے ہم

شوقؔ عظیم آبادی بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ ان کی غزلوں میں نعتیہ اور حمدیہ اشعار بھی ملتے ہیں۔ اخلاقی اور دینی تعلیمات پر مبنی اشعار کی بھی کمی نہیں۔ غزلیں سب روایتی انداز کی ہیں۔ ذیل میں ایک غزل درج کی جاتی ہے:

اسیرِ دائرۂ حسنِ بے مثال میں ہوں
زہے نصیب ترے حلقۂ جمال میں ہوں

غمِ فراق، کبھی کیفِ اتصال میں ہوں
پتہ نہیں کہ شبِ ہجر یا وصال میں ہوں

حصولِ زر کی ہوس میں نہ فکرِ مال میں ہوں
خدا گواہ کہ خوش ساغرِ سفال میں ہوں

کلی کلی سے ہویدا ہے کس کا عکسِ جمیل
روش روش پہ میں نظارۂ جمال میں ہوں

بسی ہوئی ہے فضاؤں میں صوتِ عشقِ رسولؐ
میں محوِ بانگِ اذاں حضرتِ بلالؓ میں ہوں

نہ کل وجود تھا اپنا نہ شوقؔ آج عدم
فنا کے بعد بھی اس دستِ لازوال میں ہوں

❖❖

پروفیسر حسن عظیم آبادی

(ایک فراموش کردہ شاعر)

پروفیسر حسن عظیم آبادی (۱۹۱۳ء-۱۹۸۰ء) مشرقی پاکستان کے ممتاز ترین شعرا میں تھے۔ سید حسن خاں نام اور حسن عظیم آبادی قلمی نام تھا۔ ان کے والد نواب سید نصیر حسین خاں پٹنہ کے ایک بڑے زمیندار اور اُردو کے معروف ادیب و مصنف تھے۔ ان کی کتاب ''داستانِ اُردو'' اس دور میں بہت مشہور ہوئی۔

سید حسن ۱۳رستمبر ۱۹۱۳ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے بی۔اے پاس کیا۔ پھر وہیں سے ۱۹۴۰ء میں اُردو اور ۱۹۴۳ء میں فارسی میں ایم۔اے کیا۔ بی۔اے کرنے کے بعد ۱۹۳۸ء میں وہ بسلسلۂ ملازمت حیدرآباد (دکن) چلے گئے۔ ۱۹۳۹ء تک محکمۂ تعلیمات سے وابستہ رہے۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک ان کا تعلق عثمانیہ کالج، اورنگ آباد سے رہا۔ سقوطِ حیدرآباد کے بعد جنوری ۱۹۵۰ء میں مشرقی پاکستان آگئے۔ فروری ۱۹۵۰ء میں گورنمنٹ کالج آف کامرس، چاٹگام میں ان کا تقرر اُردو لیکچرار کی حیثیت سے ہوا۔ آخر وقت تک وہ اسی کالج سے وابستہ رہے۔ ۱۹۶۸ء میں ریٹائر ہونے کے بعد کراچی چلے آئے۔

پروفیسر حسن عظیم آبادی ایک ممتاز و منفرد غزل گو تھے۔ ان کی شاعری کا آغاز اگرچہ بہت پہلے ہو چکا تھا لیکن مشرقی پاکستان آ کر وہ غزل گو کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ چاٹگام کی ادبی سرگرمیوں میں انھوں نے بھرپور حصہ لیا۔ مشاعروں اور ادبی نشستوں میں شریک ہوتے رہے اور ان

کا کلام اخباروں اور رسالوں میں بھی شائع ہوتا رہا۔ افسوس کہ ان کی بینائی آخری دور میں جاتی رہی۔ کراچی آ کر بھی کبھی کبھی مشاعروں میں شریک ہوتے رہے۔ ان کے کلام کا مجموعہ ''زمزمستان'' چاٹگام سے شائع ہو چکا تھا۔ ۱۱ر مئی ۱۹۸۰ء کو کراچی میں انتقال کیا۔ اللہ مغفرت فرمائے!

نمونۂ کلام

فکرِ منزل ہے نہ نامِ رہنما لیتے ہیں ہم
اپنا ذوقِ رہروی خود آزما لیتے ہیں ہم
کثرتِ غم میں بھی اکثر مسکرا لیتے ہیں ہم
ظلمتِ ہستی میں یوں شمعیں جلا لیتے ہیں ہم
کچھ نہ پوچھو ہمتوں سے کام کیا لیتے ہیں ہم
غم کو بادہ، دل کو پیمانہ بنا لیتے ہیں ہم
منتشر ہونے کو آتی ہے جو بزمِ آرزو
حوصلوں کی پھر نئی دنیا بسا لیتے ہیں ہم
کیوں مزاجِ حُسن میں پیدا کریں اک برہمی
اپنے دل کو اپنا افسانہ سُنا لیتے ہیں ہم
اس قدر چرکے لگے ہیں دہر میں اے ہم نشیں!
خار کیا پھولوں سے بھی دامن بچا لیتے ہیں ہم
ملتفت ہوتا نہیں جب ساقیِ دوراں حسنؔ
میکدے میں بڑھ کے خود ساغر اٹھا لیتے ہیں ہم

شوق کو مِل رہا تھا اسی میں مزہ، جھک رہی تھی مسلسل جبینِ وفا
کیا کروں حُسن کو محترز دیکھ کر، فطرتِ عشق بھی خود نگر ہو گئی
یوں گزاری ہے ہم نے شبِ آرزو، چاند تاروں سے پہروں رہی گفتگو
بسترِ غم پہ کانٹے سے چبھتے رہے، آنکھ لگنے نہ پائی سحر ہو گئی
کس قدر ہے نرالا جہاں کا چلن، دیکھیے تو حسنِ انتظامِ چمن!
باغباں کم نگاہی کے گھائل رہے اور ادھر ہر کلی دیدہ ور ہو گئی

ہوگا نہ جس میں ادنیٰ و اعلیٰ کا امتیاز
یارو وہ دورِ جام نہ کیوں آج ہی چلے
میں چل رہا ہوں شوق کی راہوں میں اس طرح
ٹیڑھی ڈگر پہ جیسے کوئی اجنبی چلے
ہر سو ہیں باغِ دہر میں گلہائے خار دار
دامن بچا کے کیسے کوئی آدمی چلے!

نیند آتی ہے سو نہیں سکتا
دل بھر آیا ہے رو نہیں سکتا
حاملِ اختیار ایسا ہوں
چاہتا ہوں جو، ہو نہیں سکتا

بے خودی اور خودی کی دنیا میں
لڑکھڑا کے سنبھل کے دیکھ لیا
بسترِ زندگی پہ کل نہ پڑی
ہم نے پہلو بدل کے دیکھ لیا

❖❖

عبدالعزیز بیخود

(یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ)

سوانحی خاکہ

نام: حاجی عبد عبدالعزیز

قلمی نام: عبدالعزیز بیخود

والد کا نام: محمد حسن پنوارو مرحوم

تاریخِ پیدائش: ۱۵ر نومبر ۱۹۱۵ء

جائے پیدائش: کاٹھیاواڑ۔ صوبہ گجرات (بھارت)

تعلیم: میٹرک

پیشہ: ملازمت، کاروبار

پہلی ہجرت: ڈھاکا، ۱۹۵۰ء

دوسری ہجرت: سقوطِ ڈھاکا سے چند ماہ قبل۔ کراچی

اولاد: پانچ بیٹے، دو بیٹیاں (سب شادی شدہ)

وفات: ۲۰۰۱ء

”کاغذی پیرہن“

مجموعہ کلام ”کاغذی پیرہن“ ۱۹۹۸ء میں ان کے بیٹے عبدالرزاق نے شائع کیا۔ کتاب کے مرتب معروف شاعر و ادیب انور فرہاد ہیں۔ عبدالعزیز بیخودؔ مرحوم گجراتی تھے اور ان کی مادری زبان بھی گجراتی تھی، لیکن انھیں اردو زبان و ادب پر بھی عبور حاصل تھا۔ نوجوانی کے زمانے میں جب وہ ناگپور میں ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے، شعر و شاعری کا آغاز کیا۔ وہاں کی محفلِ شعر و ادب میں بھی شریک ہونے لگے۔ انور فرہاد اس مجموعہ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

”علامہ سیماب اکبرآبادی کی ادارت میں ان کا ایک ادبی رسالہ 'شاعر' کے نام سے نکلتا تھا، جس میں 'مشاعرے' کے عنوان سے ایک حصہ بھی مخصوص تھا۔ وہ ہر ماہ کے لیے کچھ مصرعہ طرح دیتے تھے، جس پر ان کے شاگرد شعرا (غزل) کہہ کر ارسال کردیتے تھے۔ علامہ سیماب ان کی اصلاح کر کے کچھ شعر شائع کردیتے تھے۔ یہ غالباً ۱۹۳۶ء کی بات ہے کہ عبدالعزیز بیخودؔ نے علامہ سیماب اکبرآبادی کے مجلّہ 'شاعر' کے 'مشاعرے' میں شرکت شروع کردی۔“

یہ سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا۔ اس طرح بیخودؔ صاحب نے سیماب اکبرآبادی کے شاگرد ہونے کا اعزاز حاصل کرلیا۔ جب وہ ۱۹۴۹ء یا ۱۹۵۰ء میں ہجرت کر کے ڈھاکا آئے تو شروع میں کچھ عرصہ مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ لیکن معاشی اور کاروباری مصروفیتوں کے بڑھ جانے کی وجہ سے آہستہ آہستہ وہ شعر و شاعری سے دور ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ شاعری تقریباً ترک کردی۔

انور فرہاد لکھتے ہیں کہ نواب پور روڈ، ٹھٹھری بازار کے موڑ پر ان کی جنرل اسٹور کی دوکان تھی جس میں وہ ہمہ وقت مصروف نظر آتے تھے۔ ان کا بیٹا عبدالرزاق انور فرہاد کے ساتھ نواب پور گورنمنٹ اسکول میں پڑھتا تھا۔

سقوطِ ڈھاکا سے غالباً چند ماہ قبل وہ مع اہل و عیال کراچی آگئے۔ یہاں جب ان کے

گجراتی دوستوں کو معلوم ہوا کہ وہ شاعر بھی ہیں تو وہ انھیں گجراتی مشاعروں میں لے جانے لگے۔ اس طرح بیخود صاحب نے گجراتی میں شعر کہنے کا آغاز کیا اور بہت جلد وہ گجراتی شاعر کی حیثیت سے معروف ہو گئے اور انھیں ریڈیو اور ٹی وی مشاعروں میں بھی شرکت کی دعوت ملنے لگی۔

آخر عمر میں وہ گوشہ نشیں ہو گئے تھے۔ ہاتھوں میں رعشہ آ گیا تھا اور وہ کچھ لکھ نہیں سکتے تھے۔ انور فرہاد اپنے دوست عبدالرزاق (ان کے بڑے بیٹے) سے ملنے ان کے گھر جایا کرتے تھے۔ ایک دن بیخود صاحب نے ان سے شکایت کی کہ تمھارا دوست عبدالرزاق میرا مجموعہ شائع نہیں کروا رہا۔ اس سے کہو کہ میرا مجموعہ شائع کروا دے۔ انور فرہاد نے کہا کہ آپ اپنا کلام مجھے دے دیجیے، میں اسے مرتب کر کے عبدالرزاق کو دے دوں گا، وہ چھپوا دے گا۔ بہر حال بیخود صاحب نے اپنے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں سے متعدد کاپیوں میں اپنی غزلیں لکھوا کر ان کے حوالے کر دیں۔ انور فرہاد صاحب کو بچوں کے لکھے ہوئے مسودے کو پڑھنے میں بڑی دقت ہوئی۔ بہر حال کئی ماہ کی کوشش کے بعد وہ ان غزلوں کو صاف کرنے اور انھیں ایک مجموعے کی شکل میں مرتب کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اس طرح ایک گمنام گجراتی شاعر کا کلام ضائع ہونے سے محفوظ ہو گیا۔ یہ انور فرہاد صاحب کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

''کاغذی پیرہن'' میں ''عبدالعزیز بیخود۔ فن اور شخصیت'' کے عنوان سے انور فرہاد نے ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے۔ اس کے بعد ان کے بیٹے عبدالرزاق کا ایک مختصر مضمون ''گفتگو'' کے عنوان سے ہے۔ کتاب میں ایک حمد، ۱۲ نعتیں، ایک منقبت، ۱۰۷ غزلیں اور ۴ نظمیں ہیں۔ کتاب ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

کتاب کے انتساب سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیخود صاحب کو اپنی اہلیہ مرحومہ سے بڑی محبت تھی۔ انتساب دیکھیے:

اپنی رفیقۂ حیات

مرحومہ حاجیانی فاطمہ بیگم کے نام

ترے بغیر زمانے کی راحتیں بے سود
جو تو نہیں تو مجھے بھی کہیں قرار نہیں

منتخب اشعار

تمکنت اچھی نہیں اے شوخ زیرِ آسماں
توڑ دیتی ہے یہ پل بھر میں سرِ مغرور کو

☆☆☆☆☆

ایامِ مصیبت میں ہے مانع تری الفت
روتے ہیں مگر چشم کو ہم نم نہیں کرتے

☆☆☆☆☆

ناکامیوں کا غم نہیں، افسوس ہے تو یہ
دو دن کی زندگی مجھے بدنام کر گئی

☆☆☆☆☆

نہ چھیڑ مسئلۂ جبر و اختیار ابھی
کہ سن رہا ہوں حدیثِ غمِ بہار ابھی
شرابِ جلوۂ عارض پلائے جا ساقی
کہ تیرا دیکھنے والا ہے ہوشیار ابھی
خزاں کی فکر سے کیا اپنا واسطہ بیخودؔ
ہمارے ہاتھ میں ہے دامنِ بہار ابھی

☆☆☆☆☆

مطربانِ شاخِ گل سب ہو گئے ہیں نغمہ زن
یہ کسی کے حسنِ دل کش کے ہیں سارے بانکپن

اللہ اللہ یہ مزین خوب صورت پھول سب
حُسنِ گلشن تو ہیں لیکن کاغذی ہے پیرہن

☆☆☆☆☆

کہیں حسرت کا جنازہ کہیں اُمید کی لاش
ہائے کیا کیا ترے محرومِ تمنا دیکھیں

☆☆☆☆☆

تھا اک فریب کسی کا وہ وعدۂ فردا
بچا لیا مرے مولا نے بال بال مجھے

وہ گئے، دل گیا، حیات گئی
اس طرح ساری کائنات گئی

ظہورِ قدسی

فضاؤں پر تسلط ہو چکا تھا کفر و ظلمت کا
دلوں سے مٹ چکا تھا حوصلہ اخلاق و الفت کا
زمانے میں نہ تھا کوئی کسی کا پوچھنے والا
ذرا سی بات پر آپس میں کشت و خون ہوتا تھا
نظامِ بزمِ عالم آ چکا تھا کفر کے بس میں
مروج ہو چکی تھیں ہر طرف الحاد کی رسمیں
زمانہ لے رہا تھا کروٹیں آغوشِ ظلمت میں
یکایک جوش سا پیدا ہوا دریائے رحمت میں
تو عبداللہ کے گھر میں وہ گوہر ہوگیا پیدا
جسے سب دیکھ کر بولے کہ رہبر ہو گیا پیدا

عرب کی وادیوں میں پھوٹ نکلے نور کے چشمے
زمین و آسماں لوح و قلم سب جگمگا اٹھے
سلام اس پر کہ جو تھا کالی کملی اوڑھنے والا
سلام اس پر کھجوروں کی چٹائی جس کا بستر تھا
سلام اس پر جو تھا رازِ دوعالم جاننے والا
محبت کی نگاہیں دور سے پہچاننے والا
سلام اس پر جو تھا غارِ حرا میں رونقِ ہستی
خلوص و بندگی کا آئینہ تھی جس کی خاموشی
سلام اس پر زمانے کی اٹھائیں سختیاں جس نے
غلاموں کو چھڑایا قیدِ محکومی کی لعنت سے

بیتھو مرحوم کے بڑے صاحبزادے عبدالرزاق (قلمی نام: رازق عزیز) بھی ایک اچھے شاعر ہیں۔ انھوں نے اُردو ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔

خلش کلکتوی

(شاعرِ اخلاقیات)

سوانحی خاکہ

نام: رشید الزماں

قلمی نام: خلش کلکتوی

پیدائش: ۱۹۱۸ء

مقامِ پیدائش: کلکتہ (مغربی بنگال)

خاندانی تعلق: عظیم آباد (پٹنہ)، بہار

تعلیم: بی۔اے (کلکتہ یونیورسٹی) (۱۹۴۰ء)

پیشہ: سرکاری ملازمت

پہلی ہجرت ۱۹۴۷ء۔ڈھاکا (مشرقی پاکستان)

تبادلہ: ۱۹۶۸ء۔اسلام آباد

ریٹائرمنٹ: فروری ۱۹۷۶ء

وفات: ۱۹۹۳ء، اسلام آباد

اولاد: کئی بیٹے، اسلام آباد میں سرکاری ملازم ہیں

''کیفیاتِ خلش'' اور ''سچائیاں''

خلش مرحوم کی غزلوں کے دو مجموعے ''کیفیاتِ خلش'' ۱۹۷۷ء میں اور ''سچائیاں'' ۱۹۸۲ء میں اسلام آباد سے شائع ہوئے۔

خلش کا بہترین دور ڈھاکے میں گزرا جہاں انھوں نے کم و بیش بیس سال تک غزل سرائی کی۔ ڈھاکا آنے سے پہلے وہ کلکتہ میں ایک شاعر کی حیثیت سے معروف ہو چکے تھے۔ ڈھاکے میں انھوں نے ادبی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ ڈھاکا آنے کے بعد وہ علامہ آصف بنارسی کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ کچھ عرصہ ''بزمِ آصفی'' کے سکریٹری بھی رہے۔

خلش کلکتوی ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔ انھیں خود استادانہ مقام حاصل تھا۔ وہ علمِ عروض پر عبور رکھتے تھے۔ اسلام آباد میں بھی مشاعروں اور ادبی نشستوں میں شریک ہوتے رہے۔ اسلام آباد ہی میں ۱۹۹۴ء میں ان کی وفات ہوئی۔ اللہ مغفرت فرمائے۔

خلش مرحوم پاکیزہ اخلاق و کردار کے حامل تھے۔ صوم و صلوٰۃ اور اسلامی تعلیمات کے پابند تھے۔ حج کی سعادت بھی حاصل کی تھی۔ تبلیغِ دین کا جذبہ بھی ان میں موجود تھا۔

خلش مرحوم کا دوسرا مجموعۂ کلام ''سچائیاں'' دینی، اخلاقی اور معاشرتی تعلیمات کا ایک دلکش مجموعہ ہے۔ اُردو میں شاید ہی کوئی اور غزلوں کا مجموعہ ایسا مل سکے۔ اُردو کے کشکولِ ادب میں کیسے کیسے جواہر ریزے پڑے ہوئے ہیں لیکن افسوس کہ ہمیں ان کی خبر نہیں۔

منتخب اشعار

شہر میں واعظ بھی، مفتی بھی، فقیہِ دیں بھی ہیں
کیوں برائی پر کسی کو ٹوکتا کوئی نہیں؟

☆☆☆☆☆

چُپ نہ سادھو جو کوئی بات کہے حق کے خلاف
بزمِ فرزانہ میں اک نعرۂ مستانہ سہی

ہمدم پیامِ حق کا سنانا ہے اپنا کام
کوئی سنے سنے نہ سنے اس پکار کو

☆☆☆☆☆

میں اپنی خوئے حق گوئی کے صدقے
اسی نے دی زباں اک بے زباں کو

پنہاں ہے اس کی یاد میں دل کی خوشی خلش
مال و متاع میں ہے نہ جاہ و جلال میں

ملی دنیا سکونِ دل کے بدلے
کیا کیا خوب سودا آدمی نے

ذکر ہر لحظہ اس کا، یاد اس کی روز و شب
اس طرح جمعیتِ خاطر کا ساماں ہو گیا

جانتے ہیں یہ امتحاں ہے خلش
پھر مصیبت میں کیسے گھبرائیں

امتحانِ عشق کو جور و جفا سمجھا تھا میں
مدعائے حسن کیا تھا اور کیا سمجھا تھا میں

☆☆☆☆☆

کہیں صلیب تو دار و رسن سجے ہیں کہیں
یہ اہتمام ہے کیا میرے امتحان کے لیے

☆☆☆☆☆

خوئے استغنا متاعِ بے بہا رکھتا ہوں میں
آپ کو مسند مبارک بوریا رکھتا ہوں میں

تیرگی بڑھتی گئی جب تک جلی شمعِ ہوس
بجھ گئی یہ شمع تو دل میں چراغاں ہو گیا

☆☆☆☆☆

بس اہلِ دل ہی کو عرفانِ رازِ ہستی ہے
یہ کائنات معمہ ہے فلسفی کے لیے

☆☆☆☆☆

دنیا میں رہیے خواہشِ دنیا نہ کیجیے
اس زندگی میں کوئی تمنا نہ کیجیے

ذیل میں تین غزلیں درج کی جاتی ہیں:

سبک ہوں اپنی نگاہوں میں عرضِ حال کے بعد
کہ آبرو نہیں رہتی کبھی سوال کے بعد

نہ پوچھو، دل کو ہوئی ہیں اذیتیں کیا کیا
کبھی سوال سے پہلے، کبھی سوال کے بعد

ضمیر کی وہ مسلسل ملامتیں توبہ!
ملا ہے دل کو سکوں اشکِ انفعال کے بعد

قرار دل کو نہیں تھا، قرار دل کو نہیں
ترے وصال سے پہلے، ترے وصال کے بعد

ظن و گماں سے گزر کر ترا خیال آیا
کوئی خیال نہ آیا ترے خیال کے بعد

میں دل تو ہار چکا، جان و مال حاضر ہیں
خلش کے پاس ہے کیا اور جان و مال کے بعد

بھوک سے بچے بلکتے ہیں نہ جانے کتنے
اور پانی میں بہا دیتے ہیں دانے کتنے

اک تمنا کا ہوا خون تو کیا غم اے دوست
دفن ہیں سینے میں ارمان نہ جانے کتنے

کبھی اوروں کی کبھی اپنی حماقت کے طفیل
ہاتھ آتے رہے ہنسنے کے بہانے کتنے

زندگی ایک حقیقت بھی ہے افسانہ بھی
ہر گلی کوچے میں بکھرے ہیں فسانے کتنے

اک عمل تازہ کی تخلیق میں اے گل چینو
جانے قدرت نے لٹائے ہیں خزانے کتنے

میری روداد کو سب اپنا فسانہ سمجھے
اک فسانے میں ہیں پوشیدہ فسانے کتنے

حوصلہ بخشا ہے جینے کا انہی خوابوں نے
ہم نے دیکھے ہیں خلش خواب سہانے کتنے

ہے دھوپ چھاؤں کی مانند زندگی میری
ثبات غم کو نہیں عارضی خوشی میری

اسی کو اب مری ہر بات زہر لگتی ہے
کبھی پسند نہ تھی جس کو خامشی میری

تری نظر کا سہارا بڑا سہارا تھا
جہاں میں کر نہ سکا کوئی ہم سری میری

کبھی گناہ، کبھی حسرتِ گناہ کا غم
تمام کربِ مسلسل ہے زندگی میری
میں دل کا حال اسی کو سناتا رہتا ہوں
چھپی نہ جس سے کوئی بات ان کہی میری
میں مثلِ کرمکِ شب تاب جلتا رہتا ہوں
کسی کے کام تو آئے گی روشنی میری
جو میرے خدشۂ فردا پہ خندہ زن ہیں خلش
مری دعا ہے ملے ان کو آگہی میری

خلش مرحوم، افسر ماہ پوری کے دوستوں میں تھے۔ کراچی آتے تو انھیں کے یہاں ٹھہرتے تھے۔ شاعر صدیقی کے بھی ان سے قریبی تعلقات تھے۔ دوسری ہجرت کے اکثر شعراء سے ان کے دوستانہ روابط تھے۔ پروفیسر نظیر صدیقی نے ان کے ایک مجموعے پر دیباچہ لکھا تھا۔ اسلام آباد میں ان کا ایک ادبی حلقہ بھی قائم ہو گیا تھا۔

''پاک ڈائجسٹ'' لاہور (مدیر فضل حق اللہ مرحوم) نے ۱۹۸۲ء میں ''خلش کلکتوی نمبر'' بھی شائع کیا تھا جس میں راقم کا بھی ایک مضمون شامل تھا۔

مقبول نقش

(مزدور شاعر)

عبدالسبحان مقبول نقش (۱۹۱۹ء-۲۰۰۵ء) مشرقی پاکستان کے ممتاز شاعروں میں تھے۔ ۱۹۱۹ء میں جمشید پور (بہار) میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن مدراس تھا۔ غالباً غربت کی وجہ سے تعلیم زیادہ حاصل نہ کر سکے۔ لڑکپن ہی سے حصولِ معاش کی تگ و دو میں لگ گئے۔ ایک عرصے تک جمشید پور میں ایک لوہے کے کارخانے میں کام کرتے رہے۔ لیکن ادبی و شعری ذوق بھی اپنا کام کرتا رہا۔ جمشید پور کی ادبی سرگرمیوں میں نمایاں رہے۔ شعر کہتے اور بڑے ذوق و شوق سے مشاعروں میں شریک ہوتے رہے۔ وہ ایک فطری شاعر تھے جس کے لیے نہ کالجوں اور مدرسوں کی تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ فاعلاتن فاعلات سیکھنے کی۔ ایسے ہی شاعروں کو تلامید الرحمٰن کہا جاتا ہے۔ رباعی جیسے مشکل صنفِ سخن پر بھی انھیں عبور حاصل تھا۔ غزلیں، نظمیں، رباعیاں، قطعات سب کچھ کہتے تھے۔ وہ ایک زود گو اور پُر گو شاعر تھے اور شاعری میں اخلاقی اور مذہبی اقدار کی پاسداری کے قائل۔ وہ جمشید پور میں ایک شاعر کی حیثیت سے معروف ہو چکے تھے۔

مقبول نقش ۱۹۵۲ء میں سابق مشرقی پاکستان آ گئے۔ پہلے کپتائی (کرنافلی) میں محنت مزدوری کرتے رہے۔ پھر ٹھیکے کا کام شروع کر دیا ۱۹۵۴ء میں چاٹگام آ گئے اور وہاں سے کومیلا چلے گئے۔ ۱۹۵۹ء تک کومیلا میں رہے، پھر ڈھاکا میں قیام پذیر ہو گئے اور سقوطِ ڈھاکا تک وہیں رہے۔ مختلف قسم کی ٹھیکہ داری کا کام کرتے رہے۔ مشاعروں میں شرکت کا شوق ہمیشہ برقرار رہا۔ ان کی

نظمیں اور غزلیں ہندو پاکستان کے رسالوں میں برابر شائع ہوتی رہیں۔ قیامِ مشرقی پاکستان کے دوران انھوں نے بے شمار نظمیں اور غزلیں کہیں۔

مقبول نقش کی شادی جمشید پور ہی میں ہو چکی تھی لیکن اہلیہ ایک بچے کی پیدائش کے بعد ہی رحلت کر گئیں۔ انھوں نے دوسری شادی کی۔ غالباً وہ کثیر العیال تھے۔ وہ جہاں بھی رہے اہل و عیال کے ساتھ رہے اور ان کی پرورش و کفالت کی ذمہ داری پوری طرح نبھاتے رہے۔

ان کی ایک طویل قومی نظم "جوئے خوں" ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ڈھاکا سے شائع ہوئی۔ اس نظم کے پیش لفظ میں پروفیسر نظیر صدیقی فرماتے ہیں:

"اگر دیانت داری کے ساتھ مشرقی پاکستان کے ممتاز اردو شاعروں کی کوئی فہرست مرتب کی جائے تو اس میں کہیں نہ کہیں مقبول نقش کا نام ضرور آئے گا۔ وہ یقیناً یہاں کے خوش فکر اور خوش رنگ شاعروں میں سے ہیں۔ انھیں یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ انھیں غزل اور نظم دونوں صنفوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ ان کے کلام کے جاذبِ توجہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ اس کا ذاتی محسوسات و مشاہدات پر مبنی ہونا ہے۔

"مقبول نقش ایک غریب خاندان کے شاعر ہیں۔ ان کی ساری زندگی غربت کے سائے میں مزدوری کرتے گزری اور گزر رہی ہے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے وہ جمشید پور میں ایک بہت بڑے لوہے کے کارخانے میں بحیثیت مکینک کام کرتے تھے۔ ۱۹۵۲ء میں پاکستان آنے کے بعد سے لے کر اب تک کسبِ معاش کے لیے مختلف قسم کی ملازمتیں کرتے رہے ہیں۔ ادھر کئی سال سے تعمیراتی کام کرانے والے کنٹریکٹروں کے یہاں مزدوروں کے نگراں کی حیثیت سے روٹی کما رہے ہیں۔ زندگی کی چکی کی مشقت کے ساتھ مشقِ سخن کا جاری رکھنا کتنا دشوار کام ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو شعر و سخن کی تخلیقی سرگرمیوں کے نازک تقاضوں سے واقف ہیں۔"

("جوئے خوں"، از راہِ تعارف۔ ص: ۱۱۔۱۳)

سقوطِ ڈھاکا کے بعد مقبول نقش کراچی آ گئے۔ یہاں بھی شعر و شاعری کا سلسلہ جاری رہا۔ ان کے حسبِ ذیل شعری مجموعے کراچی سے شائع ہوئے:

نوشتہ (غزلوں کا مجموعہ)۔ ۱۹۸۰ء۔ زہر آگہی۔ حرف و صوت۔ چشمِ خیال (رباعی، قطعہ، ثلاثی اور ہائیکو)۔ خوشبو کی دھنک (اُردو ماہیے)۔ حرف حرف میری کائنات (نعت)۔

مقبول نقش کراچی میں ۳۱ رجنوری ۲۰۰۵ء کو انتقال کر گئے اللہ مغفرت فرمائے!

نمونۂ کلام

"جوئے خوں" کے چند بند:

خطۂ پاک کے نوجواں الاماں
شعلہ خو، شعلہ رو، شعلہ سا الاماں
آ کے ٹکرا گئے ٹینک اور توپ سے
شور برپا ہوا الاماں الاماں

آگ اور خوں کا دریا رواں ہو گیا
سارا منظر دھواں ہی دھواں ہو گیا

فوج کے ساتھ ہی شہر والے اٹھے
وہ چھبیلے جواں وہ جیالے اٹھے
ٹینک، گن اور جہازوں کا کیا ذکر ہے
تیر، تلوار، بندوق، بھالے اٹھے

آج بھی شہر لاہور آزاد ہے
میرے داتا کا دربار آباد ہے

ہر قدم جنگ سے گرچہ بھونچال تھا
شہرِ اقبال پھر شہرِ اقبال تھا
سیال کوئی جواں سربکف آگئے
خوف سے دشمنوں کا برا حال تھا

شیر تھے چیرنے پھاڑنے کے لیے
کالے ہاتھی تھے چنگھاڑنے کے لیے

آگ پانی کے دامن پہ دہکا گئے
ریگ زاروں میں سیلاب خوں آگئے
آسماں پر جھپٹتے تھے شاہیں بچے
بحر و بر اور فضاؤں پہ ہم چھا گئے

رن پڑا اور گھمسان کا رن پڑا
بزدلوں کو فقط بھاگتے بن پڑا

غزل کے اشعار

کب تک یہ خلش سی سحر و شام رہے گی
اب میں رہوں یا گردشِ ایام رہے گا
انسان کو پابند تو کر سکتے ہو لیکن!
کیا فطرتِ انساں بھی تہہ دام رہے گی
کہہ دو کہ جنوں شمعِ یقیں بڑھ کے جلائے
کب تک یہ خرد کشتۂ ایام رہے گی

☆☆☆☆☆

اب کہیں شورِ سلاسل ہے نہ آوازِ جرس
قافلے شوق کے کیا جانے کہاں تک پہنچے
راہ میں چاند ستارے ہی نہیں عرش بھی ہے
اب یہ انسان کی ہمت ہے جہاں تک پہنچے
عشرتِ محض سے ہوتی نہیں تکمیلِ حیات
شرط ہے نشترِ غم بھی رگِ جاں تک پہنچے

☆☆☆☆☆

بازو ہیں شل قریب کنارا ہوا تو کیا
تنکے کا ڈوبتے کو سہارا ہوا تو کیا
مایوس ہو کے اٹھ گئے جب انجمن سے ہم
پھر آ کے کوئی انجمن آرا ہوا تو کیا
جس دل سے زندگی کی چمک چھین لی گئی
وہ دل کسی کی آنکھوں کا تارا ہوا تو کیا
اے نقش ہم تو پھر بھی تبسم بہ لب رہے
دل پاش پاش اگرچہ ہمارا ہوا تو کیا

☆☆☆☆☆

بنا کے حاصلِ عرفان و آگہی تجھ کو
تلاش کرتی ہے اب مجھ میں زندگی تجھ کو
خود اپنی ذات کا احساس بھی گراں گزرا
قریب پایا ہے اتنا کبھی کبھی تجھ کو
نہ ٹوٹ جائے کہیں علم و آگہی کا بھرم
خدایا ڈھونڈنے نکلا ہے آدمی تجھ کو

❖❖

ضحیٰ آروی

(اسلامی فکر و نظر کا حامل شاعر)

شمس الضحیٰ انصاری نام اور ضحیٰ آروی قلمی نام تھا۔ ضلع آرہ کے ایک گاؤں میں ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ چھتری اسکول، آرہ سے میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۴۹ء میں بی۔ اے پاس کرنے کے بعد کوچ بہار (مغربی بنگال) چلے آئے جہاں ان کے بڑے بھائی چمڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ ۱۹۵۱ء میں والد کی ہدایت پر مشرقی پاکستان آ گئے۔ یہاں ریلوے میں ملازمت مل گئی۔ چاٹگام میں پوسٹنگ ہوئی لیکن جلد ہی پاربتی پور تبادلہ ہو گیا۔ کلرکی ان کے مزاج کے خلاف تھی۔ لہٰذا ۱۹ر فروری ۱۹۵۵ء کو انھوں نے ریلوے کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور اگلے روز جناح ہائی اسکول، پاربتی پور سے منسلک ہو گئے اور آخر وقت تک وہ اسی اسکول سے وابستہ رہے۔ پہلے مدرس تھے، چند سال کے بعد ہیڈ ماسٹر بن گئے۔

ضحیٰ آروی ایک اچھے شاعر تھے۔ وہ بہت پہلے سے شعر کہتے تھے لیکن باقاعدہ شعر و شاعری کا آغاز اسکول میں ملازمت کے بعد ہوا۔ وہاں مولانا نعمت امام (عالم و ماہرِ فن شاعر) معلم تھے۔ شروع میں اپنا کلام انھیں دکھایا۔ ضحیٰ صاحب نظم بھی کہتے تھے اور غزل بھی۔ اسلامی فکر و نظر کے حامل تھے۔ بہت جلد وہ شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ ان کا کلام بھی رسالوں میں شائع ہوتا رہا۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد ضحیٰ صاحب کراچی آ گئے۔ لانڈھی میں قیام تھا۔ یہاں وہ

ایک سرکاری اسکول سے وابستہ تھے۔ ۱۹۸۷ء میں ان کی غزلوں کا مجموعہ "ذوقِ ضحیٰ" کراچی سے شائع ہوا۔ ۱۹۹۹ء میں وفات پا گئے۔ اللہ مغفرت فرمائے!

("محفل جو اجڑ گئی")

"ذوقِ ضحیٰ"

ضحیٰ آروی ایک زود گو اور پُر گو شاعر تھے۔ انھوں نے بے شمار نظمیں اور غزلیں کہیں لیکن ان کا سارا کلام سقوطِ مشرقی پاکستان کی نذر ہو چکا تھا۔ کراچی آ کر انھوں نے شعر گوئی تقریباً ترک کر دی تھی۔ لیکن اپنے بعض شاگردوں اور خاص طور پر مسعود عظیم آبادی کے اصرار پر اپنے مجموعۂ کلام کی اشاعت کے لیے چند مہینوں یا سال بھر میں ڈیڑھ سو غزلیں کہہ کر دے دیں۔ ایسے زود گو اور پُر گو شاعر بہت کم ملتے ہیں۔ "ذوقِ ضحیٰ" انھیں غزلوں کا مجموعہ ہے جسے مسعود عظیم آبادی نے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔ یہ ان کا اپنے استادِ محترم کے لیے ایک خوب صورت نذرانۂ عقیدت ہے۔

ضحیٰ صاحب کا طرزِ سخن اگرچہ قدیم انداز کا ہے لیکن اس میں کہنگی اور فرسودگی نہیں۔ انھوں نے اپنے کلام میں موجودہ حالات و کیفیات کی عکاسی بڑی خوبی سے کی ہے۔ خاص طور پر سابق مشرقی پاکستان کے مہاجروں کو سقوطِ ڈھاکا کے نتیجے میں جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور جن دردناک حالات سے گزرنا پڑا اور جس طرح دوسری ہجرت کی تکلیفیں اٹھانی پڑیں اور اس خطۂ ملک میں ان سے جو سلوک روا رکھا گیا، ان تمام باتوں کی ترجمانی ان کے کلام میں ملتی ہے۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاعری دراصل شاعر کی شخصیت کی ترجمان ہوتی ہے۔ لہٰذا شعری مطالعہ کے سلسلے میں شاعر کی شخصیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ضحیٰ صاحب کی شخصیت میں جو سادگی، خاکساری، نرمی، خلوص، دردمندی اور دینداری ہے، وہ ان کے اشعار میں بھی نمایاں ہے۔

نمونۂ کلام

''ذوقِ صحیٰ'' سے چند منتخب اشعار درج کیے جاتے ہیں:

محفلِ گل کوئی نہیں ہے گلستاں کوئی نہیں
عندلیب بے نوا کا آشیاں کوئی نہیں
کوئی اس ظلم و تشدد کا گلہ کس سے کرے
داد رس کوئی نہیں ہے، مہرباں کوئی نہیں

☆☆☆☆☆

سمجھ میں کیوں نہیں آتا کہ منزل کیوں نہیں آتی
زمانہ ہو گیا اب دشتِ غربت میں سفر کرتے

برق ایسی گری ہے گلشن پہ
کیا کریں ذکر آشیانے کا

فرقے کی بات ہے کہیں مسلک کا تذکرہ
لگتا ہے یوں کہ گویا مسلماں کوئی نہیں

دعائیں دن رات ہو رہی ہیں، لبوں پہ توبہ کا ورد جاری
اُدھر وہ مقتل بنا رہے ہیں، سجا رہے ہیں وہ قید خانہ

اپنا جو تھا وہ درپے آزار ہو گیا
گل ہم نے جس کو سمجھا تھا وہ خار ہو گیا

☆☆☆☆☆

یہاں تو اور بھی ہم اجنبی سے لگتے ہیں
سمجھ لیا تھا یہ ہم نے کہ اپنے گھر آئے

کیوں رہزنوں کا ذکر یہاں چھیڑتے ہیں آپ
اس وصف کو بھی دیکھئے جو رہبروں میں ہے

گھر سے بے گھر ہوئے معاذ اللہ
ہم نے کس جرم کی سزا پائی
دشت و صحرا کی خاک چھانی ہے
کہہ رہی ہے یہ آبلہ پائی

ہمیں تو یاد نہیں کس طرح کہیں ان سے
ہمارا گل تھا، گلستاں تھا، آشیانہ تھا

☆☆☆☆☆

وطن میں رہ کے غریب الوطن بنا ہوں میں
وہ کہہ رہے ہیں تمہارا کوئی دیار نہیں

☆☆☆☆☆

یہ خوش فہمی تھی اپنی یا کسی کی دل فریبی تھی
متاعِ زندگی اپنی لٹا دی، کھو دیا گھر بھی

☆☆☆☆☆

ہستیِ بے ثبات میں حُسنِ عمل کی ہے طلب
ایک شعاعِ زیست ہے چشمۂ آفتاب میں

کسی کی یہ شانِ کریمی ہے ورنہ
مری بندگی بھی کوئی بندگی ہے

تری زندگی کے صدقے تو رہے سدا سلامت
نہ گلہ کسی سے مجھ کو، نہ کسی سے ہے شکایت

تمام عمر گزاری ہے خود فریبی میں
نظر کے سامنے گویا طلسم خانہ تھا

کسی کے دل میں پیدا ہو اگر احساسِ خود داری
ضمیرِ مطمئن کے ساتھ وہ آزاد ہوتا ہے

☆☆☆☆☆

دلِ پژمردہ کھل اٹھتا، ذرا زحمت اگر کرتے
مری جانب بھی وہ لطف و کرم کی اک نظر کرتے
کسے معلوم تھا کہ ضبط و غم کی آزمائش ہے
نہ دل ہی مضطرب ہوتا، نہ یوں ہم چشمِ تر کرتے

☆☆☆☆☆

وہ حسنِ بے مثال سراپا ہے رنگ و بو
صحنِ چمن میں ایسا کہاں کوئی پھول ہے

☆☆☆☆☆

جب سامنا ہوا تو زباں بند ہو گئی
کہنا جو تھا وہ کہہ دیا ہم نے نگاہ سے

☆☆☆☆☆

بے اختیار جھکتا ہے اس پہ سرِ نیاز
کوئی تو بات آپ کے نقشِ قدم میں ہے

☆☆☆☆☆

جو آنا ہو تو آ جاؤ کہ یہ فرصت غنیمت ہے
کہیں ناگاہ چپکے سے نہ آ جائے قضا میری

❖❖

سیفؔ حسن پوری

(پختہ گو شاعر)

سوانحی خاکہ:

نام: سیف الدین ملک

قلمی نام: سیف حسن پوری

تاریخ پیدائش: نومبر ۱۹۲۵ء (کاغذات میں سال پیدائش: ۱۹۳۰ء)

تعلیم: میٹرک، پٹنہ یونیورسٹی، ۱۹۴۶ء، انٹر اور بی۔اے (ڈھاکا یونیورسٹی)

ملازمت: محکمۂ ڈاک

پہلی ہجرت: ڈھاکا۔ غالباً ۱۹۵۰ء

دوسری ہجرت: سقوطِ ڈھاکا کے بعد۔ کراچی

ملازمت سے سبکدوشی: یکم جنوری ۱۹۹۰ء۔ کراچی

وفات: یکم فروری ۲۰۰۶ء۔ کراچی

اولاد: متعدد بیٹے بیٹیاں

''کشش''

سیفؔ حسن پوری کا پہلا اور آخری مجموعہ ''کشش'' ۱۹۹۹ء میں کراچی سے شائع ہوا۔

مجموعہ ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں حمد و نعت کے بعد ۹۵ غزلیں اور آخر میں چند قطعات اور رباعیات ہیں۔

سیف حسن پوری نے عمر کا ایک بڑا اور بہترین حصّہ مشرقی پاکستان میں گزارا۔ ان کی شعر و شاعری کی نشو و نما دراصل وہیں ہوئی، وہ مشاعروں کے شائق نہ تھے لیکن مخصوص ادبی نشستوں میں شریک ہوتے رہتے تھے۔ الطاف گوہر نے ڈاکٹر حنیف فوق وغیرہ کے تعاون سے ''حلقۂ اربابِ ذوق'' کی شاخ ڈھاکے میں قائم کی تھی، جس کی نشستیں عموماً ڈھاکا یونیورسٹی میں ہوتی تھی۔ سیف حسن پوری بھی اکثر شریک ہوتے تھے اور ''سانیٹ'' سنایا کرتے تھے۔ وہ اس زمانے میں بہت اچھے سانیٹ لکھتے تھے۔ وہ وہاں ایک جدید نظم نگار کی حیثیت سے معروف تھے۔ غزلیں بھی کہتے تھے۔ پروفیسر فروغ احمد کی تحریک ادب اسلامی سے بھی ان کا تعلق تھا۔ اس کی نشستوں میں بھی وہ شریک ہوتے تھے۔

کراچی آنے کے بعد سیف حسن پوری مرحوم نے زیادہ تر غزلیں کہیں۔ لہٰذا زیرِ نظر مجموعہ غزلوں ہی پر مشتمل ہے۔ افسر ماہ پوری (وفات: ۱۹۹۵ء) نے اس کتاب پر ایک تفصیلی مقدمہ ''سیف حسن پوری۔ ایک عزلت پسند خوش فکر سخنور'' کے عنوان سے لکھا ہے، جس پر تاریخ ۷ اردسمبر ۱۹۹۰ء درج ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ شائع ہونے سے نو سال پہلے مرتب ہو چکا تھا۔ افسر صاحب لکھتے ہیں:

> ''سیف حسن پوری تقریباً چالیس سال سے گیسوئے شاعری کی مشاطگی میں مصروف ہیں۔ ان کی زندگی اور شاعری کا بہترین دور ڈھاکے (سابق مشرقی پاکستان) میں گزرا۔''

(''کشش''۔ ص: ۱۳)

منتخب اشعار

افقِ ذہن سے بھولے ہوئے پیکر ابھرے
حُسن کے باب کھلے، رنگ کے منظر ابھرے

مدتوں کرتے رہے، خونِ جگر سے سیراب
ریت سے پھر بھی نہ بوٹے نہ گلِ تر ابھرے

ایسے بھی ہوتے ہیں کچھ لوگ عزیمت والے
دل ہو خوں اور شکن تک نہ جبیں پر ابھرے

سطحِ دریا پہ نظر رکھیے، کسی دن شاید
کوئی سیپی، کوئی مرجاں، کوئی گوہر ابھرے

سیفؔ جن لوگوں نے دنیا میں بدی پھیلائی
انھیں لوگوں کی صفوں میں سے پیمبر ابھرے

☆☆☆☆☆

ہوتے ہیں نئے تجربے دنیائے ہنر میں!
تجھ میں بھی اپج ہو تو نئی طرح ہنر ڈال

کوشش نہ ہو مشکور تو دل گیر نہ ہو سیفؔ
ناکامیِ تدبیر کو تقدیر کے سر ڈال

☆☆☆☆☆

افکار کے ہجوم میں زندہ دلی کہاں
گہنا گیا ہو چاند تو پھر چاندنی کہاں

آندھی اٹھے تو آدمی میداں میں ڈٹ جائے
اولے پڑیں تو بھاگ کے جائے کوئی کہاں

باتیں ہیں ساری اہلِ سخن کی کہی ہوئی
باقی رہی ہے بات کوئی ان کہی کہاں
ناراستی ہوئی ہے نئے دور کی شناخت
اب موجبِ رضائے خدا راستی کہاں
بھاتا نہیں ہے کچھ بھی پریشانیوں میں سیفؔ
کوئل کی کوک ہو کہ پپیہے کی پی کہاں

☆☆☆☆☆

جھلملا اٹھے ہیں تارے سے جو پلکوں پر کبھی
شکر کا اظہار کرتے ہیں، گلہ کوئی نہیں

☆☆☆☆☆

اشکِ غم آ ہی گیا نوکِ مژہ پر آخر
رازِ دل چھپ نہ سکا دیدۂ تر کے پیچھے

شمیم نسرین

(ایک ممتاز شاعرہ)

سوانحی خاکہ

نام: رفیعہ حق

قلمی نام: شمیم نسرین

شریکِ حیات کا نام: ملک انوار الحق (پولیس افسر)

تاریخِ پیدائش: دسمبر ۱۹۲۵ء

مقامِ پیدائش: استھاواں (بہار)

پہلی ہجرت: تقسیم کے بعد۔ قیام چاٹگام، راجشاہی، ڈھاکا

دوسری ہجرت: سقوطِ ڈھاکا کے بعد۔ کراچی

وفات: ۲۲ر جولائی ۲۰۰۹ء

اولاد: چار بیٹے، تین بیٹیاں

''خوابوں کے ویرانے''

محترمہ شمیم نسرین کا شعری مجموعہ ''خوابوں کے ویرانے'' ۱۹۹۹ء میں کراچی سے شائع

ہوا۔ یہ مجموعہ ۲۷۸ صفحات اور ۴۶ غزلوں اور ۹۷ نظموں پر مشتمل ہے۔ چند گیت، چند قطعات اور متفرقات وغیرہ بھی شامل ہیں۔

محترمہ شمیم نسرین کی زندگی کا ایک بڑا اور خاص حصّہ مشرقی پاکستان میں گزرا۔ شعرو شاعری کا آغاز بھی انھوں نے یہیں سے کیا۔ اس دور کے اکثر و بیشتر ادبی رسالے ان کے یہاں آتے رہتے تھے جن میں ان کا کلام بھی چھپتا رہتا۔ اس طرح ان کے سب بچوں کی تعلیم و تربیت شعرو ادب کی آغوش میں ہوئی۔ صاحب مجموعہ شاعر اعجاز الحق اعجاؔز ان کے بیٹے اور مشہور افسانہ نگار شہناز پروین ان کی بیٹی ہیں۔ ان کی دوسری اولاد میں بھی لکھنے لکھانے کا شوق موجود ہے۔ ان کے شوہر ملک انوار الحق ایک پولیس افسر تھے، جنھیں ادب سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ وہ ان کا شعر کہنا پسند نہ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قلمی نام سے لکھتی رہیں۔

محترمہ شمیم نسرین کے کلام میں جدید و قدیم کا بڑا اچھا امتزاج ملتا ہے۔ انھوں نے آزاد نظمیں بھی لکھیں اور پابند بھی۔ ان کی شاعری کے بارے میں استادِ محترم ڈاکٹر حنیف فوؔق لکھتے ہیں:

''شمیم نسرین کا نام آج کچھ 'ناشنیدہ' معلوم ہوتا ہے، لیکن ایک زمانے میں ان کا کلام ادبی رسالوں کی زینت بنتا رہا تھا۔ ان کے کلام میں ادبی روایات کا تسلسل بھی ہے اور اردو شاعروں نے جدید سمتوں میں جس سفر کا آغاز کیا تھا اس کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ شمیم نسرین نے یوں تو درونِ خانہ بڑی محفوظ زندگی گزاری ہے لیکن وہ معاشرے کی اس ذہنی زندگی میں شریک رہیں جس کا آغاز حالؔی کے دور سے ہوا تھا۔ وہ جس معاشرے اور ماحول کی ترجمان ہیں اس میں کسی خاتون کا شعروشاعری کی جانب مائل ہونا ہی اپنے اندر احتجاجی صفت رکھتا تھا۔ چنانچہ شمیم نسرین کے لیے شعر گوئی کو ایک لحاظ سے معاشرتی صورتِ حال کے خلاف احتجاج بھی کہا جاسکتا ہے اور خود کلامی کی صورت بھی۔''

(دیباچہ ''خوابوں کے ویرانے'')

نمونۂ کلام:

ذیل میں غزلوں کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

دھواں دھواں ہے سارا منظر ہر سو بادل بادل سا
جھیل سی نیلی آنکھوں میں ہے ایک سُلگتا جنگل سا
درد کے صحراؤں میں شاید اشکوں کی برسات ہوئی
نمی نمی سی پلکوں پہ ہے، پھیلا پھیلا کاجل سا
خونِ شہیداں نے گو بخشا رنگِ بہاراں گلشن کو
چشمِ تحیر نے جو دیکھا دل ہے اب تک بوجھل سا
دیدۂ گریاں، زلفِ پریشاں، ہاتھوں میں کشکول لیے
راہِ طلب میں بڑھتا جائے جیسے کوئی سائل سا
دوست نہیں تو شاید کوئی دشمن ہی پہچان سکے
دشتِ وفا میں کون پڑا ہے نسریں گھائل گھائل سا

☆☆☆☆☆

دو دن بھی خوش رہے نہ جہانِ خراب میں
ساقی! ذرا سا زہر ملا دے شراب میں
یہ سازِ زندگی ہے عجب ساز ہم نشیں!
فطرت نے چھیڑ کر ہمیں ڈالا عذاب میں
یہ آرزو تھی اک دلِ درد آشنا ملے
یوں تشنہ لب رہے ہیں تلاشِ سراب میں
نسریںؔ نہ چھیڑ بیہر خدا سازِ آرزو
نغمے کہاں سے آئیں شکستہ رباب میں

زندگی سو فریب دیتی ہے
لوگ پیہم فریب کھاتے ہیں

ان خلاؤں میں کسے ڈھونڈ رہی ہے نسرین
کوئی ہمدم نہیں، مونس نہیں، دمساز نہیں

☆☆☆☆☆

اک تجسس، اک تمنا، ایک پیہم اضطراب
اک مسلسل کشمکش ہے دل کے افسانے کا نام

☆☆☆☆☆

پھول دامن میں سمیٹے تھے مگر خاروں نے
نشترِ غم مرے سینے میں اتارے کیسے

☆☆☆☆☆

گزری ہے عمر ساری سایوں سے پیار کرتے
کب تک جئیں گے آخر ذکرِ بہار کرتے

❖❖

عبداللہ ہلال صدیقی

(اسلام اور پاکستان کا شیدائی)

سوانحی خاکہ

نام: ابوالمظفر محمد عبداللہ

قلمی نام: عبداللہ ہلال صدیقی

تاریخ پیدائش: ۱۲ر جنوری ۱۹۲۷ء

مقامِ پیدائش: چھپرا (بہار)

تعلیم: بی۔اے آنرز (معاشیات)

پہلی ہجرت: ۱۹۴۷ء۔ کراچی

مشرقی پاکستان منتقلی: ۱۹۵۲ء۔ ڈھاکا۔ چاٹگام

دوسری ہجرت: ۱۹۶۰ء۔ کراچی

پیشہ: تجارت۔ مشیر مالیات

وفات: چند سال قبل کراچی میں ان کی وفات ہوگئی

اولاد: کئی بیٹے اور بیٹیاں ہیں جواب خود صاحب اولاد ہیں

"حریفِ سنگ"

عبداللہ ہلالؔ صدیقی نے باقاعدہ شعر و شاعری کا آغاز ۱۹۵۲ء سے ڈھاکے میں کیا۔ ۱۹۵۴ء میں چاٹگام منتقل ہو گئے۔ ۱۹۶۰ء تک وہاں قیام رہا۔ یہ ان کی شاعری کا سنہرا دور ہے۔ اس دور کی کہی ہوئی تمام نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "حریفِ سنگ" ۱۹۷۷ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ ہلالؔ صدیقی صاحب ایک زود گو اور پُر گو شاعر تھے۔ وہ اسلام اور پاکستان کے شیدائی تھے۔

ہلالؔ صاحب کی شاعری پر زبان و بیان اور موضوع دونوں لحاظ سے علامہ اقبال کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ روایتی قسم کے اشعار اور حُسن و عشق کے چٹخارے ان کے یہاں بالکل نہیں۔ "حریفِ سنگ" میں اپنا منظوم تعارف پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہجر و وصال سے بَری میری تمام شاعری
امنِ جہاں کا فکر ہے، حُبِّ وطن کی بات ہے
ایک جہانِ عزم ہے میرا کلامِ رزم و بزم
اس میں نہ حُسن و عشق ہے اس میں نہ فن کی بات ہے

ہلالؔ صدیقی کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں اسلام سے والہانہ لگاؤ ہے۔ مفلسی اور سرمایہ داری ان کے خاص موضوعات ہیں لیکن ان کا علاج وہ اشتراکیت سے نہیں بلکہ اسلام کے عادلانہ نظام سے کرنا چاہتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

سرمایہ و محنت کی کشاکش سے گزر کر
اسلام کی تعلیمِ مساوات کو بھی جان!

☆☆☆☆☆

روس و چین کا ذکر کیوں ہو، کیوں نہ ہو ذکرِ حجاز
پھول کے رہتے ہوئے کیوں خار کی باتیں کریں

نمونۂ کلام

حرم و شکم (نظم)

اُن فاقہ کشوں ہی پہ ہے بنیاد حرم کی
کچھ فکر تھی دنیا میں جنھیں بیش نہ کم کی
ایسا بھی نہیں اُن کے موافق تھا زمانہ
باطل سے مگر ڈر کے نہ گردن کبھی خم کی
مومن تنِ خاکی میں ہے بیزار شکم سے
یہ دل کا غنی راہ نہ بھولا ہے حرم کی
اے تشنہ لباں لذّتِ دولت ہے خطرناک
اس دولتِ خوش رنگ میں تاثیر ہے سم کی
تعمیر جہاں کا ہے عیاں راز حرم میں
انسان کی غارت گری پنہاں ہے شکم میں

حمد

ہر ایک بندہ محتاج تیرا، تخلیق تیری عالم یہ سارا
الملک للہ الحکم للہ، پروردگارا، پروردگارا
جب جب بھی میں نے بے تاب ہو کر اپنے غموں میں تجھ کو پکارا
دل نے سنی ہے آواز تیری، تو نے دیا ہے بڑھ کے سہارا
بندہ نوازی رحمت شعاری ایں نکتہ ہا را دانم نیازم
من بے نوایم حمد سرایم شاہد نوازی تو ایں گدا را

تیرے کرم کے کیا کیا کرشمے دنیا میں یارب دیکھے ہیں میں نے
بگڑے ہوؤں کو تو نے سنوارا، ڈوبے ہوؤں کو تو نے ابھارا
کیا تیری رحمت کا کچھ بیاں ہو، ہمت جو ہو بھی قاصر زباں ہو
غربت، امارت، سب تیری رحمت، جس کو بھی جیسا چاہا نکھارا
شعلوں میں پنہاں رازِ خلیلیؑ، لکنت میں پنہاں رمزِ کلیمیؑ
زندانِ چاہ، اسرارِ شاہی، وہ ماہِ کنعاں وہ ماہ پارا

غزل کے اشعار

مٹ کر بھی زمانے میں رہے زندۂ جاوید
ہر دور میں ہے بندۂ حق کے لیے جاں اور

اگر ہو پہلو میں خودنگر دل تمام عالم ہے آگہی کا
سنبھال تو یہ چراغ اسی سے چراغ جلتا ہے زندگی کا
جو تو ہے اپنا تو سب ہیں تیرے خدائی تیری خدا بھی تیرا
جو آپ اپنا نہیں بنا تو نہ کوئی تیرا نہ تو کسی کا
وہ دل کی عبرت کا اک مرقع، یہ سوز و حسرت کا اک فسانہ
قلندری کا بھی حال دیکھا، مآل دیکھا سکندری کا
بپا تھا ہنگامہ گلستاں میں وہ چہچہے تھے وہ قہقہے تھے
اُڑا رہی تھی بہار گویا مذاقِ انسان کی خوشی کا
جو دیکھتا ہوں تو کچھ نہیں ہے، جو سوچتا ہوں تو کیا نہیں ہے
عمل یہ ہے انحصار اس کا مقام جو کچھ ہے آدمی کا

❖❖

پروفیسر مظفر حسین رزمیؔ

(شاعر، ناقد)

سیّد مظفر حسین نام اور رزمیؔ تخلص تھا۔ کسمر، سونپور، ضلع سارن (بہار) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں ڈھاکا آئے اور یہیں اپنی تعلیم مکمل کی۔ ۱۹۵۶ء میں ڈھاکا یونیورسٹی سے اُردو میں ایم۔اے کیا اور قایدِ اعظم کالج، ڈھاکا میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۱ء تک سرکاری کالجوں میں پڑھاتے رہے۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد اسلام آباد گئے۔

پروفیسر مظفر حسین رزمیؔ ایک خوش گو اور خوش فکر شاعر تھے۔ ان کے کلام میں ایک خاص لطف واثر پایا جاتا تھا۔ مشاعروں اور ادبی محفلوں میں بھی شریک ہوتے رہے۔ رسالوں میں ان کا کلام بھی چھپتا رہا۔

رزمیؔ صاحب نے بہت سے تنقیدی مضامین بھی لکھے جو رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ وہ ملازمت کے سلسلے میں ایک عرصے تک اسلام آباد میں مقیم رہے۔ یہیں سے ان کا خوب صورت مجموعۂ کلام "خواب کی ریت" ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ تین سال تک ان کا قیام چین میں بحیثیت اُردو لینگویج اکسپرٹ رہا۔ اس دوران انھوں نے ماوزے تنگ کی اکتالیس (۴۱) نظموں کا منظوم ترجمہ کیا جو وہیں سے شائع ہوا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد وہ وزارتِ تعلیم، حکومتِ پاکستان، اسلام آباد میں بحیثیت اسسٹنٹ ایجوکیشنل ایڈوائزر کام کرتے رہے۔ ریٹائر ہونے سے ایک سال قبل ۱۹۹۳ء میں ان کا اسلام آباد میں انتقال ہوگیا۔ اللہ مغفرت فرمائے!

ان کے والد رمز کسری بھی ایک کہنہ مشق اور پختہ گو شاعر تھے۔ ایک عرصے تک ڈھاکے میں رہے۔ رحمت اللہ ہائی اسکول میں معلم تھے۔ ڈاکٹر شادانی ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور اپنے مشاعروں میں انھیں مدعو کیا کرتے تھے۔ سقوط ڈھاکا کے بعد وہ اپنے وطن واپس چلے گئے۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ وہ پاکستان آجائیں لیکن یہ خواہش پوری نہ ہوئی اور وہ وہیں وفات پاگئے۔

جناب رضا دائروی کے بقول رزمی صاحب کا نام ''مظفر حسین'' تاریخی ہے جس سے ۱۳۴۸ھ برآمد ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی پیدائش ۱۹۲۹ء میں ہوئی۔ جب کہ میٹرک کے سرٹیفکیٹ کے مطابق ان کی تاریخ پیدائش ۲۲ر جنوری ۱۹۳۴ء ہے۔

(''محفل جو اجڑ گئی'')

نمونہ کلام

جذبۂ دل کا اثر کس پہ ہوا آخرِ شب
کون پیمانِ وفا باندھ گیا آخرِ شب

کس کو یاد آ گئے ہم، کس نے پکارا ہم کو
کون دیتا ہے درِ دل پہ صدا آخرِ شب

دل سلگ اٹھتا ہے بڑھ جاتی ہے بے تابیِ جاں
جب سنکتی ہے ذرا سرد ہوا آخرِ شب

دل پہ اک چوٹ سی لگتی ہے جو یاد آتا ہے
مجھ سے مل کر ترا ہونا وہ جدا آخرِ شب

جانے کس رنگ میں ہوتی ہے سحر کون کہے
آئی غنچوں کے چٹکنے کی صدا آخرِ شب

میرے غم خانے میں ہو جاتی ہے یادوں کے طفیل
وقت سے پہلے سحر جلوہ نما آخرِ شب

آؤ غم خانۂ رزمی میں تو دکھلائیں تمھیں
دلِ بسمل کے تڑپنے کی ادا آخرِ شب

امیرِ شہر کے رنگِ جنوں کی بات کرو
غریبِ شہر کا قصہ تو اب پرانا ہوا
کبھی جو وقت پڑا پاس تھا نہ دور کوئی
ہمارا ذکر بہت یوں تو غائبانہ ہوا

☆☆☆☆☆

یہ دیکھیے کہ کس کو زمانے نے کیا دیا
جو بے نیازِ علم رہے، محترم ہوئے
اس اک نگاہِ خاص کا حاصل نہ پوچھیے
بارِ غمِ جہاں سے سبک دوش ہم ہوئے
دیکھا اسے تو پایا سراپا وفا شعار
رزمی سے مل کے آج بہت شاد ہم ہوئے

☆☆☆☆☆

کچھ اور دیر ٹھہر دل میں روشنی کر لیں
نظر کو فرصتِ بارِ دگر ملے نہ ملے!
اندھیری رات کو اک کہکشاں بناتے چلو
درازیٔ شبِ غم کی سحر ملے نہ ملے

☆☆☆☆☆

رات رخصت ہوئی بجتے ہیں گجر آگے چل
ہونے والی ہے تمنا کی سحر آگے چل

❖❖

روشن علی عشرتؔ

(شاعر و استادِ سخن)

نام روشن علی اور عشرتؔ تخلص تھا۔ ۱۹۳۱ء میں کلکتے میں پیدا ہوئے۔ والدین کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔ ان کے والد کلکتے میں کاروبار کرتے تھے۔ عشرتؔ کی عمر چھ ماہ کی تھی کہ ان کے والد انتقال کر گئے۔ ان کی والدہ نے ان کی پرورش کی۔ ان کے رشتے کے چچا ناوکؔ لکھنوی (تلمیذ علامہ آرزو لکھنوی) کے زیر نگرانی ان کی تعلیم و تربیت ہوئی انٹر تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد محکمہ ٹیلی فون میں ملازم ہو گئے۔

بچپن سے انھیں ادبی ماحول ملا تھا۔ لہٰذا کم عمری ہی میں شعر کہنے لگے اور آرزو لکھنوی کے جانشین پرتو لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ وہ بہت جلد شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۶ء تک ہز ماسٹرس وائس ریکارڈنگ کمپنی کے لیے نغمات اور قوالیاں لکھیں۔

عشرتؔ صاحب ۱۹۶۴ء میں کلکتہ کے ہندو مسلم فسادات سے دل برداشتہ ہو کر ڈھاکا چلے آئے۔ یہاں انھیں بڑا اچھا ادبی ماحول ملا۔ مشاعروں کی شرکت اور شعر و شاعری کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ کچھ دنوں تک فلمی نغمے بھی لکھے۔ بھوانی جوٹ مل میں ملازمت مل گئی جہاں وہ ڈسپنسری میڈیکل اسٹور کے انچارج کی حیثیت سے سقوطِ ڈھاکا تک کام کرتے رہے۔

سقوطِ ڈھاکا کے بعد عشرتؔ صاحب "جرمِ وفا" میں آٹھ ماہ جیل میں رہے۔ جیل سے رہائی کے بعد اک سال محصورین کے کیمپ میں رہے۔ ۱۹۷۳ء میں ریڈ کراس کے ذریعہ تبادلہ ہوا

اور وہ مع اہل و عیال لاہور ہوتے ہوئے کراچی پہنچ گئے۔ ایک مدت تک محمود آباد میں قیام رہا۔ یہاں انھوں نے ''دبستانِ آرزو'' قائم کیا اور ان سے بہت سے نوجوان اصلاح بھی لیتے رہے۔

کراچی میں عشرت صاحب کے دو مجموعے شائع ہوئے۔ ۱۹۸۴ء میں ان کی غزلوں کا مجموعہ ''صلیب'' اور ۱۹۹۹ء میں نعت و منقبت کا مجموعہ ''شاخِ طوبیٰ'' شائع ہوا۔

عشرت صاحب نے ایک طویل عرصہ کلکتے میں گزارا، مشرقی پاکستان میں سات آٹھ سال رہے اور کراچی میں کم و بیش ۲۷ سال، لیکن جو سکون اور خوش گوار ادبی ماحول انھیں ڈھاکے میں ملا وہ کہیں اور نہ مل سکا۔ وہ مرتے دم تک ڈھاکے کو یاد کرتے رہے۔ طویل علالت کے بعد جنوری ۲۰۰۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اللہ مغفرت فرمائے!

(''محفل جو اجڑ گئی'')

کراچی آنے سے پہلے وہ ''عشرت کلکتوی'' کے نام سے لکھتے تھے۔ کراچی آ کر روشن علی عشرتؔ کے نام سے لکھنے لگے اور ان کے مجموعے بھی اسی نام سے شائع ہوئے۔

نمونۂ کلام

روشن علی عشرتؔ کی دو غزلیں درج کی جاتی ہیں:

چراغ ہی نہیں سینہ سپر تو ہم بھی ہیں
ہوا کی زد میں سرِ رہ گزر تو ہم بھی ہیں

میانِ شہرِ سخن معتبر تو ہم بھی ہیں
ہمارا نام بھی لے حرف گر تو ہم بھی ہیں

خلوص مانگتے پھرتے ہیں ہم بھی شہر بہ شہر
نگاہِ خلق میں دریوزہ گر تو ہم بھی ہیں

قفس نصیب پرندوں کا جب بھی ذکر چھڑا
خیال آیا کہ بے بال و پر تو ہم بھی ہیں
ہمیشہ ہم سے نہ رکھ تو فرشتگی کی امید
خطائیں ہم سے بھی ہوں گی بشر تو ہم بھی ہیں
اب اس سے بڑھ کے مساواتِ عشق کیا ہوگی
وہ لامکاں ہے اگر دربدر تو ہم بھی ہیں
دکھوں کے دشت میں عشرتؔ تمھیں نہیں تنہا
قدم قدم پہ شریکِ سفر تو ہم بھی ہیں

☆☆☆☆☆

مقتل میں رات جشنِ مسرت بپا رہا
بسمل کا رقص دیکھ کے وہ جھومتا رہا
قصرِ امیرِ شہر میں جلتا رہا لہو
گھر بے دیا غریب کا تھا بے دیا رہا
عقدہ شناسِ وقت رہے محوِ ناؤ نوش
میں وقت کی جبیں پہ شکن دیکھتا رہا
مجھ کو سزائے دار نہ خاموش کر سکی
میں چپ رہا تو میرا لہو بولتا رہا
جو زخم پتھروں نے دیے تھے وہ بھر گئے
اک زخم پھول نے جو دیا تھا ہرا رہا
اک جامِ مے نے کر دیا مجھ کو گناہگار
وہ پی کے آدمی کا لہو پارسا رہا

رستے میں قافلے پہ نہ شب خوں کہیں پڑے

یہ سوچ کر صلیب پہ میں جاگتا رہا

عشرتؔ مرحوم غزلوں کے شاعر تھے لیکن کبھی کبھی نظم بھی کہہ لیتے تھے۔ ان کے مجموعہ "صلیب" کے آخر میں تین نظمیں بھی ہیں۔ ایک نظم ڈھاکا سینٹرل جیل (۱۹۷۲ء) میں "داغ داغ اجالا" کے عنوان سے لکھی ہوئی بھی شامل ہے۔ اس کے دو بند دیکھیے:

شب الم کی طرح تھرتھرا رہی ہے کرن

لہو لہو نظر آتی ہے شاہراہِ وطن

نفس نفس پہ تعصب کا رنگ گہرا ہے

قدم قدم پہ عداوت کا سخت پہرا ہے

سیاہ دھبے ابھرنے لگے اجالوں سے

کچھل کے زخم ٹپکنے لگا خیالوں سے

رُخِ حیات پہ جلوہ خوشی کا عام نہیں

سحر ہوئی ہے مگر روشنی کا نام نہیں

دلوں میں بھڑکی ہے کچھ ایسی انتقام کی آگ

دماغ مائلِ سازش، لبوں پہ عدل کے راگ

لہو میں ڈوبا ہوا ہے پیامِ آزادی

روا ہے جبر و تشدد بنامِ آزادی

سحر کا نور ہے گم شام کے دھندلکے میں

حیات کانپتی ہے موت کے شکنجے میں

لہو نہ جس میں چھلکتا ہو اب وہ جام نہیں

سحر ہوئی ہے مگر روشنی کا نام نہیں

❖❖

قمر بریلوی
(نعت گو)

قمر بریلوی کا نام محمد آفاق حسین صدیقی تھا۔ ۱۹۳۲ء میں بانس بریلی (یو پی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد فیاض حسین صدیقی ریلوے میں ڈرائیور تھے۔ تقسیم کے بعد جنوری ۱۹۴۸ء میں وہ پار بتی پور (مشرقی پاکستان) آ گئے۔ قمر بھی والدین کے ساتھ تھے اور اس وقت ان کی عمر ۱۵ سال تھی۔

قمر بریلوی نے اپنے نعتیہ مجموعہ "وفورِ شوق" کا جو دیباچہ لکھا ہے اس میں اپنی تعلیم کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اسکول یا کالج میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ اس دیباچے میں وہ لکھتے ہیں کہ ۱۹۵۴ء میں ان کی شادی ہو گئی اور انھیں معاش کی فکر ہوئی۔ اس سلسلے میں وہ کھلنا آ گئے۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد خالص پور پیپلز جوٹ مل میں انھیں سیکوریٹی گارڈ کی نوکری مل گئی۔ خالص پور، کھلنا میں کئی جوٹ مل تھے اور ایک پیپر مل بھی تھا۔ وہاں کام کرنے والے زیادہ تر مہاجر تھے۔ لہٰذا وہاں ایک ادبی ماحول بھی پیدا ہو گیا ہر ماہ مشاعرے اور ادبی نشستیں ہوتی تھیں۔ قمر بریلوی بچپن سے ادبی ذوق رکھتے تھے۔ ماحول سازگار ملا تو شعر کہنے لگے اور خمار دیو بندی کو، جو ایک کہنہ مشق شاعر تھے، اپنا کلام دکھانے لگے۔

قمر بریلوی ۱۹۶۳ء میں گھومنے پھرنے کی غرض سے ڈھاکا آئے۔ خوش قسمتی سے انھیں بڑی آسانی سے پی آئی اے میں سیکوریٹی گارڈ کی ملازمت مل گئی۔ یہاں وہ حافظ دہلوی کے تلامذہ

میں شامل ہو گئے۔

سقوطِ ڈھاکا کے بعد قمر بریلوی مع اہل و عیال کراچی آ گئے۔ شعر و شاعری کا سلسلہ جاری رہا۔ نعت گوئی کی طرف خصوصی توجہ ہو گئی۔ انھوں نے اپنی نعتوں کا مجموعہ ''وفورِ شوق'' کے نام سے مرتب کیا جو ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد ۱۸ر فروری ۲۰۰۰ء کو قمر بریلوی کی وفات ہو گئی۔ اللہ مغفرت فرمائے!

''وفورِ شوق''

''وفورِ شوق'' میں ۷ حمد، ۷۶ نعتیں اور چار منقبتیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک اچھا اور منفرد مجموعہ ہے۔ قمر بریلوی کی تعلیم اگرچہ معمولی تھی لیکن ان کا مطالعہ وسیع تھا جس کا اظہار ان کے کلام سے ہوتا ہے۔ وہ ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔ انھیں زبان و بیان پر عبور حاصل تھا۔ ان کے یہاں فکر و نظر کی کوئی خامی نظر نہیں آتی۔ اسلامی تعلیمات کا وہ بہت اچھا شعور رکھتے تھے۔

نعت گوئی کے لیے عقائد کی درستی اور قرآن و سنت کا علم ہونا ضروری ہے۔ محض عقیدت و محبت کی بنیاد پر نعت گوئی نہیں ہو سکتی۔ اُردو کے اکثر نعت گو شعرا توحید و رسالت کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔ وہ عقیدت و محبت کے غلو میں رسولؐ کو بھی خدائی صفات سے متصف کر دیتے ہیں۔ انھیں اس کا فہم و ادراک نہیں کہ اسی کو شرک کہا گیا ہے جو ''ظلمِ عظیم'' اور ''گناہِ عظیم'' ہے۔ قمر بریلوی کی نعتوں میں ایسے اشعار نہیں ملتے۔

نمونۂ کلام

حمد

تو ہے رحمٰن اے مولا، رحیمی ہے صفت تیری
تو ہی مختارِ کل ہے، مالکِ روزِ جزا تو ہے

ہدایت کی طلب میں تیری چوکھٹ پہ جبیں رکھ دی
مجھے دکھلا دے سیدھی راہ، کامل رہنما تو ہے
ترے انعام ہیں جن پر انھیں کا راستہ دکھلا
مجھے دکھلا نہ ان کا راستہ جن سے خفا تو ہے
تو بے شک پاک ہے، بے عیب ہے، قادر ہے ہر شے پہ
میں عاصی ہوں تو ہے غفار، میں بندہ خدا تو ہے
تو ہی اوّل تو ہی آخر، تو ہی ظاہر تو ہی باطن
ازل سے تا ابد ہی لائقِ حمد و ثنا تو ہے

نعت

محمدؐ سا کوئی فخرِ بشر آیا نہ آئے گا
کوئی ایسا انیس و راہبر آیا نہ آئے گا
فتحِ مکہ میں اعلانِ معافی کر دیا، ایسا
خطائیں کرنے والا در گزر آیا نہ آئے گا
مسلماں تو مسلماں غیر مسلم بھی یہ کہتے ہیں
محمدؐ سا امین و معتبر آیا نہ آئے گا
خدا ہی جانتا ہے اس نے کتنے انبیا بھیجے
محمدؐ سا نبی کوئی مگر آیا نہ آئے گا
بدل کر رکھ دیا دل کو، دماغوں کو، نگاہوں کو
محمد مصطفیٰ سا چارہ گر آیا نہ آئے گا
دکھا دی راہ منزل کی، مٹا دی ہر خلش دل کی
محمدؐ سا کوئی پیغام بر آیا نہ آئے گا

شکیلوں میں شکیل اوّل، جمیلوں میں جمیل اوّل
محمدؐ سا کوئی رشکِ قمرؔ آیا نہ آئے گا

چند نعتیہ اشعار

ہمیشہ اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھ کر
زباں سے حق و صداقت کی یارو بات کرو
اگر ہے اُمتی ہونے کا تم کو دعویٰ تو پھر
نبیؐ کے تابع قمرؔ اپنی خواہشات کرو

☆☆☆☆☆

زباں سے دعوئ عشقِ رسولؐ بے معنی
عمل بھی لازمی ہوتا ہے عاشقی کے لیے

☆☆☆☆☆

ذکرِ رسولِ پاکؐ ہے سرمایۂ حیات
گو کہ قمرؔ کے پاس کوئی مال و زر نہیں

❖❖

انور فرہاد

(قلم کا مزدور)

معین الدین احمد نام اور انور فرہاد قلمی نام ہے۔ ۱۹۳۹ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ ۱۹۵۰ء میں ڈھاکا آگئے۔ یہیں سے میٹرک اور انٹر پاس کیا اور صحافت کے شعبے سے منسلک ہو گئے۔

انور فرہاد کم و بیش پچاس سال سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ابھی وہ اسکول میں تھے کہ ان کی شعر گوئی کا آغاز ہو گیا اور وہ ادبی نشستوں میں اپنا کلام بھی سنانے لگے۔ اس دوران وہ بچوں کے رسالوں میں کہانیاں اور مضامین بھی لکھتے رہے۔ انٹر تک پڑھنے کے بعد وہ تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے اور صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ ڈھاکا کے مختلف اخباروں میں کام کرتے رہے۔ شعر و شاعری کا سلسلہ بھی جاری رہا اور ان کا کلام پاکستان کے موقر رسالوں مثلاً ماہِ نو، افکار، سیپ، نیا دور اور ہم قلم وغیرہ میں شائع ہوتا رہا۔ اس دور میں انھوں نے زیادہ تر جدید انداز کی نظمیں کہیں اور بطور نظم نگار مشہور ہو گئے ترقی پسند گروپ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

۱۹۶۹ء میں انور فرہاد کی شادی ہوئی۔ اس وقت تک مشرقی پاکستان کے سیاسی حالات بہت خراب ہو چکے تھے۔ تعصب اور نفرت کے جھکڑ چل رہے تھے۔ دور اندیش لوگ آہستہ آہستہ مغربی پاکستان کوچ کرتے جا رہے تھے۔ لہٰذا انور فرہاد بھی شادی کے چند ماہ بعد اپنے سسرال والوں کے ساتھ کراچی چلے آئے۔ یہاں بھی ان کا تعلق بعض ہفت روزہ اخباروں، فلمی رسالوں اور

ڈائجسٹوں سے رہا۔ فیچر، خاکے اور مضامین کے علاوہ انھوں نے ڈائجسٹوں کے لیے بے شمار کہانیاں لکھیں۔ اب تک ان کے قلم کی یہ مزدوری جاری ہے۔ مذہب کی طرف رجحان بڑھ گیا ہے۔ اب وہ شاعروادیب کے بجائے صوفی نظر آتے ہیں۔

"چاند گہن"

طبیعت کی بے نیازی اور لاپروائی کی وجہ سے انور فرہاد اپنا کلام محفوظ نہ رکھ سکے۔ اب بعض دوستوں کے اصرار پر انھیں اپنا مجموعہ شائع کرنے کا خیال آیا ہے۔ انھوں نے کچھ اپنی یادداشت اور کچھ پرانے رسالوں اور اخباروں سے ایک مختصر مجموعہ مرتب کر لیا ہے۔ اس غیر مطبوعہ مجموعے پر راقم نے جو دیباچہ لکھا ہے، اس کا اختصار پیش کیا جاتا ہے۔

انور فرہاد نے اپنے مجموعے کا نام "چاند گہن" رکھا ہے جو ان کی ایک پرانی نظم کا عنوان ہے۔ اس مجموعے میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ زبان و بیان میں روانی اور سادگی ہے۔ نظموں میں کوئی ابہام نہیں۔ ان کے کلام میں قدیم و جدید کا خوب صورت امتزاج نظر آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک اچھے شاعر ہیں اور ان کے کلام میں ایک خاص دلکشی اور انفرادیت ہے۔

انور فرہاد کی نظمیں جو ڈھاکے میں لکھی گئیں اور مختلف جرائد میں شائع ہوئیں، ان کی نوجوانی کے جذبات و احساسات کی ترجمان ہیں۔ ایک لوئر مڈل کلاس کے نوجوان حساس شاعر کی محرومیاں اور نارسائیاں، اردگرد کی چمکتی دمکتی زندگی، کچھ مستقبل کی امیدیں، کچھ سہانے خواب، کچھ تلخ حقیقتیں، تڑپتی مچلتی آرزوئیں، ایک دلنواز رفیقِ سفر کی جستجو، ایک نامعلوم سی خلش اور کسک، یہ تمام باتیں ان کے اس دور کی نظموں میں بڑے موثر انداز میں ملتی ہیں۔ نظم "چاند گہن" دیکھیے:

دل سے لپٹی ہوئی ہے کار اداسی کی یہ دھول
جس سے گہنائے ہوئے ہیں سب داغ
جس سے مرجھائے ہوئے ہیں سب پھول

سرِ مژگاں کوئی تارہ بھی نہیں
روشنی کا کوئی مبہم سا سہارا بھی نہیں

رات ڈھلتی ہے، نہ تھکتے ہیں قدم
جانے کب شہرِ صنم آئے گا
جانے کس وقت کرن پھوٹے گی
جانے آوارگی کب چھوٹے گی

اس دور کی نظموں میں ''ہرا بھرا بنگال''، ''راتوں کا شہزادہ''، ''چاند کا درد'' اور ''یہ رات'' بھی خوب صورت نظمیں ہیں۔

سابق مشرقی پاکستان کے مہاجروں کو دو ہجرتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ان دونوں میں بڑا فرق تھا۔ ۱۹۴۷ء میں لٹ پٹ کر مشرقی پاکستان آنے کے بعد وہ ہجرت کا دکھ درد بہت جلد بھول گئے اور اپنی نئی مملکت کی روز افزوں ترقیاتی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ لیکن بنگلہ دیش بننے کے بعد یا اس سے کچھ پہلے انھوں نے جو دوسری ہجرت کی اس کا کرب وہ نہ بھلا سکے۔ اپنے ہی بھائیوں کے ہاتھوں جس طرح ان کا قتلِ عام ہوا، جس طرح وہ لوٹے اور مارے گئے، اس کی یاد ان کے لیے ایک مستقل سوہانِ روح بن گئی۔ پھر اس ہجرت کے بعد ان کو جس بیگانگی اور بے مروتی کا سامنا کرنا پڑا، وہ ان کے زخم پر نمک چھڑکنے کے مترادف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طویل عرصہ گزرنے کے باوجود ان شعرا کے کلام میں اس کی کسک آج بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ اختر لکھنوی مرحوم کا تو پورا مجموعہ ''دیدۂ تر'' اسی درد و بے کسی کا ترجمان ہے۔ انور فرہاد کے چند اشعار دیکھیے:

ہر طرف خوف ہر طرف دہشت
کیا یہاں راج ہے بلاؤں کا
بے وفائی کا تم سے کیا شکوہ
شہر ہی ہے یہ بے وفاؤں کا

ہجرتوں نے عطا کیا ہے مجھے
یہ جو گھاؤ ہے اپنے پاؤں کا

ہمارے سر پہ بھی اک سائباں ہے سایہ فگن
ہمارے سر پہ رہتا ہے آسمان کھلا

بے گھری اور در بدری کا سفر ختم ہونے کو نہیں آتا۔ انور فرہاد اپنی بے بسی اور بے کسی اور ڈھلتی ہوئی عمر کی صعوبتوں کا ذکر بڑے موثر انداز میں کرتے ہیں

اس بے گھری کا در بدری کا سبب نہ پوچھ
سوداگری نہیں ہے، یہ سودا جو سر میں ہے

☆☆☆☆☆

اب سانس بھی لینا یہاں دشوار ہوا ہے
کیا زہر ہواؤں میں کوئی گھول رہا ہے

دو قدم بھی چلنا دوبھر ہو گیا
اب تو بس جانے کی تیاری لگے

اتنے دن جیتے رہے اس عہد میں
یہ بھی ہم کو اپنی جی داری لگے

آخری دور کی نظموں میں ایک نظم "چلو واپس چلیں" ہے۔ اس نظم کی اثر آفرینی اپنے عروج پر ہے۔ زندگی بھر کی دشت نوردی اور آبلہ پائی سے تھک کر اور نڈھال ہو کر شاعر "سفرِ آخرت" کا خواہش مند نظر آتا ہے۔ آخری بند دیکھیے:

چلو واپس چلیں

چلو واپس چلیں، اس کوچۂ آوارگاں سے اب

کہ کافی ڈھل چکی ہے شب

تھکے پیروں کو پھیلا کر

زمیں پر رکھ کے بوجھل سر

یہ آنکھیں بند کر کے اب تو سب کچھ بھول جانا ہے

بس اب اُس گھر میں رہنا ہے

وہیں اب دل لگانا ہے

نثر نگاری

اگر یہ کہا جائے کہ انور فرہاد نے شعر و شاعری سے زیادہ نثر نگاری کی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ قلم کے اس مزدور نے کئی ہزار صفحات لکھ ڈالے۔ آج بھی ۷۲ سال کی عمر میں لکھتا جا رہا ہے۔ ڈائجسٹوں میں کئی سو کہانیاں لکھیں، بچوں کے لیے پچاسوں کہانیاں لکھیں۔ بیسیوں خاکے لکھے۔ مضامین لکھے۔ خود نوشت لکھی (جواب تک غیر مطبوعہ ہے)۔ فلم اسٹار رنگیلا کی شخصیت اور فن پر کتاب لکھی۔ کتابوں پر تبصرے لکھے۔ انور فرہاد کی نثر نگاری کی روداد بڑی طویل ہے۔ ان کے افسانوں، کہانیوں اور مضامین کے کئی مجموعے شائع ہو سکتے ہیں۔

انور فرہاد کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ سب کی شادی ہو چکی ہے۔ ان کی بڑی بیٹی کی شادی شہزاد منظر مرحوم کے بڑے بیٹے سے ہوئی ہے۔

ہجرتوں نے عطا کیا ہے مجھے
یہ جو گھاؤ ہے اپنے پاؤں کا

ہمارے سر پہ بھی اک سائباں ہے سایہ فگن
ہمارے سر پہ رہتا ہے آسمان کھلا

بے گھری اور در بدری کا سفر ختم ہونے کو نہیں آتا۔ انور فرہاد اپنی بے بسی اور بے کسی اور ڈھلتی ہوئی عمر کی صعوبتوں کا ذکر بڑے موثر انداز میں کرتے ہیں

اس بے گھری کا در بدری کا سبب نہ پوچھ
سوداگری نہیں ہے، یہ سودا جو سر میں ہے

☆☆☆☆☆

اب سانس بھی لینا یہاں دشوار ہوا ہے
کیا زہر ہواؤں میں کوئی گھول رہا ہے

دو قدم بھی چلنا دوبھر ہو گیا
اب تو بس جانے کی تیاری لگے

اتنے دن جیتے رہے اس عہد میں
یہ بھی ہم کو اپنی جی داری لگے

آخری دور کی نظموں میں ایک نظم "چلو واپس چلیں" ہے۔ اس نظم کی اثر آفرینی اپنے عروج پر ہے۔ زندگی بھر کی دشت نوردی اور آبلہ پائی سے تھک کر اور نڈھال ہو کر شاعر "سفرِ آخرت" کا خواہش مند نظر آتا ہے۔ آخری بند دیکھیے:

چلو واپس چلیں
چلو واپس چلیں، اس کوچۂ آوارگاں سے اب

کہ کافی ڈھل چکی ہے شب
تھکے پیروں کو پھیلا کر
زمیں پر رکھ کے بوجھل سر
یہ آنکھیں بند کر کے اب تو سب کچھ بھول جانا ہے
بس اب اُس گھر میں رہنا ہے
وہیں اب دل لگانا ہے

نثر نگاری

اگر یہ کہا جائے کہ انور فرہاد نے شعر و شاعری سے زیادہ نثر نگاری کی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ قلم کے اس مزدور نے کئی ہزار صفحات لکھ ڈالے۔ آج بھی ۷۲، ۷۳ سال کی عمر میں لکھتا جا رہا ہے۔ ڈائجسٹوں میں کئی سو کہانیاں لکھیں، بچوں کے لیے پچاسوں کہانیاں لکھیں۔ بیسیوں خاکے لکھے۔ مضامین لکھے۔ خود نوشت لکھی (جو اب تک غیر مطبوعہ ہے)۔ فلم اسٹار رنگیلا کی شخصیت اور فن پر کتاب لکھی۔ کتابوں پر تبصرے لکھے۔ انور فرہاد کی نثر نگاری کی روداد بڑی طویل ہے۔ ان کے افسانوں، کہانیوں اور مضامین کے کئی مجموعے شائع ہو سکتے ہیں۔

انور فرہاد کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ سب کی شادی ہو چکی ہے۔ ان کی بڑی بیٹی کی شادی شہزاد منظر مرحوم کے بڑے بیٹے سے ہوئی ہے۔

خورشید احمر

(شاعر و صحافی)

سوانحی خاکہ

نام: خورشید عالم

قلمی نام: خورشید احمر

سال پیدائش: ۱۹۳۰ء

جائے پیدائش: کانپور (یوپی)

تعلیم: بی۔اے آنرز (اُردو) ڈھاکا یونیورسٹی

پہلی ہجرت: والدین کے ساتھ قیامِ پاکستان کے بعد ہی۔ پاربتی پور

پیشہ: صحافت (مشرقی پاکستان میں)

کراچی آنے کے بعد بینک (نیشنل بینک آف پاکستان) میں ملازمت اور اب صحافت

دوسری ہجرت: سقوطِ ڈھاکا کے بعد نومبر ۱۹۷۳ء۔ کراچی

اولاد: ایک بیٹا، چار بیٹیاں

''شہرِ چراغاں''

خورشید احمر کا مجموعۂ کلام ''شہرِ چراغاں'' ۲۰۰۰ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں سات اہلِ قلم، ڈاکٹر حنیف فوق، ڈاکٹر وفا راشدی، پروفیسر اظہر قادری، نوشاد نوری، احمد الیاس، شبیر احمد انصاری اور میر حامد علی کانپوری کے مضامین شامل ہیں۔ شاعر نے اپنا دیباچہ ''حرفِ سپاس'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ کتاب کا یہ نثری حصہ ۶۸ صفحات تک پھیلا ہوا ہے۔ کتاب ۱۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

خورشید احمر مشرقی پاکستان کے معروف شعرا میں ہیں۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی ان کی شعر و شاعری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ''جناح ہائی اسکول، پاربتی پور'' سے انھوں نے میٹرک پاس کیا۔ انٹر، قائدِ اعظم کالج، سید پور سے کیا اور اس کے بعد ڈھاکا منتقل ہو گئے۔ ڈھاکا یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرز (اردو) کیا۔ ڈھاکا آنے سے پہلے ہی وہ صحافت سے وابستہ ہو چکے تھے اور ان کی نظمیں اور غزلیں مختلف جرائد میں شائع ہونے لگی تھیں۔ وہ جدید انداز کے شاعر ہیں اور ترقی پسندانہ رجحانات کے باوجود اخلاقی و مذہبی اقدار کے قائل۔ وہ کہتے ہیں: ''شاعری نے میرے وجود کو وقار و اعتبار عطا کیا ہے۔''

سقوطِ ڈھاکا کے بعد خورشید احمر کراچی آ گئے۔ یہاں انھیں نیشنل بینک میں ملازمت مل گئی۔ وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد اب وہ دوبارہ صحافت سے منسلک ہو گئے ہیں اور ''دی نیوز'' میں ادبی کالم لکھنے لگے ہیں۔ خورشید احمر کو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہے اور وہ ترجمہ کرنے میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔

خورشید احمر ایک فرض شناس، محنتی، مخلص اور خوش اخلاق انسان ہیں۔ اپنی تمام مصروفیتوں کے باوجود انھوں نے گھریلو ذمہ داریوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ ان کے پانچوں بچے (ایک بیٹا اور چار بیٹیاں) اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔

''شہرِ چراغاں'' ایک خوب صورت شعری مجموعہ ہے جس کا سرورق ان کی بڑی بیٹی تاجور

خورشید (مصورہ) نے تیار کیا ہے۔ ابتدا میں متعدد حمد اور نعتیں ہیں، اس کے بعد تقریباً ۱۸ نظمیں اور ۶۰ غزلیں ہیں۔ شروع میں انگریزی کی مشہور شاعرہ سروجنی نائیڈو کی انگریزی حمد کا دل کش ترجمہ ہے۔ دو بند دیکھیے:

جادۂ ہستی میں ہے پرتو فگن تیرا جمال
تیری بخشش سے درخشندہ ہیں میرے ماہ و سال
ہر ستارے کی زباں پر تیرا ذکر ناز ہے
نام تیرا شش جہت میں آئینہ پرواز ہے
یا غنی و یا غفار

منزلِ مقصود تو ہے، تو ہی میری آرزو
میری خاموشی ہے تو، میرا نغمہ بھی ہے تو
تجھ سے سورج کی شعاعیں زندگی آمیز ہیں
ایک دانے سے ہزاروں فصل خوشہ ریز ہیں
یا وہاب و یا وحید

حیرت کی بات ہے کہ ہر بند کے آخر میں جو اسماء الٰہی ہیں وہ سروجنی نائیڈو کی انگریزی نظم میں اسی طرح ملتے ہیں۔ خورشید احمر نے انگریزی نظم بھی درج کر دی ہے۔

''شہر چراغاں'' کے عنوان سے خورشید احمر کی ایک نظم ماہنامہ ''افکار'' کراچی کے شمارہ جولائی ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ غالباً یہ نظم انھیں بہت پسند ہے، اس لیے کہ انھوں نے اپنے شعری مجموعے کا نام بھی ''شہر چراغاں'' رکھا ہے۔ اس نظم کا دوسرا بند دیکھیے:

رات پھر شہر چراغاں میں چلی آئی ہے
نشۂ ہستی کی ہر اک سمت فضا طاری ہے
ہے کبھی بے خبری اور کبھی ہشیاری ہے

کس قدر سادگی لمس کی پُرکاری ہے
جیسے دریا میں چراغوں کا سفر جاری ہے
دوستو آؤ! کہ تزئینِ رو یار کریں
پھر لہو رنگ حدیثِ لب و رخسار کریں
فتنۂ محفلِ خاموش کو بیدار کریں
سارے عالم کو محبت کا پرستار کریں

آؤ ہم پیار کریں

رات پھر شہر چراغاں میں چلی آئی ہے
رات پھر شہر چراغاں میں تمہیں آئے گی

اس مجموعے میں نظموں سے کہیں زیادہ غزلیں ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خورشید احمر کا رجحان غزلوں کی طرف زیادہ ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

آرائشِ جمالِ رُخِ یار دیکھنا
پھر نبضِ کائنات کی رفتار دیکھنا
دو ہجرتوں کی دھوپ نے بے چہرہ کر دیا
اب کیا کسی کا سایۂ دیوار دیکھنا
محصور اس طرح ہیں کسی کی خیال میں
اب شہر دیکھنا ہے نہ بازار دیکھنا

جب شعورِ حیات آئے گا
عشق سولی پہ مسکرائے گا
سر بکف جب چلیں گے دیوانے
شہر کا شہر ساتھ آئے گا

زینہ زینہ اتر رہی ہے سحر
چاند لمحوں میں ڈوب جائے گا
عشرتِ وصلِ یار کا موسم
اک نہ اک دن ضرور آئے گا

اپنے پیروں میں ستاروں کے سجائے گھنگھرو
رات خوشبو کی طرح پھیل گئی ہے ہر سو
اب کے ہر شعر میں کچھ ایسی فضا ہے خورشیدؔ
جیسے بنگال کا پھونکا ہو کسی نے جادو

خورشید احمد ایک اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ انھیں انگریزی سے اردو اور اردو سے انگریزی ترجمہ کرنے میں کمال حاصل ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے بہت کام کیا ہے۔ لیکن ان کی اب تک کوئی نثری کتاب شائع نہیں ہوئی۔ فی الحال وہ انگریزی اخبار "دی نیوز" سے وابستہ ہیں۔

❖❖

پروفیسر ذکی آذر

(ترجمانِ غمِ حیات)

سوانحی خاکہ

نام: ذکی احمد صدیقی

قلمی نام: ذکی آذر

تاریخ پیدائش: ۱۹۴۰ء

مقامِ پیدائش: سرائے ساہو، ضلع سارن (چھپرا) بہار

پہلی ہجرت: ۱۹۴۸ء۔ ڈھاکا

تعلیم: ایم۔ اے (اردو)، ڈھاکا یونیورسٹی، ۱۹۶۵ء

پیشہ: درس و تدریس

دوسری ہجرت: سقوطِ ڈھاکا کے بعد بڑی تکلیفیں اٹھا کر مع اہل وعیال نیپال ہو کر کراچی پہنچے۔ ۱۹۷۴ء

آخری ملازمت: وفاقی گورنمنٹ کالج برائے طلبہ، اسلام آباد

وفات: یکم اکتوبر ۱۹۹۰ء، کراچی۔ بمرض حلق کا کینسر

اولاد: دو بیٹے، ایک بیٹی

"حاصلِ سفر"

پروفیسر ذکی آذر مرحوم کا مجموعۂ کلام "حاصلِ سفر" ان کی وفات کے بعد کراچی سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔ یہ مختصر مجموعہ ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے جس کے شروع میں اقسر ماہ پوری، پروفیسر نظیر صدیقی (ذکی مرحوم کے بڑے بھائی) اور اختر لکھنوی کے دیباچے شامل ہیں۔

ذکی مرحوم نے شعر بہت کم کہے۔ المیہ سقوطِ ڈھاکا کے بعد بجھ کر رہ گئے تھے۔ پروفیسر نظیر صدیقی کے قریبی دوست اقسر ماہ پوری صاحب لکھتے ہیں:

"ذکی آذر مرحوم کی تقریباً پوری زندگی میری نظروں کے سامنے ہے۔ نظیر صدیقی کی طرح انھیں بھی شعر و ادب سے وابستگی رہی۔ وہ زندگی کے ہر دور میں کچھ نہ کچھ ادبی و شعری کام کرتے رہے۔ مگر سانحۂ سقوطِ ڈھاکا کے بعد وہ بجھ سے گئے تھے اور شعر و ادب کی محفلوں سے زیادہ انھیں مسجد کے گوشے میں سکونِ قلب حاصل ہوتا تھا...... چنانچہ ان کی زندگی صرف تین خانوں میں بٹ کر رہ گئی تھی۔ گھر، کالج اور مسجد۔ ان کے دل میں نہ تو دنیوی ترقی کی خواہشیں باقی رہیں اور نہ ادبی شہرت کے حصول کی آرزو۔"

("حاصلِ سفر"۔ ص: ۹، ۱۰)

ذکی مرحوم بڑے حساس، نیک فطرت، کم سخن، منکسر مزاج اور قناعت پسند انسان تھے۔ لڑکپن سے نماز، روزہ وغیرہ کے پابند تھے۔ شعر و ادب کی محفلوں سے بھی دلچسپی تھی۔ شروع میں کتابوں پر تبصرے لکھا کرتے تھے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ ایک عرصے تک سینٹ گریگوری اسکول میں پڑھاتے رہے۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ وہ زندہ دل انسان تھے۔ دوستوں کے ساتھ خوب گھل مل کر باتیں کیا کرتے تھے۔ مطالعے کا بھی بہت شوق تھا۔ ان کا حلقۂ احباب بہت محدود تھا، جس میں راقم بھی شامل تھا۔ لیکن یہ اس وقت کی باتیں ہیں "جب آتش جواں تھا" یعنی وہ مشرقی پاکستان میں تھے۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد جب وہ جاں گداز تکلیفیں اٹھا کر نیپال ہوتے ہوئے پاکستان پہنچے تو بالکل بجھ کر رہ گئے تھے۔ اہل وعیال کی

پرورش و کفالت کے لیے کالجوں میں پڑھاتے رہے لیکن دل کی خوشی ختم ہو چکی تھی۔ انھوں نے اللہ سے لو لگا لیا تھا۔ پھر آخر وقت میں کینسر کی شدید تکالیف۔ یکم اکتوبر ۱۹۹۰ء کو کراچی میں انتقال کیا۔ اللہ مغفرت فرمائے!

منتخب اشعار

ذکی مرحوم المیہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے اثرات سے کبھی چھٹکارا حاصل نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دوسرے دور کا کلام تمام تر انھیں کا ترجمان ہے۔ پہلے دور کا کلام اور دیگر ادبی کاوشیں سب سقوطِ ڈھاکا کی نذر ہو گئیں۔

یہی حاصلِ سفر ہے، یہی داستاں ہے میری
مری آنکھ میں فروزاں مری آرزو کے سائے

☆☆☆☆☆

کیسے کیسے خواب دیکھے اہلِ دانش نے یہاں
رفتہ رفتہ ان کی تعبیریں پریشاں ہو گئیں

☆☆☆☆☆

حاصلِ فکر و نظر کچھ بھی اگر ہے تو یہی
زہر کا جام ہے، دشنام ہے، رسوائی ہے

☆☆☆☆☆

لہو سے حق کا علم سر بلند جس نے کیا
زمانہ کر نہیں سکتا اسے نظر انداز

☆☆☆☆☆

میں کوئی خواب نہیں ہوں کہ بکھر جاؤں گا
مجھ کو جانا ہے جہاں خاک بسر جاؤں گا

یہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں معلوم
سکوں سے پھر بھی ہے محروم کیوں دلِ حساس

☆☆☆☆☆

شاید کوئی خیال حقیقت سے جا ملے
آذر تراشتے رہو پیکر خیال کے

☆☆☆☆☆

تمھارے خال و خد کی سادگی باقی رہی کیوں کر
مرا چہرہ تو خود مجھ سے بھی پہچانا نہیں جاتا

☆☆☆☆☆

دریا کا پانی خون سے گل رنگ ہو گیا
خاموش دیکھتا رہا تنہا چمکتا چاند

☆☆☆☆☆

سفر سے لوٹ کے آیا نہ کوئی آخر کار
مکان جلتے سلگتے رہے کہیں سے دور

☆☆☆☆☆

آذر وہ بہا لے گئی احساسِ زیاں تک
اک موج قیامت کی جو گزری مرے سر سے

لوگ ملتے ہیں تو گھر پوچھتے ہیں
تھا کوئی اپنا بھی گھر یاد آیا

☆☆☆☆☆

کس قیامت کا سفر ہے درپیش
کس قیامت کا سفر یاد آیا

☆☆☆☆☆

یہ کیسا حادثہ گزرا ہے دل پر
پریشانی ہے لیکن غم نہیں ہے

ذکی مرحوم کی ایک غزل دیکھیے:

تیری ہی آرزو میں صبح، تیری ہی آرزو میں شام
تیری ہی جستجو میں ہم پھرتے ہیں کو بکو تمام
شام ہی سے ہیں نیم جاں منتظرِ گلِ مراد
پچھلے پہر نسیمِ صبح دیکھیے لائے کیا پیام
عشق کی جاں فروشیاں، حُسن کی بے نیازیاں
مرحلہ ہائے شوق میں دونوں ابھی ہیں ناتمام
فکر و نظر کی منزلیں جن سے نہ طے ہوئیں کبھی
دیر و حرم میں جا کے وہ ہو گئے صاحبِ مقام
سب کے لیے نہیں اگر عیش و نشاطِ زندگی
کیوں ہے دعوتِ نگاہ، کیوں ہے یہ پھر صلائے عام
ہم تو نہیں ہوئے مگر کون ہے جو ہوا یہاں
عیش و طرب کے باوجود عیش و طرب سے شادکام

❖❖

پاشارحمٰن

(شاعر، افسانہ نگار)

سوانحی خاکہ

قلمی نام: پاشارحمٰن

جائے پیدائش: پٹنہ (بہار)

پہلی ہجرت: قیامِ پاکستان کے بعد۔ ڈھاکا

تعلیم: میٹرک: رحمت اللہ ہائی اسکول، ڈھاکا

انٹر، بی۔اے، قائدِ اعظم کالج، ڈھاکا

ایم۔اے۔ ڈھاکا یونیورسٹی

دوسری ہجرت: ۱۹۷۱ء۔ کراچی

اولاد: اولاد سے متعلق کوئی علم نہیں

''نشاطِ کرب''

''نشاطِ کرب'' پاشارحمٰن کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں فیض احمد فیض اور اقبال ماہ پوری کی تقریظیں بھی شامل ہیں۔ پاشارحمٰن نے دیباچہ لکھا ہے۔

فیض احمد فیض ان کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''شاعری کے پردے میں پاشا رحمٰن نے قلب و نظر کی جو منزلیں طے کی ہیں، ''کربِ نشاط'' اس راہ کا بہت نمایاں سنگِ میل ہے۔ زندگی کی تجارات کا حساس مگر مست راہی قلب کی گہرائیوں کے اندر اور باہر جو مسافتیں طے کرتا ہے یہ مجموعہ انھیں کا ایک موثر اور مرصع مرقع ہے۔''

نمونۂ کلام

اس دنیا میں ہم نے دیکھے کیسے کیسے لوگ
روپ تو ان کا چندا جیسا لیکن من میں روگ
آش نراش کے عالم میں یہ جیون سارا بیتا
لیکن بھاگ میں لکھا کب تھا دو دن کا سنجوگ
پاؔشا جی کیوں رو رو کر ہلکان ہوئے جاتے ہو تم
دنیا تو ہے آنی جانی کس کا کب تک سوگ

چاندنی رات ہے، بیداری ہے، تنہائی ہے
ہائے کس وقت تری یاد مجھے آئی ہے
پھول کھلتے ہیں تو زخموں کا گماں ہوتا ہے
لوگ کہتے ہیں کہ گلشن میں بہار آئی ہے
راہ تاریک ہے ملتا نہیں منزل کا سراغ
ہائے قسمت مجھے کس موڑ پہ لے آئی ہے

اب اسی شہر میں برساتے ہیں پتھر ہم پر
ہم جہاں لائے گئے تھے بڑی توقیر کے ساتھ

میری تربت پہ لگا دینا یہ کتبہ یارو
"ہے یہ وہ شخص کہ لڑتا رہا تقدیر کے ساتھ"

☆☆☆☆☆

چپکے چپکے شمع سوزاں رات بھر روتی رہی
رکھ کے اپنے سامنے محفل میں پروانے کی خاک

☆☆☆☆☆

کسی سے کیسے کہے کوئی تجربہ دل کا
عجیب سانحہ ہوتا ہے، سانحہ دل کا

☆☆☆☆☆

شہر آشوب میں گلہائے وفا کس کو دوں؟
کون مخلص ہے، میں الزامِ جفا کس کو دوں
شہر کے شور میں صحراؤں کا سناٹا ہے
دیر سے سوچ رہا ہوں کہ صدا کس کو دوں
وہ تو یوسف تھا مگر کوئی بھی یعقوب نہیں
خون میں ڈوبی ہوئی اس کی قبا کس کو دوں؟

("دبستانوں کا دبستان کراچی"۔ جلد دوم)

کچھ یادیں

پاشا رحمٰن میرے یونیورسٹیوں کے ساتھیوں میں تھے۔ وہ مجھ سے ایک سال جونیر تھے۔ میں اُردو فارسی کے شعبے سے منسلک تھا اور وہ شعبۂ تاریخ سے۔ (پروفیسر) یوسف ریاض ان کے قریبی دوست اور ہم جماعت تھے۔ دونوں اکثر ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ دونوں تقریباً ہر روز ہی شعبۂ اُردو کے سیمنار میں آتے اور ہماری ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ یوسف ریاض ہر وقت مسکراتے رہتے تھے

اور خوب قہقہے لگاتے تھے۔ لیکن پاشا رحمٰن خاموش خاموش۔ اداس اداس اور کھوئے کھوئے سے نظر آتے تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے کبھی یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ شعر بھی کہتے ہیں۔ میں نے ۱۹۶۰ء میں ایم۔ اے کیا اور انھوں نے ۱۹۶۱ء میں۔ ان دنوں ہم انہیں سُلیم پاشا کے نام سے جانتے تھے۔

ایم۔ اے کرنے کے بعد سُلیم پاشا ڈھاکا گورنمنٹ کالج سے منسلک ہو گئے۔ انھوں نے دو تین سال کے بعد اعلیٰ ملازمتوں کا امتحان دیا اور انکم ٹیکس کے محکمے سے وابستہ ہو گئے۔ اس دوران ان کے افسانے ماہنامہ ''سیارہ'' لاہور (ان دنوں میرے تنقیدی مضامین اور نظمیں ''سیارہ'' میں چھپتی رہتی تھیں) اور بعض دوسرے رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ اس دور میں وہ تحریک ادبِ اسلامی سے متاثر تھے۔ کچھ دنوں بعد وہ سُلیم پاشا کے بجائے ابنِ عزیز کے نام سے لکھنے لگے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ڈھاکا یونیورسٹی سے نکلنے کے بعد (ڈھاکا میں رہتے ہوئے بھی) پھر ان سے ملاقات نہ ہوئی اور نہ یوسف ریاض سے۔

ع نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکا سے چند ماہ قبل ان کا تبادلہ مغربی پاکستان ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے افسانہ نگاری غالباً ترک کر دی اور شعر و شاعری سے دل لگا لیا۔ ۱۹۷۸ء میں ان کا مجموعۂ کلام ''نشاطِ کرب'' کے نام سے شائع ہوا۔ اب وہ پاشا رحمٰن بن چکے تھے۔ میں ان کے معیاری، دلکش اور فکر انگیز کلام کو پڑھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ ان کے دیباچے سے معلوم ہوا کہ وہ اسکول کے زمانے ہی سے شعر کہہ رہے ہیں لیکن بعض ہم جماعتوں کی تنقید کی وجہ سے وہ بد دل ہو گئے۔ میں نے اپنی کتاب ''محفل جو اجڑ گئی'' میں ان کا ذکر افسانہ نگار کے طور پر کیا ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد پاشا رحمٰن انکم ٹیکس پریکٹس کرنے لگے۔ ہمارا ان سے کوئی رابطہ نہیں۔ اللہ کرے وہ بخیر ہوں۔ مدت ہوئی میں نے ان کا مجموعہ ''نشاطِ کرب'' ان کے اسکول کے استاد سید حسن رضا وائروی مرحوم (جو میرے بزرگ دوست تھے) کے پاس دیکھا تھا۔ یہ مجموعہ انھیں کے نام معنون کیا گیا ہے۔

❖❖

پروفیسر اعجاز الحق اعجاز

(شاعر، معلم)

سوانحی خاکہ

نام: اعجاز الحق

تخلص: اعجاز

والد کا نام: ملک انوار الحق (مرحوم)

تاریخ پیدائش: ۲۹ دسمبر ۱۹۴۱ء

مقامِ پیدائش: گیا (بہار)

تعلیم: بی۔ اے آنرز (انگلش)، ایم۔ اے (انگلش)۔ ڈھاکا یونیورسٹی ۱۹۶۱ء

پہلی ہجرت: تقسیم کے بعد۔ قیام چاٹگام، راجشاہی، ڈھاکا

سلسلۂ روزگار: ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۷ء تک مشرقی پاکستان ایجوکیشن سروس سے بحیثیت استاد وابستہ رہے۔

۱۹۶۷ء میں پاک فضائیہ کی ایجوکیشن برانچ میں کمیشن حاصل کیا۔ درس و تدریس کے علاوہ پاک فضائیہ کے رسائل "شاہین" اور "فضائیہ" کے مدیر کے فرائض انجام دیے اور ڈائرکٹر پبلک ریلیشنز کے عہدے پر بھی فائز رہے۔

۱۹۹۸ء سے پی اے ایف ڈگری کالج فیصل کے پرنسپل رہے۔

۲۰۰۷ء سے وفات تک پی اے ایف کیٹ (KIET) یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی سے وابستہ رہے۔

دوسری ہجرت: ۱۹۶۷ء میں ملازمت کے سلسلے میں اپنی اہلیہ کے ساتھ مغربی پاکستان چلے گئے، لیکن گھر کے دیگر افراد کا قیام ڈھاکا ہی میں رہا جو سقوطِ ڈھاکا کے بعد کراچی پہنچے۔

وفات: ۱۳ ستمبر ۲۰۱۰ء

اولاد: دو بیٹے، دو بیٹیاں

"لہر لہر پیاس"

اعجاز الحق اعجاز ایک فطری شاعر تھے۔ ۱۹۵۵ء میں جب وہ دسویں جماعت میں تھے، انھوں نے پہلی غزل کہی۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے وہ شعر کہتے رہے۔ وہ مشاعروں میں اپنا کلام سناتے نہ تھے لیکن سامع کی حیثیت سے اکثر شریک ہوتے رہے۔ متعدد ادبی انجمنوں سے بھی ان کا تعلق رہا۔ وہ "فردوسِ خیال" کے بانی سکریٹری جنرل تھے۔ ریڈیو سے بھی ان کا تعلق رہا۔ ایک عرصے تک ریڈیو پاکستان ڈھاکا سے خبریں پڑھتے رہے۔ ریڈیو اور ٹی وی سے غزلیں، نظمیں اور غنائیے بھی پیش کیے۔ رسائل و جرائد میں وقتاً فوقتاً ان کا کلام بھی شائع ہوتا رہا۔

اعجاز کا مجموعۂ کلام ۲۰۰۳ء میں "لہر لہر پیاس" کے نام سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ ۲۳۲ صفحات اور حمد و نعت کے علاوہ ۹۸ نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے۔ آخر میں چند متفرق اشعار ہیں۔ اس مجموعے میں ان کی چھ انگریزی نظمیں بھی شامل ہیں۔ اس مجموعے میں کوئی تقریظ نہیں۔ شاعر کا لکھا ہوا دو صفحوں کا دیباچہ "آپ اپنا تعارف" شامل ہے۔ اس مجموعے کی ایک خوبی یہ ہے کہ ہر نظم اور غزل کے نیچے مقام اور تاریخ تحریر موجود ہے۔ اس کے علاوہ ترتیب تاریخ وار ہے تاکہ شاعر کا ذہنی اور فکری ارتقا بھی سامنے آجائے۔

شاعر نے اپنے اس مجموعے کا انتساب اپنی اہلیہ اور چاروں بچوں اور نواسے نواسیوں کے نام کیا ہے۔

اس مجموعے میں زیادہ تر نظمیں اور غزلیں رومانی اور جذباتی انداز کی ہیں۔ اعجاز خود اپنی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جذباتی رومان سے مخفی شعور اور پھر آخر میں ادراک و عرفان کی منزل تک کا سفر بہت کٹھن اور جان لیوا مگر بڑا جاں فزا بھی ہے۔ لیکن کہیں بھی کسی بھی موڑ پر بے قراری اور تشنگی کا احساس نہیں جانے پاتا:

یہ کیسی پیاس ہے لہروں کی جو نہیں بجھتی
یہ کیسی منزلِ جاناں ہے جو نہیں ملتی"

(دیباچہ "لہر لہر پیاس")

لیکن حقیقت یہ ہے کہ کلام کا انداز شروع سے آخر تک یکساں ہے، کوئی خاص ارتقا نظر نہیں آتا نہ فکر و خیال میں نہ زبان و بیان میں۔

نمونۂ کلام

ذیل میں دو نظمیں اور غزل کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

ڈھاکا یونیورسٹی سے رخصت ہوتے ہوئے

کس طرح کہہ دوں کہ مجھ سے چھوٹتا ہے یہ جہاں
حسن و نکہت، نغمہ و ارماں کا رنگیں کارواں
آج دل میں اک کسک سی ہے نگہ بے تاب ہے
خواب اک دیکھا تھا جیسے، خواب آخر خواب ہے

میرے سپنوں کے جہاں میں جیسے رقصاں تھی حیات
میرے نغموں سے جواں تھی جیسے روحِ کائنات
چھوٹتا ہے اب یہ میرا گلستانِ آرزو
اب کہاں فصلِ بہاراں، اب کہاں وہ رنگ و بو
اس چمن کی ہر روش سے ایک الفت ہے مجھے
عمر بھر یاد آئیں گے مجھ کو یہ دن بیتے ہوئے

(ڈھاکا، ۱۹۰ راگست ۱۹۶۱ء)

پیاسی لہریں

غلط ہے کوئی شکایت، عبث ہے کوئی گلہ
کہیں حسین ہے رسمِ وفا سے نامِ وفا
خلوص و مہر و محبت کی بات کرتے ہیں
ہمیشہ چاند کی کرنوں کو چھونے بڑھتے ہیں

حیات زہر بھری ایک آگ میرے لیے
حیات درد بھرا ایک راگ میرے لیے
کہاں کی آرزو، کیسا خلوص، کیسی وفا
بس اہلِ شوق و جنوں کا ہے طوق و دار صلہ

یہ تشنگی جو بجھائی کبھی کچھ اور بڑھی
ازل سے زندگی بے تاب و بے قرار رہی

یہ کیسی پیاس ہے لہروں کی جو نہیں بجھتی
یہ کیسی منزلِ جاناں ہے جو نہیں ملتی

(ڈھاکا ۱۰ اپریل ۱۹۶۱ء)

پھر رہے ہیں آوارہ ہم نگر نگر تنہا
ہر نفس پریشاں ہے اور ہر بشر تنہا
دل کی بستیاں سونی، شوق کا چمن ویراں
ہم کبھی نہ ہوتے تھے آہ اس قدر تنہا
ہم نہ ہوں گے جب ان کو یہ خیال آئے گا
کیسے لوگ کرتے ہیں زندگی بسر تنہا

(۱۹۷۱ء)

اک مسافر ہوں کس نگر جاؤں
مثلِ خوشبوئے گل بکھر جاؤں
تجھ سے اب دور میں کدھر جاؤں
تو ہی تو ہے جدھر جدھر جاؤں
یہ بتا جاں کہ تیرے شہر سے میں
بادلوں کی طرح گزر جاؤں
یا ترے گیسوؤں کے سائے میں
اس کڑی دھوپ میں ٹھہر جاؤں
سائلِ شہرِ درد ہوں اعجازؔ
کاسۂ دل لیے کدھر جاؤں

(۲۰۰۳ء)

کچھ یادیں

اعجاز الحق اعجاز میرے یونیورسٹی کے دوستوں میں تھے۔ ۱۹۵۸ء میں وہ شعبۂ انگریزی کے بی۔ اے آنرز سالِ دوم میں تھے کہ میں نے ایم۔ اے (اردو) سالِ اوّل میں داخلہ لیا۔ اعجاز فارغ اوقات میں اکثر اردو سیمینار میں آکر بیٹھ جاتے اور گپ شپ کرتے رہتے تھے۔ یوسف ریاض (پروفیسر) اور سلیم پاشا (پاشا رحمٰن) بھی جو شعبۂ تاریخ میں تھے، اکثر آجاتے تھے۔ میری ہم جماعت زریں ابراہیم (پروفیسر) سے اعجاز کی بڑی بے تکلفی تھی (ان کے گھریلو تعلقات تھے)۔ شعبۂ اُردو میں مجھ سے ایک سال سینئر خلیل احمد (پروفیسر) اور طیبہ خانم تھیں۔ منیر حسین شعبۂ فارسی میں تھے۔ دوسرے سال ۱۹۵۹ء میں اُمِ عمارہ (افسانہ نگار) اور بانو اختر شہود (افسانہ نگار) نے بھی ہمارے شعبے میں داخلہ لیا۔ بانو اختر نے ایم۔ اے میں اور اُمِ عمارہ نے بی۔ اے آنرز میں۔ یہ دونوں شاید پڑوس میں رہتی تھیں، ساتھ آتی اور ساتھ جاتی تھیں۔ اُمِ عمارہ خوب بولتیں اور قہقہے لگاتی تھیں۔ بانو اختر کم گو تھیں۔ بعد میں بانو اختر کی شادی اُمِ عمارہ کے بڑے بھائی صلاح الدین محمد (جرنلسٹ اور شاعر) سے ہوئی۔ کبھی کبھی بانو اختر کے چھوٹے بھائی عبدالاحد بھی جو بی۔ اے آنرز (انگریزی) کے سالِ اوّل میں تھے، اردو سیمینار میں آجاتے تھے۔ اس طرح اردو سیمینار میں طلبہ و طالبات کا ایک جھمگھٹا رہتا تھا۔ کبھی کبھی پروفیسر کلیم سہسرامی گھومتے پھرتے آجاتے تھے۔ انھوں نے شعبۂ اردو سے کئی سال پہلے ایم۔ اے کیا تھا۔ بڑے باغ و بہار آدمی تھے۔ خوب ہنستے ہنساتے تھے۔

اعجاز الحق اعجاز نے یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات پر مشتمل ایک ادبی انجمن "فردوسِ خیال" قائم کی تھی جس کے جنرل سکریٹری وہ خود تھے اور مجھے یاد نہیں صدر کون تھا۔ مجلسِ عاملہ میں انھوں نے یوسف ریاض، سلیم پاشا، منیر حسین، زریں ابراہیم اور مجھے (کچھ اور بھی ہوں گے، جن کے نام مجھے اب یاد نہیں) شامل کر رکھا تھا۔ ہر مہینے میں مجلسِ عاملہ کا اجلاس اردو سیمینار میں ہوتا تھا جس کی صدارت اکثر اعجاز مجھے سونپتے تھے۔ مجلسِ عاملہ کا رکن بننے سے پہلے مارچ ۱۹۵۹ء میں اعجاز نے "فردوسِ خیال" کا جشنِ بہار کے سلسلے میں ایک مقابلہ نظموں کا بھی رکھا تھا۔ اس مقابلے میں میری

نظم "بہار" پر اوّل انعام ملا۔ یہ نظم میرے کلیات "نقوش سارے" میں شامل ہے۔ اسی سال شعبۂ اردو و فارسی کی "بزمِ اردو" کی جانب سے نظموں کا مقابلہ ہوا جس میں میری نظم "دل" پر دوسرا انعام ملا۔ یہ نظم بھی "نقوش سارے" میں شامل ہے۔

اعجاز بڑے ملنسار، خوش مزاج، حاضر جواب اور بیباک تھے۔ طبیعت میں کچھ بے چینی تھی۔ دل کی بات بے جھجک کہہ جاتے تھے۔ ایک دن سیمینار میں زرّیں ابراہیم، میں اور وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے آپ ایم۔اے کے بعد پی ایچ ڈی کر لیجئے۔ "ڈاکٹر" کا لفظ آپ کے نام کے ساتھ خوب سجے گا۔ پھر زرّیں ابراہیم سے کہنے لگے آپ کو اس کی ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر کا لفظ آپ کے نام کے ساتھ اچھا نہیں لگے گا۔ اس طرح تنہائی میں وہ مجھ سے بعض ذاتی باتیں کرتے رہتے تھے۔ وہ شاعر کی حیثیت سے معروف نہ تھے۔ کبھی کبھی مجھے اپنے اشعار بھی سناتے اور میری رائے دریافت کرتے۔

میں ۱۹۶۰ء میں ایم۔اے (فائنل) کے امتحان سے فارغ ہو گیا اور ۱۹۶۱ء سے ہولی کراس کالج اور جگن ناتھ کالج میں پڑھانے لگا۔ اعجاز نے ۱۹۶۱ء میں ایم۔اے کیا اور اسی سال سے گورنمنٹ کالج میں انگریزی پڑھانے لگے۔

یونیورسٹی سے نکلنے کے بعد بھی اعجاز نے "فردوسِ خیالی" کو کئی سال تک فعال رکھا۔ "یومِ غالب" اور "یومِ اقبال" وغیرہ پر کئی جلسے بھی کیے۔ ریڈیو پاکستان ڈھاکا سے بھی منسلک رہے۔ ریڈیو سے خبریں پڑھتے اور غزلیں، نظمیں اور غنائیے بھی پیش کرتے رہے۔ ۱۹۶۷ء میں وہ فضائیہ کی تعلیمی سروس سے وابستہ ہو کر مغربی پاکستان چلے گئے اور یہ سب سلسلے ختم ہو گئے۔

جب تک اعجاز ڈھاکا میں رہے، کبھی کبھی سرِ راہ ان سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ مغربی پاکستان جانے کے بعد پھر ان سے ملاقات نہ ہوئی اور اب (۱۲ر ستمبر ۲۰۱۰ء) ان کے انتقال کی خبر آ گئی۔ دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ اللہ مغفرت فرمائے!

❖❖

صابر عظیم آبادی

(منفرد شاعر)

سوانحی خاکہ

نام: محمد اقبال حسین

قلمی نام: صابر عظیم آبادی

تاریخ پیدائش: ۲۶ر اگست ۱۹۴۰ء

مقام پیدائش: پٹنہ (بہار)

پہلی ہجرت: والدین کے ساتھ۔ ۱۹۴۸ء۔ سانتاہار (مشرقی پاکستان)

تعلیم: میٹرک۔ ڈھاکا بورڈ، ۱۹۵۶ء

انٹر: راجشاہی یونیورسٹی۔ ۱۹۵۹ء

بی۔ اے۔ راجشاہی یونیورسٹی۔ ۱۹۶۱ء

ایم۔ اے (اُردو)۔ ڈھاکا یونیورسٹی۔ ۱۹۶۷ء

پیشہ: درس و تدریس۔ صحافت۔ بینکاری

دوسری ہجرت: ۱۹۷۹ء۔ کراچی

اولاد: ۹ بیٹے، ۳ بیٹیاں

”صحرا کے پھول“

صابر عظیم آبادی کا پہلا شعری مجموعہ ”صحرا کے پھول“ ۱۹۹۹ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ اس میں ایک نعت ۶۱ غزلیں اور ۳۳ نظمیں ہیں۔ یہ مجموعہ ۲۲۰ صفحات پر مشتمل اور بڑے خوب صورت انداز میں شائع ہوا ہے۔

صابر عظیم آبادی ایک خوش گو اور خوش فکر شاعر ہیں۔ انھیں زبان و بیان پر عبور حاصل ہے۔ ان کے کلام میں سادگی بھی ہے اور پُرکاری بھی۔ ان کے یہاں قدیم وجدید کا بڑا اچھا امتزاج ملتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے کلام میں ایک خاص دل کشی پیدا ہوگئی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

حریم دل سے نہ باہر مجھے نکال کے رکھ
میں آئینہ ہوں ترا تو مجھے سنبھال کے رکھ
بچھڑ نہ جائیں کہیں رہ گزار ہستی میں
ہماری بانہوں میں بانہوں کو اپنی ڈال کے رکھ

☆☆☆☆☆

مہک رہا ہے کسی کا شباب آنکھوں میں
کھلے ہوئے ہیں وفا کے گلاب آنکھوں میں
اُتر رہا ہے ابھی روز نو کے زینے سے
اک آفتاب لیے ماہتاب آنکھوں میں

☆☆☆☆☆

تمھاری یاد کے ہنستے ہوئے گلابوں سے
کہو تو دل کے در و بام کو سجائے رکھوں
یہ زندگی تو ہے اک برگِ زرد کی صورت
ہوا کی زد سے کہاں تک اسے بچائے رکھوں

اپنی آغوشِ تمنا وا نہ کر
ریت کی دیوار کو اونچا نہ کر

''صحرا کے پھول'' میں ۱۹۷۳ء سے ۱۹۹۸ء تک کا کلام شامل ہے۔ اس مجموعے کی ایک خوبی یہ ہے کہ ہر غزل اور نظم کے نیچے سالِ تحریر درج ہے۔ صابر صاحب نے ۱۹۷۹ء میں دوسری ہجرت کی۔ گویا ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۹ء کی نظمیں اور غزلیں قیامِ بنگلہ دیش کے دوران لکھی گئیں۔ ایک غزل درج کی جاتی ہے جس میں المیہ سقوطِ ڈھاکا کی عکاسی کی گئی ہے:

جب فرازِ دار کی تنویر دیوانے ہوئے
دیکھ کر تصویرِ حیرت سارے فرزانے ہوئے
اس کڑے موسم کے نرغے سے میں نکلوں کس طرح
میرے سر پر آگ ہے اپنی ردا تانے ہوئے
اب کوئی چہرہ بھی ہم کو دے نہیں سکتا فریب
سارے چہرے ہیں ہمارے جانے پہچانے ہوئے
آندھیاں جن میں بھی چنگیزی مظالم کی چلیں
ناگہاں وہ جگمگاتے شہر ویرانے ہوئے
اب کہاں بچھڑے ہوئے احباب کو ڈھونڈے کوئی
تار ٹوٹا منتشر تسبیح کے دانے ہوئے
انقلابِ وقت سے ماتم ہے سارے شہر میں
چادرِ خوں رنگ ہے ہر آدمی تانے ہوئے
اب کہاں صابرؔ وہ لمحاتِ سرورِ زندگی
ان لبوں سے ان لبوں کے دور پیمانے ہوئے

۱۹۷۷ء

"پدما کی وادی" (۱۹۷۹ء) ایک یادگار نظم ہے۔ اس نظم میں شاعر نے اپنی پہلی ہجرت کی سرزمین کو الوداع کہا ہے:

آ کے میں برسوں سے تھا آباد تیری گود میں
تو نے اپنے سایۂ دیوار میں رکھا مجھے
زندگی کی ڈالیوں کو دے کے خوشیوں کے گلاب
تو نے اپنی ماں کی آنکھوں سے سدا دیکھا مجھے
میرے بچپن کا زمانہ کس قدر تھا خوش گوار
میرا وہ عہدِ جوانی بن گیا تھا لالہ زار!
چہچہاتے تھے طیورِ گلستاں ہر صبح کو
مسکراتی تھی ترے اطراف میں فصلِ بہار

یک بیک شعلے اٹھے پھر جبر و استبداد کے
ہو گئے سکے رواں نمرود کے شداد کے
اس جہانِ رنگ و بو سے کتنے ہی پیارے گئے
رنگ و نسل و قوم کے ناموں پہ سب مارے گئے
میرا سایہ میرا چہرہ ظلم کا حامل نہیں
اب تری آغوش میں رہنے کے میں قابل نہیں
تیری یادوں کے سہارے دل کو سمجھاتا ہوں میں
تجھ کو تنہا آنسوؤں میں چھوڑ کر جاتا ہوں میں

صابر عظیم آبادی نوعمری ہی سے شعر کہہ رہے ہیں۔ غالباً سقوطِ ڈھاکا کے ہنگاموں میں ان کا سارا کلام ضائع ہو گیا۔ لہٰذا ۱۹۷۱ء سے انھوں نے جو کچھ کہا وہ محفوظ رہ گیا۔ انھوں نے سابق

مشرقی پاکستان کی ادبی سرگرمیوں میں بھرپور حصّہ لیا۔ ساتناہار، رنگ پور اور سید پور کی ادبی انجمنوں سے وابستہ رہے۔ کراچی میں وہ "حلقۂ فکر و دانش" کے صدر ہیں۔

کراچی آنے کے بعد صابرؔ صاحب کو نیشنل بینک آف پاکستان مں ملازمت مل گئی۔ وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے پرانے پیشے درس و تدریس سے منسلک ہو گئے۔ ایک عرصے تک مجید کالونی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہے۔ اب غالباً وہاں سے بھی سبک دوش ہو چکے ہیں۔ لانڈھی کے ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے شعر و ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

رفیع الدین رازؔ

(منفرد اور بڑے شاعر)

سوانحی خاکہ:

نام: رفیع الدین بیگ

قلمی نام: رفیع الدین رازؔ

پیدائش: ۲۱ را پریل ۱۹۳۸ء

مقامِ پیدائش: بیگو سرائے (بہار)

والد کا نام: فرید الدین بیگ

پہلی ہجرت: 1951ء۔ ڈھاکا

تعلیم: ابتدائی تعلیم بہار کے اسکولوں میں حاصل کی۔ ڈھاکا آکر پرائیوٹ طور پر میٹرک، انٹر اور بی۔ اے کے امتحانات پاس کیے۔ کراچی یونیورسٹی سے ایم۔ اے (تاریخ) کیا۔

پیشہ: ڈھاکے میں ملازمت۔ کراچی میں تجارت

دوسری ہجرت: سقوطِ ڈھاکا کے بعد جنگی قیدیوں کے ساتھ دو سال ہندوستان کی قید میں رہنے کے بعد اکتوبر ۱۹۷۳ء میں کراچی پہنچے۔

رفیع الدین رازؔ نے اپنی نوجوانی اور جوانی کے ایام مشرقی پاکستان میں گزارے۔ وہ ۱۹۵۱ء سے سقوطِ ڈھاکا (دسمبر ۱۹۷۱ء) تک پورے بیس سال وہیں رہے۔ پہلے وہ تنہا ڈھاکا آئے اور اپنے تایا کے یہاں قیام کیا۔ ۱۹۵۶ء میں ان کے والد بھی ڈھاکا آ گئے جو غالباً ۱۹۷۱ء میں انتقال کر گئے۔

رفیع الدین رازؔ تیرہ چودہ سال کی عمر میں ڈھاکا آئے۔ اتنے وسائل نہ تھے کہ اسکول میں داخل ہو کر اپنی تعلیم دوبارہ شروع کرتے۔ چند سال کے بعد ان کے تایا نے ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں انھیں ملازمت دلا دی۔ پہلے وہ کنڈکٹر پھر بعد میں ڈرائیور کا کام کرنے لگے۔ تعلیم حاصل کرنے کی لگن ختم نہ ہوئی۔ پہلے پرائیوٹ طور پر میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد قائدِ اعظم کالج، ڈھاکا سے انٹر کا کورس کیا اور غالباً بی۔ اے یا بی۔ کام بھی وہیں سے کیا۔

(ماخوذ "دبستانوں کا دبستان کراچی" ۔ جلد سوم)

کراچی آنے کے بعد رفیع الدین رازؔ تجارت کرنے لگے اور بہت جلد خوش حال ہو گئے۔ یہاں انھوں نے کراچی یونیورسٹی سے تاریخ میں ایم۔ اے کیا۔ ان کے تعلقات بھی بہت وسیع ہو گئے۔ وہ فطری طور پر ایک بااثر اور فعال شخصیت کے حامل ہیں۔

جناب رازؔ نے ۱۹۶۳ء سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا لیکن بحیثیت شاعر وہ ڈھاکے میں معروف نہ تھے۔ کراچی آنے کے بعد انھیں شعر و شاعری کے مواقع زیادہ حاصل ہوئے۔ مشاعروں میں شرکت اور شعری مجموعوں کی اشاعت کی وجہ سے وہ بحیثیت شاعر مشہور و معروف ہو گئے۔

رازؔ صاحب ایک خوش گو، خوش فکر اور پُر گو شاعر ہیں۔ اب تک ان کے حسبِ ذیل آٹھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں:

۱۔ دیدۂ خوش خواب (غزلوں کا مجموعہ) ۔ ۱۹۸۸ء

۲۔ بینائی (غزلوں اور نظموں کا مجموعہ) ۔ ۱۹۹۷ء

۳۔ پیراہنِ فکر (غزلوں کا مجموعہ) ۔ ۲۰۰۳ء

۴۔ روشنی کے خدوخال (مسدس)۔۲۰۰۵ء

۵۔ ابھی دریا میں پانی ہے (نظموں کا مجموعہ)۔۲۰۰۶ء

۶۔ اتنی تمازت کس لیے (غزلوں کا مجموعہ)۔۲۰۰۷ء

۷۔ جو اک دن آئینہ دیکھا (نظموں کا مجموعہ)۔۲۰۰۸ء

۸۔ سازوراز (رباعیوں کا مجموعہ)۔۲۰۱۰ء

"روشنی کے خدوخال" رازؔ صاحب کی ایک شعری تصنیف ہے جس میں "دورِ جاہلیت سے اسلام تک اور دورِ نبوت سے اسلام کے عروج تک" کی داستان مسدس کی شکل میں مسلسل بیان کی گئی ہے۔ راقم نے اپنی کتاب 'منقبتِ صحابہ کرامؓ' کی منتخب نظموں میں "روشنی کے خدوخال" کے وہ اقتباسات دیے ہیں جو خلفائے راشدینؓ کی منقبت میں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک شاہکار تصنیف ہے۔ دو نعتیہ بند بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں:

آپ کا حسنِ تکلم، آپ کا طرزِ سخن
قطرۂ شبنم پہ گویا صبح کی پہلی کرن
اور پھر ایسی کرن جو انجمن در انجمن
رقص کرتی پھر رہی ہے صورتِ مشکِ ختن

کیف برساتی ہوئی، سانسوں کو مہکاتی ہوئی
مرحبا صلِ علیٰ اے آئینہ اے روشنی

آپ کے دم سے کتابِ زیست کی تفسیرِ نو
درسِ عقل و فہم پھر سے، فکر کی تعمیرِ نو
خواب ہائے رہ گزارِ شوق کی تعبیرِ نو
یعنی بزمِ عالمِ امکاں کی اک تصویرِ نو

چشمِ فطرت میں جہانِ شوق کی تکمیل تھی
مرحبا صلِ علیٰ اے آئینہ اے روشنی

رفیع الدین رازؔ آزاد نظمیں بھی لکھتے ہیں۔ ان کے آخری مجموعہ "جو اک دن آئنہ دیکھا" میں زیادہ تر آزاد نظمیں ہیں۔ غزل گوئی کی طرف خاص رجحان ہے۔ غزلوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ چند اشعار دیکھئے:

کفِ خیال پہ یادوں کے آبلے کتنے
ہمارے ساتھ ہیں زخموں کے سلسلے کتنے
خیال، روز مجھے خواب کے جھروکوں سے
بدل بدل کے دکھاتا ہے آئینے کتنے
نڈھال کر دیا در در کی سجدہ ریزی نے
جبینِ شوق کی رہ میں ہیں بت کدے کتنے
کھلا یہ رازِ نہاں بحر کے کناروں سے
بڑھے جو قرب تو بڑھتے ہیں فاصلے کتنے

☆☆☆☆☆

لہو میں رقص کرتا موسمِ شوریدہ سر آیا
عجب انداز سے اس بار خوشبو کا سفر آیا
تھکے ہارے پرندے جب بھی آ کر شاخ پر بیٹھے
مجھے صحراؤں میں آواز دینے میرا گھر آیا
رگوں میں وحشتیں جاگیں، نہ آنکھوں سے لہو ٹپکا
تمھاری یاد کا موسم بھی اب کے بے ثمر آیا

☆☆☆☆☆

کچا رہنا ہے جسے اے رازؔ روزِ حشر تک
ایسی مٹی کے لیے اتنی تمازت کس لیے

☆☆☆☆☆

رہ امید کے سارے چراغ جلتے رہے
دیے کی آنکھ نے جب تک ہوا سے باتیں کیں

خندہ پیشانی سے مل اے زندگی
تیرے جتنے وار تھے ہم سہہ گئے

رفیع الدین رازؔ ایک اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ حال ہی میں ان کے انشائیوں کا ایک مجموعہ ”سقراط سے چیچی چلی تک“ شائع ہوا ہے۔

رازؔ صاحب کئی سال پہلے امریکہ چلے گئے۔ ان کا قیام نیویارک میں اپنی بیٹی کے یہاں ہے۔ وہاں بھی ان کی شاعری کا سلسلہ جاری ہے۔ ان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔

رفیع الدین رازؔ صاحب کراچی آتے رہتے ہیں۔ جنوری ۲۰۱۲ء میں انھوں نے اپنے دوہوں کا مجموعہ ”دوہا پھلواری“ کے نام سے کراچی سے شائع کیا ہے۔

❖❖

شارق بلیاوی

(پُرگو شاعر)

سوانحی خاکہ:

نام: شمس الدین

قلمی نام: شارق بلیاوی

آبائی وطن: بکسی پورا، بلیا (یوپی)

بچپن میں کلکتہ آ گئے۔ ان کے والد وہاں ملازمت کرتے تھے۔

پہلی ہجرت: ۱۹۵۰ء میں کلکتہ کے فسادات کے بعد والدین کے ساتھ پاربتی پور (مشرقی پاکستان) آ گئے۔ ۱۹۵۲ء میں کلکتہ واپس چلے گئے۔ وہیں سے میٹرک، انٹر اور بی۔اے کے امتحانات پاس کیے۔ اسی دوران شادی بھی ہو گئی۔ ۱۹۶۴ء میں کلکتہ میں دوبارہ فسادات ہونے پر مع اہل و عیال ڈھاکا آ گئے۔ قیام میرپور میں تھا۔

پیشہ: ملازمت (کراچی کے کئی ٹیکسٹائل اور جوٹ ملوں میں منیجر رہے)

دوسری ہجرت: سقوطِ ڈھاکا کے بعد۔ کراچی

وفات: غالباً ۲۰۰۸ء یا ۲۰۰۹ء، کراچی

اولاد: پانچ بیٹے، ایک بیٹی

تصانیف: چار شعری مجموعے شائع ہوئے:

۱۔ بے گماں

۲۔ زخم کی خوشبو

۳۔ آس بے آس

۴۔ یادوں کا عکس

"یادوں کا عکس"

شارق بلیاوی کا آخری شعری مجموعہ ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا۔ وہ کلکتہ میں طالب علمی کے دوران ہی شعر کہنے لگے تھے۔ لیکن کلکتے اور ڈھاکے میں وہ شاعر کی حیثیت سے معروف نہ ہوئے۔ کراچی آنے کے چند سال بعد جب انھیں فراغت نصیب ہوگئی تو وہ مشاعروں اور ادبی محفلوں میں شریک ہونے لگے اور بحیثیت شاعر وادیب معروف ہو گئے۔ وہ کتابوں پر تبصرے اور مضامین بھی لکھتے تھے۔ ان کے چار شعری مجموعے شائع ہوئے لیکن مضامین کا کوئی مجموعہ شائع نہ ہوا۔

شارق بلیاوی کا آخری مجموعہ "یادوں کا عکس" میرے سامنے ہے۔ یہ ان کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس میں نظموں کے علاوہ دوہے، قطعات، رباعیات اور متفرق اشعار بھی ہیں۔ اس مجموعے میں شاعر کا ایک طویل "پیش لفظ" بھی ہے جس میں انھوں نے بڑی بے ترتیبی سے اپنے حالاتِ زندگی لکھے ہیں۔ اس میں انھوں نے اپنے گاؤں کی ایک ہندو لڑکی کے ساتھ اپنے ناکام معاشقے کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور اس معاشقے کو اپنی شاعری کا سب سے بڑا محرک قرار دیا ہے۔ اس مجموعے میں زیادہ تر روایتی انداز کی رومانی نظمیں ہیں۔ چند سیاسی اور فلسفیانہ نظمیں بھی ہیں۔

نمونۂ کلام

ذیل میں "یادوں کا عکس" سے دو نظمیں اور چند متفرق اشعار درج کیے جاتے ہیں:

ہم شکلِ محبوبہ سے

(طویل نظم کے چند اشعار)

شرتی ہونٹ، نرگسی آنکھیں
خواب آلودہ جاگتی آنکھیں
تیری آنکھیں شراب چھلکائیں
مستیاں جان و دل پہ برسائیں
اک کلی تھی چٹک گئی ہے تو
پھول بن کر مہک گئی ہے تو
عشق کے واسطے حرارت تو
اپنی قامت میں ایک قیامت تو
تو جدھر بھی چلے حیات چلے
ہم ہی کیا ساری کائنات چلے
میری الفت کی یادگار ہے تو
زندگی ہے مری قرار ہے تو
تجھ سے وابستہ شاعری میری
تیرے دم سے ہے زندگی میری

سانیٹ

(اقبال عظیم کی موت پر)

ایک دانائے وقت تھا نہ رہا
بزمِ جاں میں اداسیاں پھیلیں

سائے پھیلے، اداسیاں پھیلیں
گم ہوا نور، اک دیا نہ رہا

کھو چکی تھی اگرچہ بینائی
پھر بھی باطن شناس تھا وہ شخص
قابلِ صد سپاس تھا وہ شخص
اس پہ ظاہر تھا رازِ پنہانی

لوگ اس کو عظیم کہتے ہیں
شاعری بھی عظیم ہے اس کی
گیت فطرت کے اور لے اس کی
اس کو فضلِ کریم کہتے ہیں

مغفرت اس کی اے خدا کرنا
در گزر ایک اک خطا کرنا

چند متفرق اشعار:

تیری صورت کو حسیں رنگ مصور دے دیں
تیرے جلوؤں کو وہ تصویر نہیں کر سکتے

☆☆☆☆☆

اسرار محبت کے سمجھا کے گزر جائے
بس ایک نظر دیکھے شرما کے گزر جائے

تو کہ ہے ماورائے عقل و نظر
اور لکھوں میں تیری مدحت کیا

درد تو پلکوں پہ آ کے پا گیا تسکین کچھ
زخم کا صدمہ مگر گھن کی طرح کھاتا رہا

☆☆☆☆☆

خود پرستوں سے لاکھ بہتر ہوں
تیرے کوچے کا میں گدا ہی سہی

شارقؔ بلیاوی ایک نیک، شریف اور محنتی انسان تھے۔ ساری زندگی سخت جدوجہد کی۔ ایک مزدور سے ترقی کرتے کرتے مل منیجر ہو گئے۔ بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ پانچ بیٹے اور ایک بیٹی یادگار چھوڑی۔ اللہ مغفرت فرمائے!

غالب عرفان

(شاعر، مبصر)

سوانحی خاکہ

نام: محمد غالب شریف

قلمی نام: غالب عرفان

سال پیدائش: ۱۹۳۸ء مقام پیدائش: حیدرآباد (دکن)

تعلیم: بی۔اے

پیشہ: ملازمت

پہلی ہجرت: مشرقی پاکستان۔ چاٹگام

دوسری ہجرت: سقوطِ ڈھاکا کے بعد۔ کراچی

اولاد: چار بیٹیاں، ایک بیٹا (ایک بیٹی کی وفات ہوگئی)

غالب عرفان نے ایک طویل عرصہ مشرقی پاکستان کے خوب صورت شہر چاٹگام میں گزارا، نوعمری ہی میں انھوں نے شعروشاعری شروع کردی تھی۔ چاٹگام آکر اس میں نکھار آیا۔ وہاں کے مشاعروں میں شریک ہونے اور داد وصول کرنے لگے۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد ۱۹۷۳ء میں کراچی آگئے۔

کراچی آنے کے بعد غالب عرفان کی شاعری کو اور عروج حاصل ہوا۔ وہ یہاں کی ادبی

نشستوں اور مشاعروں میں شریک ہوتے رہے اور ان کا کلام مختلف رسالوں میں شائع ہوتا رہا۔ ان کے حسب ذیل تین مجموعے کراچی سے شائع ہوئے۔

۱۔ آگہی سزا ہوئی (غزلوں کا مجموعہ) ۱۹۹۳ء

۲۔ م صلی اللہ علیہ وسلم (نعتیہ مجموعہ) ۱۹۹۹ء

۳۔ روشنی جلتی ہوئی (مجموعۂ کلام) ۲۰۰۲ء

منتخب اشعار

ذیل میں جناب غالب عرفان کے مجموعۂ کلام "روشنی جلتی ہوئی" سے غزلوں کے چند اشعار بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں:

طلسمِ ذات طرحدار چھوڑ آیا تھا
میں شہرِ خوف میں دستار چھوڑ آیا تھا
وہاں سے لوگوں نے مرنے کا فن بھی سیکھ لیا
جہاں میں زیست کا معیار چھوڑ آیا تھا
یہ اور بات ہے اس کو نہ پا سکا لیکن
بسا بسایا میں گھر بار چھوڑ آیا تھا
کسے بتاؤں کہ علم و عمل کے بیچ کہیں
میں اپنی خوشبوئے کردار چھوڑ آیا تھا

☆☆☆☆☆

مسافتوں میں کہیں بھی کوئی پڑاؤ نہ تھا
سفر کی دھوپ کو دستار کر لیا میں نے
خود اپنی روشنی طبع مرتکز کر کے
حدودِ فکر کو بھی پار کر لیا میں نے

قمری اپنی دھن میں تھی پروازوں کی
نیت کس نے دیکھی تھی شہبازوں کی
نغمۂ عرفاںؔ کی خاموشی میں پنہاں
آوازیں ہیں وقت کے سارے سازوں کی

کھول کر اک کتابِ دانائی
جھیلتا ہوں عذابِ تنہائی
تیرے چہرے کی دھوپ کے آگے
سایہ سایہ ہے میری بینائی
ہو رہی ہے ترے تعقب میں
نت نئے رنگ سے شناسائی
میں ہوں رفتار وقت کا دریا
تو سمندر مثال گہرائی
میرا چہرہ ہے آئینے میں یا
عکسِ عرفاںؔ مرا تماشائی

حکیم محمد سعید، غالب عرفان کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''انھوں نے اپنی فکر کو روایتی سوچ تک محدود نہیں رکھا ہے۔ جدید فکر اپناتے ہوئے حیات و کائنات کے بارے میں جدید نظریات کو اپنی شاعری میں ڈھالا ہے۔ ان کی شاعری عہد حاضر کے اجتماعی مزاج سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔''

(''روشنی جلتی ہوئی''۔ ص: ۱۷)

غالب عرفان ایک اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ انھوں نے بہت سی کتابوں پر تبصرے لکھے ہیں اور تنقیدی مضامین بھی۔

❖❖

رئیس باغی

(جدت پسند شاعر)

سوانحی خاکہ

نام: رئیس الرحمن خاں

قلمی نام: رئیس باغی

والد کا نام: محفوظ الرحمن خاں یوسف زئی (مرحوم)

پیدائش: یکم نومبر ۱۹۳۱ء

تعلیم: ایم۔ اے، بی۔ ایڈ   پیشہ: تدریس

پہلی ہجرت: مشرقی پاکستان

دوسری ہجرت: کراچی

''چیری کھلنے تک''

میرے پیش نظر رئیس باغی کا مجموعہ ''چیری کھلنے تک'' ہے جو ہائیکو کا مجموعہ ہے اور کراچی سے ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ صفحات ۱۸۴۔ اس کتاب میں ڈاکٹر فہیم اعظمی، پروفیسر آفاق صدیقی، پروفیسر ریاض صدیقی اور رؤف نیازی کے مضامین شامل ہیں۔

جناب رئیس ہاشمی اپنے دیباچہ "عرضِ حال" میں لکھتے ہیں:

"میں نے شاعری غزل گوئی سے شروع کی۔ نظمیں، رباعیات، قطعات، حمد اور نعتیں بھی کہتا ہوں۔ تاریخ گوئی سے بھی دلچسپی ہے۔ لیکن میری محبوب ترین صنفِ سخن غزل ہی ہے۔ ہائیکو گوئی میں نے ۱۹۹۶ء میں شروع کی۔ ہائیکو کی صنف مختصر مدت میں اردو کی اصنافِ سخن میں اس طرح گھل مل گئی ہے کہ اب یہ اردو ہی کی ایک صنفِ سخن معلوم ہوتی ہے۔"

("چیری کھلنے تک"۔ ص:۳۳)

نمونۂ کلام

تیرا پیارا نام
میرے لب پر رہتا ہے
مولا! صبح و شام

آشا دیپ جلے
اس نے ہنس کر دیکھا تو!
دل میں پھول کھلے

چشمِ تر کی بات
باہر جانے مت دینا
اپنے گھر کی بات

تھی یہ میری بھول
اس کے ہاتھ میں پتھر تھا
اور میں سمجھا پھول

ایسا ابتر حال
انسانوں کی دنیا میں!
انسانوں کا کال

پیار کا رشتہ جوڑ
انسانوں سے اے ناداں!
نفرت کرنا چھوڑ

ایسا صدمہ حیف
اس کے اٹھ کر جانے سے
محفل ہے بے کیف

تنہا چھوڑ گئے
دکھ میں مخلص ساتھی بھی
رشتہ توڑ گئے

غافل ہیں عمال
اور مہنگائی لوگوں کی
کھینچ رہی ہے کھال

شاعر کی پہچان
بہتا دریا خوشبو کا
اور اچھا انسان

❖❖

یاور امان

(شاعر، صحافی، مبصر)

سوانحی خاکہ

نام: سید امان اللہ

قلمی نام: یاور امان (شروع میں کچھ عرصہ امان ہرگانوی کے نام سے لکھتے رہے)

والد کا نام: سید عبدالرؤف (مرحوم)

جائے پیدائش: ہرگانواں (بہار)

تعلیم: انٹر (ڈھاکے سے میٹرک اور انٹر کے امتحانات پاس کیے)

پہلی ہجرت: ۱۹۶۰ء۔ سابق مشرقی پاکستان۔ کھلنا

دوسری ہجرت: سقوط ڈھاکا کے چند سال بعد۔ کراچی

پیشہ: صحافت۔ ملازمت (۲۰۰۱ء میں حج کی سعادت حاصل کرنے کے بعد ریٹائر ہو گئے)

اولاد: تین بیٹے، تین بیٹیاں (سب بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی، دو بیٹے باہر ہیں)

''انہدام''

یاور امان نے سقوطِ ڈھاکا کے بعد شاعری شروع کی۔ ان کا شعری مجموعہ ۲۰۰۹ء میں کراچی سے ''انہدام'' کے نام سے شائع ہوا جس پر پروفیسر علی حیدر ملک نے دیباچہ لکھا ہے۔ اس کے علاوہ خود شاعر نے ''من آنم کہ من دانم'' کے عنوان سے اپنے حالات لکھے ہیں۔ یاور امان صاحب نے شاعری کی ہر صنف پر طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کا رجحان غزل کی طرف زیادہ ہے۔ لہٰذا یہ مجموعہ تمام تر غزلوں پر مشتمل ہے۔ صفحات ۳۱۲ ہیں۔ کل ۲۰۱ غزلیں ہیں۔ کلام میں جدت، ندرت اور انفرادیت ہے۔ یاور امان ایک پُرگو اور زود گو شاعر ہیں۔

منتخب اشعار

میرے آگے میرے پیچھے دوستوں کا اک ہجوم
فیصلہ کرنا ہے مشکل اس میں دشمن کون ہے

باغباں سے پوچھ لو جا کر چمن میں میرا گھر
آگ جس کو کھا گئی ایسا نشیمن کون ہے

☆☆☆☆☆

یہ کیسے لوگ ہیں میری سمجھ میں آتے نہیں
ملا کے ہاتھ بھی رسماً جو مسکراتے نہیں

☆☆☆☆☆

دم گھٹنے لگا بند دریچہ کوئی کھولے
بارودگی بو تازہ ہوا مانگ رہی ہے

دن ڈوبا امانؔ آپ کی یہ راہ نوردی
رہتے ہیں کہاں گھر کا پتا مانگ رہی ہے

وہی تو ہے جسے تھی آسمانوں کی تمنا
زمیں پہ لڑکھڑا کے منھ کے بل جو گر پڑا ہے
ہتک آمیز نظروں کی خلش اب تک ہے باقی
یہ کانٹا میرے پاؤں میں نہیں، دل میں گڑا ہے

☆☆☆☆☆

ہمارے عہد میں ہم سے قلندروں کے لیے
زمین تنگ ہوئی، دور آسماں ٹھہرا
اماںؔ اب تو میں شرمندہ ہوں وفاؤں سے
مرا خلوص زمانے میں رائیگاں ٹھہرا

☆☆☆☆☆

گھر سے اجڑے ہوئے، برباد جہاں، خانہ خراب
اب یہ عالم ہے کہ جو اپنا ہے بیگانہ ہے

☆☆☆☆☆

دھوپ میں کتنی تپش، کتنی تمازت تھی اماںؔ
سائے میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے کچھ سوچا نہ تھا

کہاں تم ڈھونڈتے ہو ہم کو لوگو!
فرازِ دار پر دیکھو کھڑے ہیں

وہ جو دنیا کو سمجھتے تھے کھلونوں کی طرح
ان کو دیکھا ہے بلکتے ہوئے بچوں کی طرح
ان دنوں وقت کا معیار ہے قائم ہم سے
ہم گزر جائیں گے اک قیمتی لمحے کی طرح

اپنے اس عہد کی تاریخ مرتب کر لو
وقت شاید کبھی دہرائے صحیفے کی طرح
مجھ کو بھی ماہر آثار قدیمہ ڈھونڈیں
میں کہ بکھرا ہوا صدیوں سے ہوں ملبے کی طرح
اب تو یوں لگتا ہے قسطوں میں ادا کرتے ہوئے
زندگی مانگ کے ہم لائے ہیں قرضے کی طرح
سرد خانوں کی حرارت سے ہوا ہے محسوس
برف بھی جسم جلا دیتی ہے شعلے کی طرح
گرد آلود نہ ہو زرد ہواؤں سے امانؔ
ایک چہرہ کہ جو شفاف ہے شیشے کی طرح

جوانی دور پیچھے رہ گئی ہے
میں ڈھلتی عمر کا جغرافیہ ہوں

یاور امان ایک زندہ دل، خوش مزاج، کھرے اور بے ریا انسان ہیں۔ ادبی سرگرمیوں میں ہمیشہ دلچسپی لیتے رہے۔ انھوں نے ادب کی ہر صنف کو اپنی جولان گاہ بنایا۔ ادبی زندگی کا آغاز نثر نگاری سے کیا۔ امان ہرگانوی کے نام سے ایک عرصے تک مضمون نگاری، فیچر نگاری، افسانہ نگاری اور بنگلہ اور ہندی افسانوں کے ترجمے کرتے رہے۔ صحافت سے بھی تعلق رہا۔ قیامِ بنگلہ دیش کے بعد یاور امان کے نام سے شاعری کا آغاز کیا۔

کراچی میں ملازمت کی مصروفیتوں کے باوجود لکھنے لکھانے کا کام بھی جاری رہا۔ وہ اپنے دیباچہ ''من آنم کہ من دانم'' میں لکھتے ہیں:

''ملازمت کے ساتھ میرا ادبی سلسلہ بھی جاری رہا۔ لہٰذا اسّی اور نوّے کی دہائی میں معاوضہ دینے والے پرچوں میں میرے مضامین (شوبز کے حوالے سے) فیچر اور ترجمے

تواتر کے ساتھ شائع ہوئے۔ جز وقتی طور پر میں نے "علامت" کراچی کے لیے کام کیا۔ "ینگ چینل" میں اعزازی ایگزیکیوٹو ایڈیٹر کی حیثیت سے اور ہفت روزہ "اورنگین" میں بہ طور مدیر خدمات انجام دیں۔ تا حال کتابی سلسلہ "خیال" کی معاونت کر رہا ہوں۔"

فی الحال یاور امان مکمل طور پر ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے ہیں۔ "خیال" سے بھی کچھ عرصہ قبل الگ ہو چکے ہیں۔ مختلف عوارض میں مبتلا ہونے کے باوجود معاشی طور پر مطمئن اور خوش حال ہیں۔

اسرار پریم نگری

(منفرد شاعر)

سوانحی خاکہ

نام: سید محمد یوسف

قلمی نام: اسرار پریم نگری

والد کا نام: بیرسٹر نذیر الحسین (نذیر جہانگیر نگری)

تعلیم: ایم۔اے (انگلش)، ایم۔اے (اردو)، ایل ایل بی

پیشہ: وکالت (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)

پہلی ہجرت: ڈھاکا

دوسری ہجرت: سقوطِ ڈھاکا کے بعد۔ کراچی

اولاد: اسرار نے ''آبگینہ'' کے دیباچہ میں اپنے دو تین بیٹوں کا ذکر کیا ہے۔

''آبگینہ''

اسرار پریم نگری کا مجموعۂ کلام ''آبگینہ'' ۲۰۰۰ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ حمد و نعت اور چند نظموں کے علاوہ پورا مجموعہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ صفحات ۱۴۴ ہیں۔

اسرار پریم نگری کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ نوجوانی میں ان کے دو شعری مجموعے ''اجرائے

پریشاں" اور "ضیائے صبح" ڈھاکے سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئے۔ اسرار صاحب کے دادا مبارک عظیم آبادی، داغ دہلوی کے شاگرد اور بہار کے ممتاز اساتذہ میں تھے (خواجہ ریاض الدین عطش مرحوم نے ان کی شخصیت پر کتاب بھی لکھی)۔

زیرِ نظر مجموعہ "آبگینہ" کا انتساب یہ ہے:

ان سچے پاکستانیوں کے نام

جو زبانِ بے زبانی سے چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں:

اے ارضِ پاک تیری محبت میں دیکھنا
ہم خانماں خراب کہاں تک پہنچ سکے
سڑتے ہیں کیمپوں میں فقط اس امید پر
شاید ہماری خاک وہاں تک پہنچ سکے

منتخب اشعار

کیا کیا فریب تو نے دیے زندگی مگر
ہم جانتے ہوئے بھی تہِ دام آ گئے

☆☆☆☆☆

وہ آنکھ بند جو کر لے تو مورتی سی لگے
وہ آنکھ کھولے تو جیسے کوئی ستارا ہے

☆☆☆☆☆

اسیرِ فصلِ بہاراں ہیں آپ بھی ہم بھی
حقیقتوں سے گریزاں ہیں آپ بھی ہم بھی
جلائے بیٹھے ہیں سینوں میں نفرتوں کے چراغ
بہی سبب ہے پریشاں ہیں آپ بھی ہم بھی

ہوا کا یک ہی جھونکا بجھا کے رکھ دے گا
چراغِ نیم فروزاں ہیں آپ بھی ہم بھی
گلوں کو بیچ کے فصلِ بہار کیا لیں گے
یہ بات سچ ہے پشیماں ہیں آپ بھی ہم بھی
ہزار اپنی زباں سے نہ ہم کہیں اسرار
یہی ہے سچ کہ ہراساں ہیں آپ بھی ہم بھی

☆☆☆☆☆

قوتِ بازو سے خود اپنا جہاں پیدا کرو
اک زمیں پیدا کرو اک آسماں پیدا کرو
اس کو کم مایہ نہ سمجھو، آنکھ سے گرنے نہ دو
آنسوؤں سے ایک بحرِ بے کراں پیدا کرو

لہو سارا بدن کا بہہ گیا ہے
فقط اک عزم زندہ رہ گیا ہے
لکھیں یوں تو ہزاروں داستانیں
ورق سادہ ہی دل کا رہ گیا ہے
مریضِ عشق یوں تو کچھ نہ بولا
کہانی پھر بھی اپنی کہہ گیا ہے
عمارت کیا کروں تعمیر دل کی
مکانِ آرزو تھا ڈھہ گیا ہے
مقدر نے مجھے جو غم بھی بخشے
مرا دل ہنستے ہنستے سہہ گیا ہے

❖❖

انور فخری

(صالح فکر کا ترجمان)

سوانحی خاکہ

نام: نجم انور فخری

قلمی نام: انور فخری (سابقہ انور کاکوی)

والد کا نام: سید زین الدین فخری (شوقؔ عظیم آبادی)

سال پیدائش: ۱۹۴۱ء

مقام پیدائش: قصبہ کاکو، ضلع گیا (بہار)

تعلیم: ایم۔اے اُردو (کراچی)

پیشہ: ملازمت، بینکاری (ریٹائرڈ)

پہلی ہجرت: سابق مشرقی پاکستان۔۱۹۵۷ء

دوسری ہجرت: کراچی۔۱۹۷۱ء

اولاد: چار بیٹے، چار بیٹیاں (سب اعلیٰ تعلیم یافتہ اور شادی شدہ ہیں)

کتابیں: ۱۔چہرے پہ لکھ رہا ہوں (شعری مجموعہ)۔۱۹۹۹ء

۲۔چہرے پہ لکھ رہا ہوں مع اضافہ دوسرا ایڈیشن۔۲۰۰۱ء

۳۔آئینۂ باطن (شعری مجموعہ)۔۲۰۱۱ء

انور فخری آٹھویں جماعت میں تھے کہ ۱۹۵۷ء میں اپنی بہن اور بہنوئی کے پاس عالم ڈانگا (سابق مشرقی پاکستان) آگئے۔ چند سال کے بعد انھیں کے ساتھ جیسور چلے گئے۔ جیسور سے ۱۹۶۱ء میں میٹرک پاس کیا۔ پھر ڈھاکا آگئے۔ ۱۹۶۳ء میں یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ (UBL) میں انھیں نوکری مل گئی۔ پوسٹنگ نرائن گنج میں ہوئی۔ قیام نرائن گنج ہی میں رہا۔ ۱۹۶۵ء میں شادی ہوگئی۔ اسی دوران پرائیوٹ طور پر انٹر کا امتحان پاس کرلیا۔ ۱۹۶۴ء میں ان کے والد شوق عظیم آبادی (۱۹۰۰ء۔ ۱۹۷۸ء) بھی ڈھاکا آگئے۔ وہ ایک کہنہ مشق اور دینی و اخلاقی اقدار کے پاسدار شاعر تھے۔ سند یافتہ ہومیو پیتھی ڈاکٹر بھی تھے۔ ۱۹۷۰ء میں اپنے بڑے بیٹے کے پاس کراچی چلے گئے۔ ان کا مجموعۂ کلام ”کفِ گل فروش“ ۱۹۸۷ء میں کراچی سے شائع ہوا (ان کا تفصیلی تذکرہ پیش کیا جاچکا ہے)۔ ۱۹۶۹ء میں انور فخری نے اپنا تبادلہ نرائن گنج سے ڈھاکا کروالیا اور میر پور ساڑھے گیارہ نمبر میں رہائش اختیار کرلی۔ ۱۹۷۱ء میں جب ڈھاکے میں ہنگامے شروع ہوئے تو وہ مع اہل و عیال کراچی آگئے۔

انور فخری نے ۱۹۶۳ء سے شاعری شروع کی۔ لیکن ملازمت کی مصروفیتوں کی وجہ سے مشاعروں اور دیگر ادبی سرگرمیوں میں شرکت کا موقع بہت کم ملا۔ وہ ڈھاکے میں شاعر کی حیثیت سے معروف نہ تھے۔

کراچی آنے کے بعد انور فخری نے بی۔اے اور ایم۔اے کے امتحانات پاس کیے۔ مشاعروں میں شریک ہونے لگے اور ان کا کلام رسالوں میں بھی شائع ہونے لگا اور وہ ایک شاعر کی حیثیت سے معروف ہوگئے۔ ان کے تین شعری مجموعے بھی شائع ہوئے۔

انور فخری کے چار بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ سب شادی شدہ ہیں۔ ایک بیٹا الگ رہتا ہے۔ باقی تینوں بیٹے ان کے ساتھ رہتے ہیں۔

''آئینۂ باطن''

انور فخری کا نیا مجموعہ ''آئینۂ باطن'' جو چند ماہ پہلے (۲۰۱۱ء) شائع ہوا ہے، ۶۰ غزلوں پر مشتمل ہے۔ شروع میں حمد و نعت اور آخر میں چند قطعات اور نظمیں ہیں۔ صفحات ۱۶۰۔ ان کے کلام میں سادگی، صفائی اور پاکیزگی ہے۔ بحیثیت مجموعی ان کا کلام صالح فکر کا ترجمان ہے۔

ذیل میں نمونۂ کلام کے طور پر چند اشعار درج کیے جاتے ہیں:

آئینہ دل کا صاف ہوتا ہے
گھر میں بیٹھے طواف ہوتا ہے

ہر عبادت میں صدق سے اونچا
بندگی کا گراف ہوتا ہے

رت جگا کر کے دن میں سو جانا
روح کے برخلاف ہوتا ہے

اشک بہتا ہے آنکھ سے انورؔ
میل باطن کا صاف ہوتا ہے

☆☆☆☆☆

میں خود سے دور ہوتا جا رہا ہوں
بہت مجبور ہوتا جا رہا ہوں

مسافت عشق میں بڑھنے لگی ہے
تھکن سے چور ہوتا جا رہا ہوں

سنا یہ ہے مجھے تم چاہتے ہو
بہت مغرور ہوتا جا رہا ہوں

خوشا کعبہ مری نظروں کے آگے
سراپا نور ہوتا جا رہا ہوں

مجھے اقوؔر کچھ ایسے غم ملے ہیں
کہ میں مسرور ہوتا جا رہا ہوں

قطعات

ربِ کعبہ ہی بس سہارا ہے
کوئی دشمن نہیں ہمارا ہے
سچ تو یہ ہے کہ خود غلط ہیں ہم
اپنے لوگوں نے ہم کو مارا ہے

بڑی خرابی ہے اندرِ انا کے بُت توڑو
کسی بھی حال میں اقوؔر نماز مت چھوڑو
کوئی پکارنے والا پکارتا ہے مدام
جدھر پکارتا ہے وہ اُدھر کو تم دوڑو

☆☆☆☆☆

ایک جیسے ہیں یہ سب اہلِ کتاب
ان کو لے ڈوبا ہے انسانوں کا خوف
کوئی بھی ڈرتا نہیں اللہ سے
دل میں بیٹھا ہے مسلمانوں کا خوف

☆☆☆☆☆

اس حکومت کی دریا دلی بڑھ گئی
ان کی عشرت بھری زندگی بڑھ گئی
حکمراں نوٹ پہ نوٹ چھاپا کیے
جا بجا ملک میں خود کشی بڑھ گئی

✿✿

مسعود عظیم آبادی

(اسلام پسند شاعر)

سوانحی خاکہ

نام: محمد مسعود عالم

قلمی نام: مسعود عظیم آبادی

تاریخ پیدائش: ۵/ جون ۱۹۴۲ء

جائے پیدائش: موضع بانک، تھانہ منیر، ضلع پٹنہ (بہار)

تعلیم: ایم اے (معاشیات)

پیشہ: تجارت

پہلی ہجرت: ۱۹۴۸ء پاربتی پور (سابق مشرقی پاکستان)

دوسری ہجرت: ۱۹۷۱ء، کراچی

"پیامِ سحر"

مسعود عظیم آبادی کا مجموعہ کلام "پیامِ سحر" ۱۹۸۸ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کے بارے میں ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ شاعر نے پہلی بار ۱۹۸۵ء میں (عمر ۴۳ سال) شعر

کہنا شروع کیا اور اس پُر گوئی اور زود گوئی کے ساتھ کہ دو سال میں یہ ضخیم مجموعہ تیار ہو گیا۔ مسعود عظیم آبادی اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ "میری شاعری کے تانے بانے تقریباً دو سالوں پر محیط ہیں۔ میں نے اگست ۱۹۸۵ء میں ایک حمد کہی اور اکتوبر ۱۹۸۵ء سے باقاعدہ شعر کہنا شروع کر دیا۔ یہ مجموعۂ کلام تقریباً دو سال کی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔" یہ مجموعہ ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ متعدد حمد و نعت کے علاوہ نظمیں اور غزلیں دونوں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ زبان و بیان صاف ستھری اور پُر اثر ہے۔

مسعود صاحب اسلام اور پاکستان کے شیدائی ہیں۔ ان کی شاعری مقصدی شاعری ہے، جس میں اسلامی اور اخلاقی اقدار کی ترجمانی کی گئی ہے۔ سورۂ رحمٰن کا مکمل ترجمہ بھی موجود ہے (یہ ترجمہ الگ کتابچے کی شکل میں بھی شائع ہوا)۔ ان کی غزلیں بھی نظم نما ہیں جن میں ان کے افکار و نظریات نمایاں ہیں۔

مسعود صاحب نے بیس صفحوں کا ایک طویل دیباچہ "میری زندگی کا سفر" کے عنوان سے لکھا ہے، جس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ سابق مشرقی پاکستان آنے والے مہاجروں نے جب سخت محنت اور تگ و دو کے بعد ایک ویران اور بنجر خطّے کو چمن زار بنا دیا تو کہا گیا کہ "یہ چمن ہے ہمارا تمھارا نہیں" اور پھر "جرمِ وفا" پر ان کا قتلِ عام کیا گیا۔

افسر ماہ پوری مرحوم کا دیباچہ بھی اس کتاب میں شامل ہے۔

نمونۂ کلام

ذیل میں نمونتاً ایک نظم درج کی جاتی ہے۔

یہ پاسبانِ ملّت

کشتِ ملّت میں جو تخمِ خیر بو سکتا نہیں
شوئ تقدیرِ ملّی پہ جو رو سکتا نہیں

اپنے دل میں قوم کے جو دکھ سمو سکتا نہیں
بوجھ حق کا اپنے کاندھوں پر جو ڈھو سکتا نہیں
وہ کبھی بھی پاسباں ملّت کا ہو سکتا نہیں

جس کی اپنی ذات میں اسلاف کی سیرت نہ ہو
جس کی آنکھوں میں جھلکتی قوم کی غیرت نہ ہو
دولتِ ہستی میں جس کی گوہرِ جرأت نہ ہو
دل کے آئینے میں جس کے صورتِ رفعت نہ ہو
وہ کبھی بھی پاسباں ملّت کا ہو سکتا نہیں

جو صداقت میں نہ ہو صدیقؓ جیسا دیندار
جو عدالت میں نہ ہو فاروقؓ جیسا باوقار
وصفِ عثمانؓ نہ جس کی ذات سے ہو آشکار
کوندتی ہو تیغ جس کی گر نہ مثلِ ذوالفقار
وہ کبھی بھی پاسباں ملّت کا ہو سکتا نہیں

اپنی قدرت سے الٰہی ایسا رہبر کر عطا
دل میں جس کے موج زن ہو ہر نفس خوفِ خدا
گامزن راہِ صداقت پر جو رہتا ہو سدا
ہم نوائی بے کسوں کی جو کرے صبح و مسا
ورنہ بیڑا پار اس ملّت کا ہو سکتا نہیں

مسعود عظیم آبادی نے غزلیں زیادہ کہی ہیں۔ ذیل میں ان کی غزلوں کے چند اشعار درج

کیے جاتے ہیں:

اپنی منزل سراب ہو جیسے
ہم پہ کوئی عذاب ہو جیسے
زندگانی حباب ہو جیسے
کوئی پا بہ رکاب ہو جیسے
عمر رفتہ کی یاد آتی ہے
کوئی بجتا رباب ہو جیسے
آج ہر سو ہے مضطرب انساں
آمدِ انقلاب ہو جیسے

☆☆☆☆☆

کام دنیا میں کوئی مشکل نہیں
آدمی میں عزم و ہمت چاہیے
تا کجے طرزِ کہن کا ساتھ ہو
ہر ہنر میں آج جدت چاہیے
حسن اس کا ہر نفس ہے جلوہ گر
دید کو چشمِ بصیرت چاہیے
کون اب مسعودؔ ناصح کی سنے
بات میں کچھ تو لطافت چاہیے

عیاں مجھ پر ہوا یہ جستجوئے رازِ قدرت سے
کہ میں اب تک رہا نا آشنا اپنی حقیقت سے
چمکتی صبح کے مالک سے مانگو مانگنے والو!
ملے گا مانگنے سے کیا کسی مٹی کی مورت سے

جسے چاہے وہ عزت دے جسے چاہے وہ ذلت دے
حقیقت کیا ہے انساں کی جو ٹکرائے مشیت سے

حاجت ہے آج کفر کو ضرب شدید کی
لاؤ کہیں سے تیغ تم ابن ولیدؓ کی
روشن ہے قصر پیر چراغوں کے نور سے
تاریکیوں میں ڈوبی ہے کٹیا مرید کی
کھل جائے جس سے قفل جہاں میں امان کا
دنیا کو ہے تلاش اک ایسی کلید کی

آدمی کیا چیز ہے پتھر بھی ہو جاتا ہے موم
کہہ کے دیکھے تو کوئی دل میں اتر جانے کی بات

غرور حسن بھی ہے مستی شباب بھی ہے
تمہارے سامنے دریا بھی ہے حباب بھی ہے

☆☆☆☆☆

تم جب بھی مری قبر کی جانب سے گزرنا
ہستی کی حقیقت کو مرے دوست سمجھنا

☆☆☆☆☆

مزاج یار تو آخر مزاج یار ہوتا ہے
نہ چھیڑو ذکر ماضی کا کسی پہ بار ہوتا ہے

✿✿

مشرق صدیقی

(منفرد شاعر)

سوانحی خاکہ

نام: کوثر علی صدیقی

قلمی نام: مشرق صدیقی / کوثر صدیقی

والد کا نام: عبدالجبار صدیقی (مرحوم)

تاریخ پیدائش: ۱۰ر مارچ ۱۹۳۳ء

مقام پیدائش: علی پور، کلکتہ

آبائی وطن: جگدیش پور، آرہ (بہار)

تعلیم: بی۔ اے، بی ایڈ (ڈھاکا، مشرقی پاکستان)

پیشہ: ملازمت (ریٹائرڈ)

اولاد: چار بیٹے، چار بیٹیاں

پہلی ہجرت: ۱۹۵۲ء۔ مشرقی پاکستان، آدم جی نگر، نرائن گنج

دوسری ہجرت: سقوطِ ڈھاکا کے چند سال بعد۔ کراچی

"عکسِ شعور"

مشرق صدیقی کا مجموعہ "عکسِ شعور" ۲۰۰۰ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ یہ تمام تر غزلوں کا مجموعہ ہے، آخر میں چند نظمیں بھی شامل کرلی گئی ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۶۰ صفحات اور ۹۰ غزلوں پر مشتمل ہے۔ کتاب میں جناب ہادی حسین، نوشاد نوری، احمد الیاس کے مضامین بھی ہیں۔ شاعر نے اپنے تفصیلی حالات "آئینۂ احوال" کے عنوان سے لکھا ہے۔

مشرق صدیقی کے بچپن اور جوانی کا زمانہ آدم جی نگر (نرائن گنج) میں گزرا۔ یہیں ان کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ اسکول کے زمانے ہی سے انھوں نے ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کردیا تھا۔ نوعمری ہی میں شعر کہنے اور مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ لیکن مشرقی پاکستان میں بحیثیت شاعر معروف نہ ہوئے۔ وہ ایک مستعد، فعال اور سعادت مند نوجوان تھے اور مقامی طور پر ادب کی خدمت میں لگے رہتے تھے۔

سقوطِ ڈھاکا کے چند سال کے بعد مع اہل وعیال کراچی آئے۔ وہ یہاں آنے سے پہلے ڈھاکے سے بی۔اے اور بی۔ایڈ کے امتحانات پاس کر چکے تھے۔ یہاں انھیں "ڈبلیو ووڈ ورڈز (پاکستان) پرائیوٹ لمیٹڈ" میں ملازمت مل گئی اور وہ یہیں سے ۲۰۰۴ء میں ریٹائر ہوئے۔ کراچی آکر وہ مشاعروں اور ادبی نشستوں میں شریک ہونے لگے اور یہاں کے معروف شعرا میں ان کا شمار ہونے لگا۔

جناب ہادی حسن نے اپنے مضمون "حرفِ اوّل" میں مشرق صدیقی کی شخصیت اور شاعری کا بڑی خوبی سے تجزیہ کیا ہے۔ وہ ان کے اسکول کے استاد ہیں اور ان کی ساری زندگی ان کے سامنے ہے۔ وہ ان کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مشرق صدیقی نے شاعری کے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام میں حمد، نعت، نظمیں وغیرہ شامل ہیں مگر بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں اور غزل ہی کے ذریعہ اپنی بات کہنا پسند کرتے ہیں.......... مشرق صدیقی کو شاید ابھی اپنے لہجے

کی تلاش ہے۔ انھوں نے روایتوں سے اپنا رشتہ برقرار رکھتے ہوئے جدید رجحانات کو اپنانے کی کوشش کی ہے اور بڑی حد تک ان کی یہ کوشش کامیاب بھی ہے۔ ان کا یہ شعری مجموعہ (عکسِ شعور) اردو شاعری میں ایک اور دلکش اضافہ ہے۔"

نمونۂ کلام:

ساری شے ٹوٹتی ہے باہر سے
آدمی ٹوٹتا ہے اندر سے
میں بھی کیا کیا امید رکھتا ہوں
باغ کے نخلِ بے ثمر ور سے
گھر پڑوسی کا جل رہا ہے مگر
اٹھ رہا ہے دھواں مرے گھر سے
بات جہد و عمل سے بنتی ہے
کیوں شکایت کریں مقدر سے
گو تناور دکھائی دیتا ہے
یہ شجر کھوکھلا ہے اندر سے
راس آئی نہ فصلِ گل مشرقؔ
پھول شبنم کی بوند کو ترسے

☆☆☆☆☆

اڑ رہی ہیں دھجیاں تہذیب کی
بے حیائی کا ثقافت نام ہے
خواہشِ دنیا میں کیوں ہر آدمی
اس قدر مصروف صبح و شام ہے

اہلِ دل ہوتے نہیں اس کا شکار
یہ جہانِ رنگ و بو اک دام ہے
دوسروں کے واسطے زندہ رہو
زندگی کو ورنہ کیا پیغام ہے
رنگ لائی آہِ مرغانِ قفس
آج خود صیاد زیرِ دام ہے

سمن برانِ جہاں سے کشاں کشاں گزرے
تری تلاش میں جانے کہاں کہاں گزرے
رکوں تو گردشِ دوراں کی سانس رک جائے
چلوں تو گردِ قدم بن کے آسماں گزرے
گیا ہے عشق ہمیشہ ادھر سے تنہا ہی
وفا کی راہ میں کیوں قافلہ کارواں گزرے
میں ان کو ذہن سے مشرق بھلا نہیں سکتا
جو واقعات نگاہوں سے خوں چکاں گزرے

مشرق صدیقی کو نثر نگاری سے بھی دلچسپی ہے۔ انھوں نے ادبی کتابوں پر بہت سے تبصرے لکھے ہیں اور یادنگاری کے سلسلے میں متعدد مضامین بھی۔

❖❖

حبیب احسن

(شاعر، افسانہ نگار، مدیر)

سوانحی خاکہ

نام: شاہ محمد حبیب احسن

قلمی نام: حبیب احسن

والد کا نام: محمد احسن مرحوم

تاریخ پیدائش: ۱۷/اپریل ۱۹۴۳ء

جائے پیدائش: سمستی پور، بہار، بھارت

تعلیم: بی۔اے آنرز

پہلی ہجرت: سابق مشرقی پاکستان، دیناج پور

دوسری ہجرت: کراچی

''فشارِ درد''

حبیب احسن کا مجموعۂ کلام ''فشارِ درد'' ۱۹۹۸ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ اس میں شاعر کے علاوہ پروفیسر اظہر قادری، پروفیسر علیم اللہ حالیؔ، شفیق محمد شفیق اور اسلم فریدی کے دیباچے بھی ہیں۔

صفحات ۱۵۶ ہیں۔ مجموعے میں حمد، نعت اور چند نظموں کے علاوہ سب غزلیں ہیں۔

حبیب احسن جب تک مشرقی پاکستان میں رہے، افسانے لکھتے رہے۔ کراچی آنے کے بعد بھی ایک عرصے تک یہی شغل رہا۔ ۱۹۷۹ء سے انھوں نے شعر گوئی شروع کی اور مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ کئی سال سے کتابی سلسلہ "خیال" کراچی سے نکال رہے ہیں۔

منتخب اشعار

رات، خاموشی، اکیلا راستہ
جنگلوں کے بیچ سہما راستہ
جل رہے تھے آسمانوں پر دیے
میں زمیں پر ڈھونڈتا تھا راستہ
کھل رہے ہیں پھول جس کے آس پاس
ہے وہی تو اپنے گھر کا راستہ
چھوٹے چھوٹے پاؤں مٹی میں اٹے
اور ہزاروں میل لمبا راستہ

☆☆☆☆☆

درِ زنداں کھلا، زنجیر جاگی
کسی مقتل کی پھر تقدیر جاگی
ہوئی تقسیم در تقسیم دہلیز
پرانے خواب کی تعبیر جاگی
ہوا احساس جب اس بے گھری کا
دلوں میں درد کی تنویر جاگی

لہو اپنا بہایا ہم نے جب بھی
وطن کی، قوم کی توقیر جاگی

☆☆☆☆☆

کس لیے جاتا تمھارے شہر میں
کون تھا میرا تمھارے شہر میں
ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا ہمیں
چاہنے والا تمھارے شہر میں

جس کا ہو حرف محبت سے آشنا
بک شیلف سے نکال کے ایسی کتاب دو
مجھ کو بھی کالی رات میں رستہ دکھائی دے
ایسا کوئی چراغ، کوئی ماہتاب دو

❖❖

اسلم فریدی

(غزل گو، نعت گو)

سوانحی خاکہ

نام: سید محمد اسلم

والد کا نام: سید محمد مسلم

قلمی نام: اسلم فریدی (فریدی تخلص)

تاریخ پیدائش: ۲۸ر نومبر ۱۹۳۶ء

جائے پیدائش: ضلع سمستی پور (بہار)

تعلیم: بی۔کام (قائد اعظم کالج، ڈھاکا، ۱۹۶۸ء)

پہلی ہجرت: سابق مشرقی پاکستان۔۱۹۶۲ء

دوسری ہجرت: کراچی۔۱۹۷۹ء

اساتذہ: پروفیسر فروغ احمد سے ۱۹۶۷ء میں قائد اعظم کالج میں حصول تعلیم کے دوران اپنے کلام پر اصلاح لیتے رہے۔ ۱۹۷۲ء میں علامہ ماہر فریدی جب ڈھاکا آئے تو ان سے اصلاح لینے لگے اور یہ سلسلہ ۱۹۷۸ء تک جاری رہا۔

پہلا مجموعہ: "افکار فریدی" ۱۹۷۴ء میں ڈھاکے سے شائع ہوا سقوط ڈھاکا کے بعد ڈھاکا سے شائع ہونے والا یہ دوسرا مجموعہ تھا۔ پہلا مجموعہ ظہور السبار کی کا تھا جو ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔

"پچھلے پہر کا چاند"

اسلم فریدی کا مجموعہ "پچھلے پہر کا چاند" کراچی سے ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب میں تابش دہلوی، پروفیسر اظہر قادری، مشتاق شبنم، شفیق احمد شفیق، ایم الیاس اور حبیب احسن کی تقریظیں بھی شامل ہیں۔ کتاب کے شروع میں چند حمد و نعت اور نظمیں ہیں۔ اس کے بعد ۸۴ غزلیں ہیں۔ صفحات ۱۶۰۔

منتخب اشعار

دونوں اسیرِ گردشِ دوراں ہیں دوستو
میں ہوں زمیں پہ، چاند فلک پر سفر میں ہے
دیتے نہیں ہیں محنتِ مزدور کا صلہ
یہ وسعتِ نگاہ کہاں اہلِ زر میں ہے

☆☆☆☆☆

ظلمتِ شب سے ابھرتی ہوئی چیخیں تو سنو!
یہ وہ آواز ہے جو حشر بپا کرتی ہے
اپنے دروازے پہ تختی تو کوئی نصب کرو
گھر کی دیوار مکینوں سے گلہ کرتی ہے
اچھے وقتوں پہ فریدیؔ نہ کبھی ناز کرو
آزمائش کبھی یوں بھی تو ہوا کرتی ہے

☆☆☆☆☆

انھیں لوگوں کو دنیا تا قیامت یاد رکھتی ہے
جو سب کا غم سمجھتے ہیں، جو سب کے کام آتے ہیں

وہی تو لطف لیتے ہیں فریدیؔ گہری نیندوں کا
انھیں سے پوچھیے جو رزق محنت سے کماتے ہیں

جب بھی چہرہ سحر کا یاد آیا
چاند پچھلے پہر کا یاد آیا
غیر کی رہ گزر سے جب گزرے
راستہ اپنے گھر کا یاد آیا
شام جذبوں کی سُرخ ہوتے ہی
سانحہ بام و در کا یاد آیا
زخم در زخم جب سجے دل پہ
تیر ان کی نظر کا یاد آیا
آج پھر دشت میں فریدیؔ کو
سایہ اپنے شجر کا یاد آیا

اس کی باتیں تو سماعت پہ گراں ہوتی ہیں
جس کی گفتار میں بے راہ روی آ جائے
میں بھی آئینے سے دیوار سجا لوں اپنی
کاش مجھ کو بھی ہنر شیشہ گری آ جائے

اسلم فریدی کو ان کے نعتیہ مجموعہ "نازشِ دوعالمؐ" پر اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے انعام بھی مل چکا ہے۔

❖❖

عثمان قیصر

(غزل گو، نعت گو)

سوانحی خاکہ

نام: محمد عثمان

قلمی نام: عثمان قیصر

والد کا نام: حاجی عبدالکریم

تاریخ پیدائش: ۱۳؍اگست ۱۹۴۶ء

مقامِ پیدائش: مظفر پور (بہار)

پہلی ہجرت: والدین کے ساتھ مشرقی پاکستان، رنگ پور

تعلیم: میٹرک۔ راجشاہی بورڈ، مشرقی پاکستان۔ ۱۹۶۳ء

باضابطہ شاعری کا آغاز: ۱۹۷۸ء (استاد۔ صابر عظیم آبادی)

دوسری ہجرت: سقوطِ ڈھاکا کے چند سال بعد۔ کراچی

پیشہ: تجارت

اولاد: چھ بیٹے، چار بیٹیاں

کتابیں: ۱۔ "جلال سے جمال تک" (نعتیہ مجموعہ۔ ۲۰۱۰ء کراچی)

۲۔ "ستارے اور شرارے" (غزلوں کا مجموعہ)۔ زیرِ ترتیب

''جلال سے جمال تک''

عثمان قیصر ایک متحرک اور فعال انسان ہیں۔ اپنے ذاتی کاروبار کے علاوہ ہمہ وقت شعرو شاعری اور سماجی خدمات میں مصروف رہتے ہیں۔ قیام اورنگی میں ہے۔ ''حلقۂ فکر و دانش'' کے نائب صدر ہیں۔ تعلقات بہت وسیع ہیں۔ ان کا کلام پاکستان اور ہندوستان کے جرائد اور رسائل میں بکثرت شائع ہوتا ہے۔ وہ ایک پُرگو اور زود گو شاعر ہیں۔ ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔

۲۰۱۰ء میں ان کی نعتوں کا مجموعہ ''جلال سے جمال تک'' (صفحات ۲۲۴) شائع ہوا جس کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ تقریبِ رونمائی بھی ہوئی جس میں ان کے اس مجموعے پر مضامین پڑھے گئے۔ جن اخبارات و رسائل میں ان کا کلام ایک عرصے سے شائع ہو رہا ہے، ان میں ان کے مجموعے پر تبصرے بھی شائع ہوئے۔ اہلِ قلم کے توصیفی مضامین بھی اس مجموعے میں شامل ہیں۔

اس مجموعے میں ۲۴ حمد اور ۶۸ نعتیں ہیں۔ حمد و نعت کی اسی مناسبت سے کتاب کا نام ''جلال سے جمال تک'' رکھا گیا ہے۔

نمونہ کلام

حمد

تیرے کرم کی حد ہے نہ کوئی شمار ہے
ہر اک نفس کا تو ہی تو پروردگار ہے

عاجز ہوں میں تو حاکمِ با اختیار ہے
غمگین و ناتواں کا تو ہی غم گسار ہے

احکامِ بندگی سے تغافل کے باوجود
حاجت روائی بندے کی تیرا شعار ہے

اک سانس بھی محال ترے حکم کے بغیر
تیری ہی حکمتوں سے فضا سازگار ہے
تسکینِ قلب کے لیے لکھی ہے میں نے حمد
قیصرؔ! اسی عمل سے میسر قرار ہے

نعت

دنیا کے ہر غم کو بھلا کر رکھتا ہوں
یادِ نبیؐ کو دل میں بسا کر رکھتا ہوں
دشمن کو بھی دوست بنا کر رکھتا ہوں
خوئے نبیؐ کی شمع جلا کر رکھتا ہوں
جانے کب سرکار کی آمد ہو جائے
راہ میں اُن کی آنکھیں بچھا کر رکھتا ہوں
پاؤں تلے سے ہٹ جاتی ہے دھرتی کیوں
آقا! جب بھی پاؤں جما کر رکھتا ہوں
دل کا آنگن مہکا مہکا کیوں نہ رہے
ذکرِ نبیؐ کے پھول کھلا کر رکھتا ہوں
جگ والوں سے کیا لینا دینا قیصرؔ
آقا سے میں آس لگا کر رکھتا ہوں

❖❖

رضی عظیم آبادی

(نعت گو، غزل گو)

سوانحی خاکہ

نام: محمد رضی احمد

قلمی نام: رضی عظیم آبادی

والد کا نام: غلام مصطفی

تاریخ پیدائش: ۲۷ر اکتوبر ۱۹۲۷ء (سرٹیفیکٹ میں ۲ر فروری ۱۹۵۳ء)

تعلیم: بی۔ اے، ایل ایل بی

پیشہ: وکالت

پہلی ہجرت: مشرقی پاکستان۔ چاٹگام (والدین کے ساتھ)

دوسری ہجرت: ۱ اکتوبر ۱۹۷۱ء۔ کراچی

"آئینۂ یزداں"

رضی عظیم آبادی کی نعتوں کا مجموعہ "آئینۂ یزداں" ۲۰۰۶ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں ایک حمد اور ۸۸ نعتیں ہیں۔ صفحات ۲۰۸۔ شروع میں ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، پروفیسر ڈاکٹر ابرار کرت پوری، جمیل عظیم آبادی، قاری سید حبیب اللہ اور نعیم ردولوی کے

توصیفی مضامین ہیں۔ شاعر نے "میری شناخت" کے عنوان سے دیباچہ لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے بہار کی ملک برادری سے تعلق رکھنے پر فخر کا اظہار بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ اپنی تعلیم اور شعروشاعری کے بارے میں بھی کچھ تفصیل بیان کی ہے۔

جناب فہیم ردولوی اس نعتیہ مجموعے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"رضی عظیم آبادی کا اولین مجموعۂ نعت "آئینۂ یزداں" نظر کے سامنے ہے۔ چونکہ یہ حج و عمرہ کی سعادتوں سے سرفراز ہو چکے ہیں اس لیے فطری طور پر ان کے دل میں محبتِ خدا اور رسولؐ جلوہ ریز ہے۔ اسے میں عشقِ رسول تو نہیں کہوں گا کیوں کہ عشق خود فراموشی کی انتہائی منزل ہے۔ (لہٰذا "عشقِ رسولؐ" یا "عاشقِ رسولؐ" کے الفاظ مناسب نہیں۔ ہ۔ ر) لیکن ان کا دل حضور ختمی مرتبتؐ کی عقیدت ومحبت اور حضور اکرمؐ سے وابستگی کا آئینہ دار ہے۔ اس جذبۂ محبت نے رسالت مآبؐ کی توصیف وثنا کے لیے شعری ذوق عطا کیا۔"

نمونۂ کلام

نعت

تحریر لوحِ دل پہ ہے احمد کے نام کی
عادی مری زباں ہے درود و سلام کی

تاریخ کہہ رہی ہے یہ صبحِ دوام کی
اک شمع نے بساط الٹ دی تھی شام کی

تاریکیوں نے آپؐ سے پائی ہے روشنی
ذرے کو بھی زبان ملی ہے کلام کی

مل جائے خاک میری مدینے کی خاک میں
مولا یہ آرزو ہے تمھارے غلام کی

نعت

کہاں دیدہ وروں نے خواب میں ایسا سماں دیکھا
رضی نے جاگتی آنکھوں سے جو منظر وہاں دیکھا

اسے وجدان سمجھوں یا وفورِ بے خودی جانوں
سکوتِ وادیٔ طیبہ کو مصروفِ اذاں دیکھا

تکلم سے نبیؐ کے سنگ دل بھی موم ہوتے تھے
رسولِ پاکؐ کا دنیا نے اندازِ بیاں دیکھا

بیاں کیسے کروں رعنائیاں اس شہرِ بطحا کی
رضی نے خاکِ طیبہ کو بھی مثلِ کہکشاں دیکھا

مجموعے کا نام ”آئینۂ یزداں“ محلِ نظر ہے۔ ایران کے آتش پرست دو خداؤں کی پرستش کرتے تھے۔ ایک نیکی اور خیر کا خدا 'یزداں' اور دوسرے بدی اور شر کا خدا 'اہرمن'۔ ہمارے یہاں 'یزداں' اکثر خدا کے مترادف استعمال کیا جاتا ہے لیکن اس کی اصل وہی ہے جو بیان کیا گیا۔ لہٰذا کسی نعتیہ مجموعے کا نام ”آئینۂ یزداں“ مناسب نہیں۔

رضی عظیم آبادی غزلیں بھی خوب کہتے ہیں اور مشاعروں میں اپنا کلام بڑے دلکش ترنم سے پڑھتے ہیں۔ ان کی آواز میں ایک خاص کیفیت ہے۔

❖❖

نون جاوید

(شاعرِ جمال)

سوانحی خاکہ

نام: جاوید محمد خاں

قلمی نام: نون جاوید (پہلے شفق جاوید)

والد کا نام: غلام محمد خاں حشمت

پیدائش: کلکتہ (مغربی بنگال) ۔ ۱۹۵۲ء

تعلیم: میٹرک ۔ مدرسہ عالیہ، کلکتہ

انٹر ۔ قائدِ اعظم کالج، ڈھاکا

بی ۔ اے، کراچی یونیورسٹی

پہلی ہجرت: غالباً ۱۹۶۸ء ۔ ڈھاکا

دوسری ہجرت: ۱۹۷۳ء ۔ کراچی

تیسری ہجرت: ۲۰۰۳ء ۔ شکاگو (امریکہ)

اولاد: ایک بیٹا (طلحہ) اور تین بیٹیاں (صائمہ، ایمن، بتول)

”ساون رُت“

نون جاوید کا مجموعۂ کلام ”ساون رُت“ ۲۰۰۲ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ اس میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ انھوں نے اپنے عزیزوں کی شادی و سال گرہ پر بھی متعدد نظمیں کہی ہیں جو اس مجموعے میں شامل ہیں۔ بعض عزیزوں کی وفات پر مرثیہ نما نظمیں بھی لکھی ہیں۔ وہ ایک محبت سے لبریز دل رکھنے والے انسان ہیں۔ وہ اپنے بیوی بچوں اور عزیز و اقارب سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ ان کی خوشی میں خوشی اور غم میں غم محسوس کرتے ہیں جس کا اظہار ان کے اس مجموعۂ کلام سے بخوبی ہوتا ہے۔ اپنی بیٹی ”صائمہ“ پر ایک خوب صورت نظم لکھی ہے۔

ستاروں کے جہاں سے آئی ہے یہ	محبت کی مدھر شہنائی ہے یہ
نگاہوں میں چمک ہے روشنی ہے	مرے سپنوں کی یہ ننھی پری ہے
کتابوں کا ابھی سے شوق بھی ہے	اسے شعر و ادب کا ذوق بھی ہے
مصائب سے ہمیشہ دور رکھیو	خدایا اس پہ اپنا نور رکھیو
مری بیتاب دھڑکن کی دعا ہے	یہ میری صائمہ ہے، صائمہ ہے

نون جاوید کی شخصیت اور شاعری کی ایک اہم بات یہ ہے کہ ان کا محبوب یا محبوبہ ان کی رفیقۂ حیات (ناہید زیبا) ہیں، جن کے لیے انھوں نے بہت سی خوب صورت اور دلکش نظمیں لکھی ہیں۔ پوری اُردو شاعری میں شاید ہی اس کی مثال مل سکے۔ نون جاوید کی یہ خصوصیت ان کے اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ فکر و نظر کی دلیل ہے۔ اپنی شادی کی بیسویں سالگرہ پر ایک نظم ”تجدیدِ آشنائی“ (۱۱ر مئی ۱۹۹۸ء) لکھی ہے۔ اس کے دو بند درج کیے جاتے ہیں:

عکسِ ناہید کہوں یا رُخِ زیبا جانوں
میرے محبوب تجھے تو ہی بتا کیا جانوں

عکسِ ناہید میں ناموس ہے رعنائی ہے
مشکِ بردوش دلآویز شناسائی ہے
دل کی دہلیز پہ بجتی ہوئی شہنائی ہے
میرے ہر درد کی رخشندہ مسیحائی ہے
اپنی تسکینِ نظر اپنا مسیحا جانوں
میرے محبوب تجھے تو ہی بتا کیا جانوں

سلسلہ پیار کا ہے جلوہ نما شام و سحر
دیکھ لی اپنی محبت بھری نظروں کا اثر
تیری آغوش میں ہیں شمس و قمر، لعل و گہر
تجھ سے منسوب مرے لختِ جگر، نورِ نظر
اپنی خلقت کا تجھے حُسن و کرشمہ جانوں
میرے محبوب تجھے تو ہی بتا کیا جانوں

''ساون رُت'' میں غزلوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ یہ غزلیں عموماً غزلِ مسلسل نظر آتی ہیں جن کے اشعار میں ایک ربط اور تسلسل ہے۔ دو غزلیں دیکھیے:

جہاں تم ہی نہیں جاناں وہ دنیا پھر حسیں کیوں ہو
وہاں پہ آسماں کیوں ہو وہاں پھر یہ زمیں کیوں ہو
تمھارا راستہ تو کہکشاں ہے آسمانوں کی
تمھارے ان حسیں قدموں کے نیچے یہ زمیں کیوں ہو
جہاں سے تم گزرتے ہو چمک اٹھتی ہے ہر اک شے
تمھیں بھی علم ہے اس کا کہ تم ماہ مبیں کیوں ہو

تمہاری مد بھری آنکھیں ہیں جب ہر دم تصور میں
تو ذکرِ انگبیں کیا ہے۔ یہ فکرِ عنبریں کیوں ہو

عشق جب کامیاب لگتا ہے
حسن محوِ حجاب لگتا ہے
تیری زلفیں سحاب لگتی ہیں
اور یہ لب شراب لگتا ہے
ہر تبسم تمہارے ہونٹوں کا
تازہ تازہ گلاب لگتا ہے
دیکھ کر آپ کا حسیں چہرہ
رشک میں ماہتاب لگتا ہے
شبنمی سی تمہاری آنکھوں پہ
شعر کہنا ثواب لگتا ہے
وہ مرے پاس جب نہیں ہوتا
سارا عالم خراب لگتا ہے
تیرا ہر شعر سچ کہوں جاوید
آپ اپنا جواب لگتا ہے

یہ عجیب اتفاق ہے کہ نون جاوید کا پورا گھرانا شاعر ہے۔ ان کے دادا حبیب النبی خاں صولت کلکتے کے مشہور و معروف شاعر تھے۔ ان کا شمار اساتذہ میں ہوتا تھا۔ ان کی دادی روشن اختر بیگم اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ایک اچھی شاعرہ تھیں۔ علامہ رضا علی وحشت کی وہ بہن تھیں۔ نون جاوید کے والد غلام محمد خاں بھی شاعر تھے اور حشمت تخلص کرتے تھے۔ لہٰذا جاوید صاحب نے نوجوانی ہی میں یہ شعر کہا:

صولت و وحشت سے ملتا ہے ہمارا سلسلہ
اے شفق ہے خانۂ وحشت کے ہیں بیخوار ہم

دوسری طرف جاوید صاحب کی اہلیہ ناہید زیبا بھی شاعرہ ہیں۔ ان کے سسر خواجہ ریاض الدین عطش بھی ایک ممتاز شاعر تھے جن کے دادا انجم دہلوی اُردو اور فارسی کے مشہور شاعر اور غالب کے نامور شاگرد تھے۔ جاوید صاحب کی دو بیٹیاں بھی شعر گوئی کا ذوق رکھتی ہیں۔

غالباً ۲۰۰۳ء میں جاوید صاحب مع اہل و عیال امریکہ (شکاگو) چلے گئے اور وہاں مستقل رہائش اختیار کر لی۔

ابنِ عظیم فاطمی

(طرحدار شاعر)

سوانحی خاکہ

نام: سید وقار عظیم فاطمی

قلمی نام: ابنِ عظیم فاطمی

والد کا نام: سید عبدالعظیم فاطمی (مرحوم)

تاریخ پیدائش: ۲۱ر ستمبر ۱۹۵۳ء (کاغذات میں ۲ر مارچ ۱۹۵۳ء)

تعلق: کوہبرہ ضلع گیا اور حضرت سائیں ضلع پٹنہ (بہار)

تعلیم: ایم۔ اے (معاشیات۔ پریویس)

پہلی ہجرت: سابق مشرقی پاکستان۔ چاٹگام۔ ۱۹۶۱ء

دوسری ہجرت: سقوطِ ڈھاکا کے بعد۔ کراچی

پیشہ: ملازمت

اولاد: دو بیٹے، دو بیٹیاں

ابنِ عظیم فاطمی ان شعرا میں ہیں جو دوسری ہجرت کے بعد کراچی آ کر بحیثیت شاعر معروف ہوئے۔ وہ قایدِ اعظم کالج، ڈھاکا کے مشہور و معروف اور صاحب علم و فضل پرنسپل عبدالرؤف

فاطمی کے بھتیجے ہیں۔ ان کا خاندان بہت بڑا اور بہار کے مختلف علاقوں میں پھیلا ہوا تھا۔ ان کے والد عبدالعظیم فاطمی کا ۱۹۵۵ء میں انتقال ہو گیا، اس وقت ابنِ عظیم فاطمی صرف دو سال کے تھے۔ ان کی والدہ اپنے میکے چلی گئیں۔ ابنِ عظیم فاطمی کی ابتدائی زندگی ننھیال میں بڑی مفلوک الحالی میں گزری۔ بچپن ہی میں اپنی والدہ اور گھر کے دوسرے لوگوں کے ساتھ مشرقی پاکستان آ گئے۔ ۱۹۶۱ء میں ان کی والدہ کا نکاحِ ثانی سید رکن الدین احمد سے مشرقی پاکستان میں ہوا۔ انھوں نے بڑی شفقت و محبت سے ابنِ عظیم کی پرورش و تربیت کی۔ ان تمام باتوں کا ذکر ابنِ عظیم نے اپنے مجموعہ ''سلگتی مسافتیں'' کے دیباچے میں بڑی تفصیل سے کیا ہے۔

ابنِ عظیم فاطمی کا بچپن اور نوجوانی کا زمانہ چاٹگام، بھیرب بازار اور سلہٹ میں گزرا۔ انھوں نے میٹرک کا امتحان بھیرب بازار سے پاس کیا۔ انٹر کا امتحان قائدِ اعظم کالج، ڈھاکا سے دیا۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد وہ اور ان کے گھر والے بڑی مصیبتوں میں گھر گئے۔ کسی طرح ڈھاکا پہنچے اور ۱۹۷۴ء میں کراچی آ گئے۔ یہاں ان کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔

ابنِ عظیم نے کراچی میں پہلے ملازمت حاصل کی۔ اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ دوبارہ جاری کیا۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے (معاشیات) پرائیویٹ امتحانات پاس کیے۔ ۱۹۸۶ء میں شادی ہوئی۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ سب اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ابنِ عظیم اپنی بیگم (عرفانہ وقار) کے سلیقۂ خانہ داری اور حُسنِ انتظام کے مداح ہیں۔ بیگم ایم۔ اے (اسلامیات) اور عالمہ ہیں۔ دونوں بیٹے حافظِ قرآن بھی ہیں۔

''سُلگتی مسافتیں''

ابنِ عظیم فاطمی کا مجموعۂ کلام (غزلوں کا مجموعہ) ''سلگتی مسافتیں'' ۲۰۰۶ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ ۱۹۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ۹۰ غزلیں ہیں۔ کتاب میں ڈاکٹر حنیف فوق کا مضمون اور شاعر کا ایک طویل دیباچہ ''کچھ اپنے بارے میں'' ہے۔

ابنِ عظیم کے کلام میں ایک خاص طرح داری اور بانکپن ہے۔ دوسری ہجرت کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر حنیف فوق لکھتے ہیں:

"جب میں 'سلگتی مسافتوں' کا مطالعہ کرتا ہوں تو اس میں ایک بے چین و مضطرب ذہن نظر آتا ہے جسے انھوں نے شعری قالب دیا ہے۔ ان کی شاعری میں ایک ایسی آن بان پائی جاتی ہے جو کم شاعروں کے یہاں ملتی ہے۔ ان کے متعدد اشعار اپنے تاثر کے سبب حیران کن ہیں.......... بحیثیت مجموعی ان کی شاعری ایسی نہیں کہ جسے آسانی سے نظر انداز کیا جا سکے۔ اس میں تغزل کے کئی پہلو نکلتے ہیں اور اس میں کلاسیکیت کے قرب نے ان کی شاعری کو خوش گوار بنا دیا ہے اور اسے ایک نیا ذائقہ دیا ہے۔"

غزل کے چند اشعار

لہو لہو ہے مری داستان کی صورت
سجے ہیں شہر کے مقتل دکان کی صورت

ہر ایک سمت ہی عالم ہے بے پناہی کا
کہیں نظر نہیں آتی امان کی صورت

اڑا کے موجِ ستم لے گئی مکینوں کو
بتا رہی ہے مجھے ہر مکان کی صورت

لگے ہوئے ہیں زبانوں پہ ظلم کے پہرے
نہیں ہے قصۂ غم کے بیان کی صورت

محبتوں کو خدا کے بندوں میں عام کرنا بھی بندگی ہے
اگر ہو توفیق لکھنے والو، محبتوں کی کتاب لکھنا

خدا کے بندوں سے پیار کرنا عظیم جن کی سرشت میں ہے
تم ایسے لوگوں کے نام اپنے تمام اجر و ثواب لکھنا

خزاں سے دور گلوں کی رفاقتوں میں جلا
عجیب شخص تھا خوشیوں کی ساعتوں میں جلا
سفر کی دھوپ رہی دور تک شریکِ سفر
رہِ وفا کی سنگتی مسافتوں میں جلا
اسے یہ ناز کہ وہ مجھ سے بے نیاز رہا
مجھے یہ فخر کہ میں اس کی چاہتوں میں جلا
کوئی سنے تو کہوں سوزِ عشق کی روداد
تمام عمر جدائی کی ساعتوں میں جلا
خلوص، خلق، محبت، وفا، کرم، ایثار
کسے بتاؤں کہ سب کچھ عداوتوں میں جلا

الجھ کر کاروبارِ تیرگی میں اندھیرا بیچتے ہو روشنی میں
مقدر میں لکھا ہے جن کے چلنا وہ دل جلتے ہیں ٹھنڈی چاندنی میں
محبت، آرزو، حسرت، جدائی سب ہی کچھ ہے وفا کی راگنی میں
نہیں فرصت جنھیں دنیا سے ان کو خدا یاد آئے شاید جاں کنی میں
ملا ہوں اس عظیمِ بے نوا سے انا زندہ ہے جس کی مفلسی میں

ابنِ عظیم فاطمی ایک اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ انھیں صحافت سے بھی دلچسپی ہے۔ انھوں نے کالم نگاری بھی کی ہے اور متعدد کتابوں پر تبصرے بھی لکھے ہیں۔ یاور امان کے ساتھ مل کر ایک خوب صورت کتاب ''جمیل عظیم آبادی۔ فن اور شخصیت'' مرتب کی جو ۲۰۰۹ء میں شائع ہوئی۔

❖❖

دیگر شعرا

مذکورہ بالا شعرا کے علاوہ بھی شاعروں کی ایک بڑی تعداد ہجرت کر کے کراچی اور پاکستان کے دوسرے شہروں میں پہنچی۔ ان میں بعض نے گوشہ نشینی اختیار کر لی، لیکن اکثر شعرا یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں شریک رہے اور ان کا کلام اخباروں اور رسالوں میں شائع بھی ہوتا رہا۔ چونکہ ان شعرا کا مجموعۂ کلام شائع نہ ہوا اس لیے ان کا تفصیلی تذکرہ نہ ہو سکا۔ ذیل میں ان شعرا کے نام درج کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر شعرا کا اجمالی ذکر "محفل جو اجڑ گئی" میں کیا جا چکا ہے۔ ان میں زیادہ تر دنیا سے گزر گئے اور کچھ ہمارے درمیان موجود ہیں۔

مرحومین:

عارفؔ ہوشیار پوری۔ یوسف قدیری۔ سید حسن رضا دائروی۔ اختر آصفی پشاوری۔ مسعود کلیم۔ بشیر ملاٹھوی۔ اصغر گورکھپوری۔ رضی شرفی۔ عمران فرحت۔ یوسف علی لائقؔ۔ منور فیضی۔ جبار لطیفی۔ مشتاق شبنم۔ ہلال جعفری۔ یوسف برہم پوری۔ شمیم کاشفی۔ ہاشم آصفی۔ شاد آصفی۔ محبوب شیدائی۔ اشتیاق احمد شوق۔ عیش برنی۔ نیر نانپاروی۔ صلاح الدین محمد۔ واحد خیری۔ قاسم مونس۔ یٰسین فرط۔ شریرؔ جعفری۔ ظہیر الدین ناصر۔ صغیر بنارسی۔ سید شمیم احمد۔ رضا ابن آصف۔ جلیل عشرت۔ حصیر نوری۔

باحیات شعرا:

احمد سعید فیض آبادی۔ فرقان ادریسی۔ عبدالحمید ساقی۔ افضال احمد سید۔ نعیم بازید پوری

سیّدہ شمیم۔ ڈاکٹر محمد رشید۔ فہیم احمد تہی۔ زاہد مظفر پوری۔ رفیع احمد رفیع۔ جمیل شاکری۔
شکیل یوسف۔ عبیداللہ ساگر۔ نورالدین موج۔ حبیب سحر وغیرہ۔

سیّد رشید احمد رشید

سیّد رشید احمد رشید مرحوم (فرزند علامہ ناطق لکھنوی) کا مجموعۂ کلام "رگِ سنگ" ۱۹۹۷ء میں نواب شاہ (سندھ) سے شائع ہوا لیکن مجھے دستیاب نہ ہو سکا۔ رشید احمد کا تعلق وکالت کے پیشے سے تھا۔ متروکہ املاک کے صلے میں انھیں نواب شاہ میں جائیداد ملی تھی لہٰذا وہ سقوطِ مشرقی پاکستان سے بہت پہلے چاٹگام سے نواب شاہ منتقل ہو گئے تھے۔ ان کی شعر و شاعری اور وکالت یہاں بھی جاری رہی لیکن وہ یہاں آ کر کچھ گمنام سے ہو گئے تھے۔

جن شعرا کے نمونۂ کلام دستیاب ہوئے ہیں، ان کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے۔

عمران فرحت

محمد شریف نام اور عمران فرحت قلمی نام ہے۔ جائے پیدائش کھڑ کپور (مغربی بنگال) ہے۔ تقسیم کے بعد سید پور (مشرقی پاکستان) آئے، وہیں ان کا مستقل قیام رہا۔ تعلیم معمولی تھی۔ کاروبار کرتے تھے۔

عمران فرحت نے ۵۹۔۱۹۵۸ء سے شعر گوئی کا آغاز کیا اور مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ ان کی غزلیں بھی مختلف رسالوں میں شائع ہوتی رہیں۔

سقوطِ ڈھاکا کے بعد کراچی آ گئے۔ ان کا قیام اورنگی میں تھا۔

عمران فرحت بڑے اچھے غزل گو تھے۔ ان کے کلام میں ایک خاص انفرادیت تھی۔ ان کے اشعار بڑے تہہ دار ہوتے تھے۔ انداز بیاں میں بڑی جدت، ندرت اور دلکشی تھی۔ انھیں زبان و بیان پر عبور حاصل تھا۔

چند سال قبل ان کی وفات ہو گئی۔ اللہ مغفرت فرمائے!

نمونۂ کلام:

تری زبان کا خنجر لہو اچھال گیا
یہ میرا ظرف کہ میں مسکرا کے ٹال گیا
گلوں کا ذکر چھڑا مجھ کو زخم یاد آئے
کہاں کی بات تھی لیکن کہاں خیال گیا

☆☆☆☆☆

پھولوں سے مہکتے ہوئے داغوں کو نہ دیکھو
اس فصلِ قبا چاک میں باغوں کو نہ دیکھو
یہ دیکھو کہ بے رنگ ہے ساقی کی نظر بھی
اے تشنہ لبو، خالی ایاغوں کو نہ دیکھو
جلتا ہے یہاں دل کا لہو درد کی لو میں
پلکوں پہ جو روشن ہیں چراغوں کو نہ دیکھو
آئیں گے بہت کشتۂ غزالانِ ختن یاد
بہتر ہے کہ تم نافہ دماغوں کو نہ دیکھو
جینا ہے تو اس غم کی کڑی دھوپ میں فرحت
لمحاتِ گزشتہ کے فراغوں کو نہ دیکھو

☆☆☆☆☆

کس موڑ پہ لے آئی احساس کی محرومی
جو شکل نظر آئی غمگین نظر آئی
گفتار سے اندازہ کچھ ہو نہ سکا لیکن
کردار میں الفت کی تلقین نظر آئی

ہم نے تو بہت ڈھونڈا، پایا نہ سراغ اب تک
کس دل کو یہاں فرحتؔ تسکین نظر آئی

☆☆☆☆☆

دل کا غبار آنکھ کے پانی سے دھو لیا
کچھ دیر اداس شام کے سائے میں رو لیا
ہیں کتنے سادہ لوح کہ پھولوں کی چاہ میں
کانٹوں کا اپنے ہاتھ میں نشتر چبھو لیا
اس میں بھی ایک پہلو کسی کی خوشی کا ہے
فرحتؔ جو دل میں درد جہاں کا سمو لیا

☆☆☆☆☆

جو بدگمانی ہی ٹھہری خلوص کی قیمت
غبارِ خاطرِ احباب صاف کیا کرتے
جب ہم نے خود ہی ستم گر بنا دیا تم کو
گلہ کسی سے تمہارے خلاف کیا کرتے

☆☆☆☆☆

دور سے دیکھا تو احساس ہوا شعلوں کا
موسمِ گل ہے یا جلتی ہوئی پھلواری ہے
آج بھی تیشۂ فرہاد ہے سرگرمِ عمل
آج بھی سنگ کے سینے سے لہو جاری ہے

☆☆☆☆☆

صدمے بہت اٹھائے ہیں دل نے خلوص کے
اب مجھ کو یاد پیار کا کوئی سبق نہیں

تھا دشتِ طلب اور قیامت کی گھڑی تھی
ہم آبلہ پاؤں کے لیے دھوپ کڑی تھی
اک عمر رہی پھولوں سے بیگانہ چمن میں
خوشبو تری زلفوں کی صبا لے کے اُڑی تھی
میں جی نہ سکا پیکرِ تسلیم کی صورت
ورنہ مجھے جینے کی تمنا تو بڑی تھی

☆☆☆☆☆

کہاں کی نظم، کہاں کی غزل سرائی ہے
اب ان کی بزم میں اک جرم لب کشائی ہے
کوئی تو رات کی آغوش میں رہا بے خواب
کسی کو دن کے اُجالے میں نیند آئی ہے
دیارِ شوقؔ میں فرحتؔ یہ کس کی آمد ہے
تمام راہ گزر نور میں نہائی ہے

عارفؔ ہوشیار پوری

سید محمد عبدالقیوم نام اور عارفؔ ہوشیار پوری قلمی نام تھا۔ ۱۹۱۷ء میں ہوشیار پور (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں کلکتہ آگئے۔ زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ کتابت اور صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ ۱۹۵۰ء میں ڈھاکا آگئے۔

عارف صاحب اشتراکی تحریک کے حامی تھے اور نوجوانی میں کمیونسٹ پارٹی کے کارکن رہ چکے تھے۔ ان کی شاعری ترقی پسند نظریات کی ترجمان تھی۔ بڑے بااخلاق اور مہذب آدمی تھے۔

سقوطِ ڈھاکا کے بعد کراچی آگئے۔ ۱۱ر اکتوبر ۱۹۸۱ء کو یہیں ان کی وفات ہوئی۔ اللہ

مغفرت فرمائے۔ مرحوم نے تین بیٹے اور ایک بیٹی یادگار چھوڑی۔

نمونۂ کلام:

غزل

حلقۂ جبر و تشدد میں وطن آج بھی ہے
زندگی جلوہ گہِ دار و رسن آج بھی ہے
ہم نوا! آج بھی ہر گام پہ ہیں دام بچھے
یعنی صیاد کے پنجے میں چمن آج بھی ہے
جس نے کل گردنِ فن کار کو جھکنے نہ دیا
تیغ کی چھاؤں میں وہ تابِ سخن آج بھی ہے
ظلمتِ شب کو کچلنے کے لیے دل میں مرے
اک ابھرتے ہوئے سورج کی کرن آج بھی ہے
تجربوں سے شبِ ماضی کے سبق لو عارفؔ
شاہدِ صبحِ طرب جلوہ فگن آج بھی ہے

رباعیات

بے بات کا افسانہ کہا جاتا ہے
بے عقل کو فرزانہ کہا جاتا ہے
اپنوں کی طرح کام جو آئے عارفؔ
اس شخص کو بیگانہ کہا جاتا ہے

تکمیلِ مظالم بہر عنواں کر لو
مجبوروں کو کچھ اور پریشاں کر لو
بیداری کی لہریں ہیں اب اٹھنے والی
تم اپنی حفاظت کا بھی ساماں کر لو

رونے سے بڑھا کرتی ہے مشکل یارو
رونے کا تو کچھ بھی نہیں حاصل یارو
تم عزم سفر پختہ کرو تو پہلے
پاؤ گے ہر اک گام پہ منزل یارو

رضی شرفی

سید رضی شرفی نام اور رضی شرفی قلمی نام تھا۔ ۱۳ر جنوری ۱۹۳۷ء کو بہار شریف (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ وہیں سے میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۵۲ء میں ڈھاکا آ گئے۔ ڈھاکا سے انٹرمیڈیٹ کیا۔ ایک عرصے تک واپڈا میں ملازم رہے۔

سقوطِ ڈھاکا کے بعد کراچی آ گئے۔ کراچی آ کر 'معیشت کی مشقت' اتنی بڑھی کہ 'مشقِ سخن' کا موقع نہ رہا۔ ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد مختلف عوارض میں مبتلا ہو گئے۔ ۱۹ر فروری ۲۰۰۳ء کو کراچی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ قیام شرف آباد میں تھا۔ اللہ مغفرت فرمائے! متعدد بیٹے اور بیٹیاں یادگار چھوڑیں۔

رضی شرفی مرحوم میرے دوستوں میں تھے۔ بڑے با اخلاق، با مروت اور دوست نواز انسان تھے۔ شعر گوئی کی بڑی اچھی صلاحیت رکھتے تھے۔ نظم بھی کہتے تھے اور غزل بھی۔ لیکن طبیعت کا رجحان زیادہ تر غزل کی طرف تھا۔ رضی شرفی ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ انھیں شخصیت نگاری سے خاص شغف تھا۔

نمونۂ کلام:

شہرِ ہوس میں گرمیٔ بازار دیکھیے — دل دادگانِ حسنِ طرحدار دیکھیے

آشفتگیٔ شوق کا اظہار دیکھیے — پہنچا کہاں پہ آج وہ دلدار دیکھیے

خنجر بدست لشکرِ جرار دیکھیے — اور ٹھوکروں میں جبہ و دستار دیکھیے

اب اور کوئی صاحبِ کردار دیکھیے — بھٹکا کہاں پہ قافلہ سالار دیکھیے

دستورِ زرگری کا یہ معیار دیکھیے — مجرم ہے کون، کون ہے سردار دیکھیے

اپنی ہی شکل دیکھنا گر چاہتے ہیں آپ — ہر روز اٹھ کے صبح کا اخبار دیکھیے

تشنہ لبی کا ذکر نہ اب چھیڑیے رضی — پیرِ مغاں کا حکم ہے سرکار دیکھیے

خنجر بکف کوئی ہے، کوئی مارِ آستیں
ایسے میں کس کو دوست کہیں اور کسے عدو
گر نظمِ میکدہ نہیں بدلا تو ساقیا!
میخوار چھین لیں گے ترے ہاتھ سے سبو
یوں تو وہ میرے پاس سے گزرا ہے بارہا
حسرت رہی کہ کرتے کبھی اس سے گفتگو
جرأت تو دیکھیے پئے اظہارِ حرفِ حق
کھا کھا کے زخم ہم نے لہو سے کیا وضو

☆☆☆☆☆

تو کھو گیا کہاں، مجھے آواز اب تو دے
تیری طلب میں تیرا رضی نیم جاں ہوا

☆☆☆☆☆

کیا سوچتے ہو خضر! بہت آبلہ پا ہوں
منزل کا پتا ہے تو بتا کیوں نہیں دیتے

☆☆☆☆☆

پھر تہمتوں کے سنگ کی بارش ہے آج شب
کردار ہو نہ زیر و زبر جاگتے رہو
سوئے جہاں کہ درد دبے پاؤں آ گیا
خطرے میں پھر ہے سارا نگر جاگتے رہو

☆☆☆☆☆

ایک ہی طرز پہ اے سوچنے والو دیکھو
آج ہیں فکر و نظر کے نئے انداز بہت

کر سکے وہ بھی علاجِ غمِ انساں نہ رضیؔ
جن کو آتے تھے مسیحائی کے انداز بہت

☆☆☆☆☆

ناحق خزاں کا نام ہے بدنام دوستو!
ہم کو تو فصلِ گل میں بھی زخمِ نہاں ملے

☆☆☆☆☆

چھوڑو تقلید کی بوسیدہ روش پہ چلنا
کرو تخلیق نیا نغمہ، نیا ساز کوئی

☆☆☆☆☆

نسیمِ صبح کا احسان ہے یہ دوستو ورنہ
چمن کے سارے گل زنداں کو مہکانے کہاں جاتے

زاہد مظفر پوری

سید شاہ زاہد حسن حیدری نام اور زاہد مظفر پوری قلمی نام ہے۔ ۱۳؍مارچ ۱۹۳۵ء کو مظفر پور (بہار) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں حصولِ تعلیم کے لیے لال منیر ہاٹ (مشرقی پاکستان) آئے۔ "لال منیر ہاٹ اسکول" میں داخلہ لیا جہاں ان کے ماموں مرتضیٰ سائنس ٹیچر تھے۔ وہ بھی شاعر تھے۔ مشرقی پاکستان کے معروف شاعر رئیس ہاشمی اسکول میں ان سے ایک سال سینئر تھے اور ان کے دوستوں میں تھے۔ اس شاعرانہ ماحول میں زاہد بھی شعر و شاعری کی طرف مائل ہو گئے۔ ۱۹۴۹ء میں پہلی غزل کہی۔ کئی سال تک اس اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد میٹرک کا امتحان دیے بغیر وطن واپس لوٹ گئے۔ وہاں بھی شعر و شاعری کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۶۴ء میں مستقل طور پر ڈھاکا آ گئے۔ ۱۹۶۵ء میں شاعری ترک کر دی۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد ۱۹۷۲ء میں دوبارہ شعر گوئی کا آغاز کیا اور حافظ دہلوی کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے۔ ("نجم و شرر" سے ماخوذ)

سقوطِ ڈھاکا کے بعد زاہد صاحب کراچی آ گئے۔ وہ سند یافتہ ہومیو پیتھی ڈاکٹر ہیں۔ ایک عرصے سے ان کا قیام اورنگی میں ہے۔ ان کا مطب بھی وہیں ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک وہ ایک اسکول میں معلم بھی تھے۔ ۲۰۰۰ء میں انھوں نے اپنی غزلوں کا مجموعہ "خزاں کا زخم" کے نام سے مرتب کیا تھا اور اس پر مجھ سے دیباچہ بھی لکھوایا تھا۔ لیکن اب تک اس مجموعے کی اشاعت کی نوبت نہ آئی۔

زاہد صاحب ایک اچھے اور منفرد غزل گو ہیں۔ ان کی غزلیں رسالوں میں بھی شائع ہوتی رہی ہیں۔ انھیں مشاعروں سے بھی بڑی دلچسپی ہے۔ چند اشعار نمونتاً پیش کیے جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں المیۂ سقوطِ ڈھاکا کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔

جانے کس کی مرے دل کو ہے جستجو
میں جو پھرتا رہا در بدر کو بہ کو

اس کو کہتے ہیں قسمت کی محرومیاں
تشنہ لب میں رہا بر سرِ آبِ جُو

غم کدے میں اداسی برستی رہی
میکدے میں تو برپا رہا ہاؤ ہُو

آپ کا حُسن پھر سے نکھرنے لگا
آئینہ کیجیے تو ذرا رو برو

حادثوں سے انھیں خوف آتا نہیں
حادثوں سے جو ہوتے رہے دو بدو

☆☆☆☆☆

میں تو استادہ رہا کوہِ گراں کی صورت
کتنے طوفان مری ذات کے اندر ابھرے

سینۂ سنگ ست پھوٹے تو ہیں چشمے لیکن
بات تو جب ہے کہ صحرا سے سمندر ابھرے

میں کڑی دھوپ میں صدیوں سے کھڑا ہوں زاہد
کوئی سایہ تو مرے قد کے برابر ابھرے

☆☆☆☆☆

سنگ ریزے بھی تو آئینہ صفت ہوتے ہیں
اپنے پندار نظر کو تو بدل کر دیکھو

☆☆☆☆☆

حرف حق ہم ادا کس زباں سے کریں
کاٹ ڈالی گئی ہے زباں شہر میں
قہقہے کل جہاں سے ابلتے رہے
اٹھ رہی ہیں وہاں سسکیاں شہر میں
پھول مرجھائے پامال کلیاں ہوئیں
کیسی صر صر چلی ناگہاں شہر میں
چہرے بے نور آنکھیں بھی پتھرا گئیں
چار سو موت کا ہے سماں شہر میں
رقص ابلیس کا روز ہوتا رہا
روز مرتے رہے ہم یہاں شہر میں

☆☆☆☆☆

کسی کے لب نہ ہلے، کوئی آنکھ نم نہ ہوئی
مرے جنوں کی حکایت تمام ہوتی رہی

۲۷ ردسمبر ۲۰۱۱ء کو اورنگی میں زاہد مظفر پوری کا انتقال ہو گیا۔ اللہ مغفرت فرمائے۔

کلیم رحمانی

کلیم ظفر رحمانی نام اور قلمی نام کلیم رحمانی تھا۔ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۴۲ء کو گیا (بہار) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عظیم الدین رحمانی ریلوے میں ملازم تھے۔ ان کے ساتھ ہی ۱۹۴۷ء میں مشرقی پاکستان آئے۔ ایک عرصے تک میمن سنگھ میں قیام رہا۔ ان کے والد کا تبادلہ جب ڈھاکے میں ہوا تو وہ بھی ڈھاکا چلے آئے۔ ۱۹۶۳ء میں قائدِ اعظم کالج ڈھاکا سے بی۔ اے کیا۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد ۱۹۷۲ء سے شعر گوئی کا آغاز کیا اور حافظ دہلوی کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔

سقوطِ ڈھاکا کے بعد کہی ہوئی غزلوں سے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں جن میں اس المیہ کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔

انسان کیا ہے وقت کا مارا ہے آج کل
فاقوں پہ لمحہ لمحہ گزارا ہے آج کل
سینچی ہے اپنے خون سے جس کی روش روش
کیسے کہیں وہ باغ ہمارا ہے آج کل
اے کاش آئے منزلِ جاں بخش کا پیام
یہ خواب زندگی کا سہارا ہے آج کل

☆☆☆☆☆

پنپ رہا ہے یہاں انتشار کا موسم
قرار پائے گا کیا، بے قرار کا موسم
بڑے شباب پہ ہے طوق و دار کا موسم
اسیرِ دام ابھی ہے بہار کا موسم

☆☆☆☆☆

دنیا کے ہر اک فرد سے ہے درد کا رشتہ
روتا ہوں اہو میں کوئی ہوتا ہے جو بے گھر

مرا وجود بکھرنے لگا بکھرنے دو
اسی بہانے ذرا زندگی سنورنے دو
جلیں گی شہر جفا میں وفا کی قندیلیں
مرے خیال کی لَو کو ذرا ابھرنے دو

☆☆☆☆☆

کوئی بھی دے نہ سکا میرے ہنر کی قیمت
لوگ ٹھہرا نہ سکے خونِ جگر کی قیمت
کل مری آبلہ پائی تھی مسافت کا صلہ
آج منزل بھی نہیں میرے سفر کی قیمت
آپ کے عارض و لب کی ہے بڑی بات مگر
دونوں عالم بھی نہیں میری نظر کی قیمت
سیم و زر سے تو نہ پائے گا خریدار کلیم
بس محبت ہی محبت ہے بشر کی قیمت

کراچی آنے کے بعد کلیم رحمانی نے شاعری تقریباً ترک کر دی اور نثر نگاری کی طرف مائل ہو گئے۔ انھوں نے بہت سے تنقیدی مضامین اور تبصرے لکھے۔ ماہنامہ "مصریر" کراچی (مدیر: ڈاکٹر فہیم اعظمی مرحوم) کے ایک عرصہ تک نائب مدیر رہے۔ وہ نجی طور پر کتابوں کی طباعت واشاعت کا کام بھی کرتے رہے۔

چند سال قبل کلیم رحمانی کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔ اللہ مغفرت فرمائے!

فرقان ادریسی

محمد فرقان ملک نام اور فرقان ادریسی قلمی نام ہے۔ ۸/اگست ۱۹۴۳ء کو گیا (بہار) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حافظ محمد ادریس ہما بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ ۱/ ستمبر ۱۹۴۷ء کو مشرقی

پاکستان آئے۔ ۱۹۶۶ء میں ڈھاکا یونیورسٹی سے بی۔اے پاس کیا۔ ۱۹۵۷ء سے ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔

فرقان ادریسی نے مشرقی پاکستان کی ادبی سرگرمیوں میں نمایاں حصّہ لیا۔ مشاعروں سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ ان کی غزلیں مختلف رسالوں میں بھی شائع ہوتی رہیں۔ ملازمت اور درس و تدریس سے تعلق رہا۔

سقوطِ ڈھاکا کے بعد کراچی آگئے۔ یہاں بھی شعروشاعری کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ بڑے مہذب، خلیق اور ہمدرد انسان ہیں۔ میرے دوستوں میں ہیں۔ وہ اچھے انسان بھی ہیں اور اچھے شاعر بھی۔ غزلوں اور نعتوں کے دو مجموعے مرتب کرلیے ہیں۔

نمونہ کلام:

محبت دل میں اک برقِ تپاں معلوم ہوتی ہے
مگر تسکینِ دل، تسکینِ جاں معلوم ہوتی ہے
نہ جانے کس مقامِ گم شدہ پر آگئی دنیا
حقیقت وہم کی پرچھائیاں معلوم ہوتی ہے

اتنی بھی اب آشنائی ہے بہت
مل گئے صاحب سلامت ہو گئی

حسن گل میں کہ خار میں دیکھا
رنگ و بو کے حصار میں دیکھا
وقت ہو، دل ہو، یا مقدر ہو
کچھ نہیں اختیار میں دیکھا

☆☆☆☆☆

وحشتِ دل کی کرامت دیکھ لی
محسن کی چشمِ عنایت دیکھ لی

محفلِ ہستی میں رہ کر چند روز
آدمی کی آدمیت دیکھ لی
ان گنت چہرے نظر میں آ گئے
میں نے جب بھی کوئی میت دیکھ لی
راحتِ قلب و نظر سے بھی گئے
دورِ حاضر کی محبت دیکھ لی
دل کی حالت کو سمجھنے کے لیے
آئینے میں اپنی صورت دیکھ لی
مضطرب فرقاںؔ بھی رہنے لگے
شہرِ نور افشاں میں ظلمت دیکھ لی

نعتیہ اشعار:

نسبتِ عظمیٰ کے صدقے رب نے بخشا ہے مجھے
علم، حکمت، آدمیت جیسی نعمت بے حساب

☆☆☆☆☆

وہ حلقۂ توصیف میں کیا آئے کسی کے
فرقاںؔ بہر رنگ جو قرآنِ مبیں ہو

☆☆☆☆☆

آپ کو جس نے بھی دیکھا ہو گیا وہ آپ کا
مرحبا آئینہ پیکر ہیں محمد مصطفیٰ

☆☆☆☆☆

آپ کے نقشِ قدم ہیں جب نظر کے روبرو
میں کروں کیوں پھر کسی بھی راہبر کی جستجو

احمد سعید فیض آبادی

احمد سعید خاں نام اور احمد سعید فیض آبادی قلمی نام ہے۔ والد کا نام محمد باقر خاں مرحوم۔ ۲۰ جنوری ۱۹۵۰ء کو فیض آباد (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ والدین کے ساتھ ڈھاکا آئے۔ تعلیم و تربیت وہیں ہوئی۔ میٹرک اور انٹر کے امتحانات پاس کیے۔ بہت کم عمری ہی میں شعر کہنے لگے۔ پروفیسر اظہر قادری سے اصلاح لیتے تھے۔

احمد سعید فیض آبادی ڈھاکا کے ابھرتے ہوئے نوجوان شاعروں میں تھے۔ ان کے کلام میں ایک خاص انفرادیت تھی۔ مشاعروں میں اپنا کلام ترنم سے سناتے تھے۔ آواز میں بڑا سوز تھا۔

سقوطِ ڈھاکا کے بعد کراچی آ گئے۔ یہاں سے بی۔ اے کیا اور پاکستان پوسٹل سروس سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں بھی ادبی سرگرمیاں جاری رہیں۔ ۲۰۱۰ء میں ملازمت سے ریٹائر ہو گئے۔ ایک عرصہ قبل اپنا کلام مرتب کر لیا تھا لیکن اب تک اشاعت کی نوبت نہ آئی۔

نمونۂ کلام:

شہر در شہر یہ کیسی ستم آرائی ہے
اب نہ وہ گرمیِ بازار نہ رعنائی ہے

دامنِ دل سے نہ پھر حدِ نظر تک پہنچے
آگ نفرت کی یہ کن لوگوں نے بھڑکائی ہے

شہر در شہر وہی نقلِ مکانی کا عذاب
جیسے پھر دکھ بھری ہجرت کی گھڑی آئی ہے

اب مری بستی پہ شب خون نہ مارا جائے
اب یہاں کون اجالوں کا تمنائی ہے

ہجرتوں کی یہ عجب رت ہے بدلتی ہی نہیں
پھر وہی در بدری، بے گھری رسوائی ہے

اہلِ حق آج بھی ہیں کرب و بلا میں احمد
شامِ غم ہے وہی، ڈستی ہوئی تنہائی ہے

☆☆☆☆☆

عجیب دھند ہے، منزل نہ راستہ کوئی
سفر سے پہلے تو ایسی نہ تھی فضا کوئی

نہ جانے کون سی رت میں کیا تھا عزمِ سفر
شکستہ دل ہوا کوئی، شکستہ پا کوئی

تمام شہر میں جو بھی ملا، ملا رسوا
میں کیسے ٹوٹ گیا۔ کیسے جانتا کوئی

بدلتی رُت میں ہر اک شے بدل ہی جاتی ہے
یہ سوچ کر نہ کسی سے گلہ کیا کوئی

تجھے خبر تو ہوئی ہوگی تیری چاہت میں
نہ کچھ کہا نہ سنا اور جل بجھا کوئی

ہر ایک لمحہ ہے احمد عذابِ جسم و جاں
اُتار دے مری ہستی سے یہ قبا کوئی

سیّد افضال احمد

سیّد افضال احمد ڈھاکا کے نوجوان شاعروں میں تھے۔ ان کی پیدائش ۱۹۴۶ء میں غازی پور (یوپی) میں ہوئی۔ ۱۹۴۷ء میں والدین کے ساتھ ڈھاکا آئے۔ وہیں تعلیم و تربیت ہوئی۔ ۱۹۶۶ء میں زرعی سائنس میں گریجویشن کیا۔ محکمہ تحفظ، نباتات سے ماہر حشرات الارض کی حیثیت سے منسلک تھے۔

سقوطِ ڈھاکا کے بعد کراچی آئے۔ یہاں بھی ادبی سرگرمیاں جاری رہیں۔ یہاں بھی

ان کی نظمیں اور غزلیں رسالوں میں شائع ہوتی رہیں۔ اب وہ افضال احمد سید کے نام سے لکھتے ہیں۔

نمونہ کلام:

شاخِ صلیبِ ستم (نظم)

سبز جب تک ہے شاخِ صلیبِ ستم
کوئی غنچہ نہ چٹکے گا گلزار میں
کوئی نغمہ نہ مچلے گا ہونٹوں پہ اب
اس سوادِ شبِ مرگ آثار میں
خار ہی خار نغمہ سرا ہونٹ پر
ریگ ہی ریگ چشمِ گہر بار میں
سبز جب تک ہے شاخِ صلیبِ ستم

غزل کے اشعار:

ثبوت کیا ہے طلوعِ سحر کا اہلِ چمن
کوئی کرن بھی تو چاکِ درِ قفس میں نہیں

☆☆☆☆☆

تذکرہ حسن کا کب موجِ حوادث سے رکا
ذکر کس دن لب و عارض کا سرِ دار نہیں

لوگ بربادیٔ محبت میں
اب ہماری مثال دیتے ہیں

حیات جبرِ مشقت کا شاہکار سہی
ہم اہلِ درد کو جینا تو لامحالہ ہے

☆☆☆☆☆

اہلِ رسن کے سر پہ صلیبوں کے سائے تھے
جب دھوپ شہرِ غم میں بہت تیز ہو گئی

☆☆☆☆☆

امیدِ ابرِ کرم سے لہو کی بارش تک
غموں کی دھوپ تھی اور تر بتر گئے ہیں لوگ

فہیم احمد فہمی

فہیم احمد فہمی ۱۹۳۶ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ ۱۹۶۴ء میں ڈھاکا آئے۔ ان کی نظمیں اور غزلیں رسالوں میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ انھوں نے ڈھاکا کی ادبی سرگرمیوں میں بھرپور حصّہ لیا۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد کراچی آگئے۔ قیام اورنگی میں ہے۔ شعر و شاعری کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ جدید انداز میں شعر کہتے ہیں۔ دو غزلیں بطور نمونہ درج کی جاتی ہیں۔

جب گھٹا کے پڑاؤ بولتے ہیں
میرے اندر کے گھاؤ بولتے ہیں

قافلہ جا چکا ہے، جنگل میں
ہر سو بجھتے الاؤ بولتے ہیں

بات کوئی ضرور ہے دل میں
آپ کے رکھ رکھاؤ بولتے ہیں

ابتدائے سفر میں ہر لحظہ
را ۔۔ لوٹ جاؤ بولتے ہیں

رہن رکھنا پڑے گا خود کو بھی
دال چاول کے بھاؤ بولتے ہیں
ہم تو آزاد نام کے بھی نہیں
فیصلوں میں دباؤ بولتے ہیں
خود بھلاتے نہیں مگر تجھی
ہم سے ہی بھول جاؤ بولتے ہیں

☆☆☆☆☆

گھر میں ہونا کسی دریچے کا
یہ وسیلہ ہے زندہ رہنے کا
بوجھ خود ہی اٹھانا پڑتا ہے
ہر مسافر کو اپنے رستے کا
زندگی کی نوید دیتا ہے
اس زمیں پر وجود بچے کا
جانے کس وقت کب بدل جاؤں
ایک کردار ہوں میں قصے کا
اب تو دوبارہ سیکھنا ہوگا
آدمی کو سلیقہ جینے کا
کتنے موسم کو جھیل کر تجھی
ڈھنگ آیا ہے مجھ کو جینے کا

شمیم کاشفی

محمد شمیم احمد نام اور شمیم کاشفی قلمی نام تھا۔ ۸/اگست ۱۹۳۶ء کو مدھوپور، ڈمکا (بہار) میں پیدا

ہوئے۔ تعلیم انٹرتک حاصل کی۔ ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۵۹ء سے ہوا۔ پہلے افسانہ لکھتے رہے جو مختلف جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ ۱۹۶۱ء سے شعر گوئی کا آغاز کیا۔ ارشاد کاشف صاحب کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ ۱۹۶۷ء میں سانتاہار (مشرقی پاکستان) آئے۔ ۱۹۶۹ء میں عاطف بنارسی کی نگرانی میں سانتاہار سے ایک ماہنامہ "دستک" جاری کیا۔ سانتاہار کی تباہی (قتلِ عام) کے بعد سانتاہار کے شعراو ادبا سے متعلق ایک کتاب "یادِ رفتگاں" شائع کی۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد کراچی چلے آئے۔

کراچی میں بھی شعر و شاعری اور مضمون نگاری کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۰ر ستمبر ۱۹۹۵ء کو کراچی میں ان کی وفات ہوگئی۔ اللہ مغفرت فرمائے!

چند اشعار نمونتاً پیش کیے جاتے ہیں:

ساقی مجھے پسند ہے کیوں تیری بندگی
یہ میکدے کا راز ہے اس کو نہ فاش کر
لالہ رُخوں کی صحبتیں پھر ہاتھ آگئیں
لِلّٰہ پہلے کاشفی فکرِ معاش کر

☆☆☆☆☆

رکھا تھا میں نے جس کو چھپا کر نگاہ میں
کانٹے بچھا رہا ہے وہی میری راہ میں
اے انقلاب تیری نوازش کا شکریہ
مر مر کے جی رہا ہوں میں شہرِ تباہ میں
اے کاشفی یہ نعمتِ پروردگار ہے
کیوں ڈال دی ہے زندگی بحرِ گناہ میں

☆☆☆☆☆

جب نظر پڑتی ہے میری صبح کی تنویر پر
ناز کرتا ہوں قفس میں کاتبِ تقدیر پر

حصیر نوری

نام محمد حصیر خاں اور قلمی نام حصیر نوری ہے۔ ۹ر اکتوبر ۱۹۳۶ء کو شاہ آباد (بہار) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نورالہدیٰ خاں مرحوم ریلوے میں ملازم تھے۔ لہٰذا حصیر خاں بھی اپنے والدین کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں ایشرڈی (مشرقی پاکستان) آ گئے۔ چند سال کے بعد ان کے والد کا تبادلہ میمن سنگھ ہو گیا۔ حصیر نوری نے غالباً یہیں سے میٹرک پاس کیا۔ اپریل ۱۹۷۱ء میں ان کے بڑے بھائی شہید کر دیے گئے۔ وہ اپنے گھر والوں کو لے کر بڑی مشکلوں سے ڈھاکا پہنچے۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد وہ محمد پور کے جنیوا کیمپ سے منسلک ہو گئے۔ شعر و شاعری میمن سنگھ کے قیام کے زمانے ہی سے شروع کر دی تھی۔ ڈھاکا آنے کے بعد حافظ دہلوی کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے۔ جنیوا کیمپ سے ایک قلمی رسالہ "تماشہ" جاری کیا۔ چند سال کے بعد کراچی آ گئے۔

کراچی میں حصیر نوری کی شاعری کا سلسلہ جاری رہا۔ ہر ماہ ان کی غزلیں متعدد رسالوں میں شائع ہوتی رہیں۔ وہ ایک پُرگو اور زود گو شاعر تھے۔ بے شمار غزلیں کہیں لیکن کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔

۲۰۱۰ء میں حصیر نوری کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔ اللہ مغفرت فرمائے۔ قیام لانڈھی میں تھا۔ غالباً کثیر الاولاد تھے۔ ذیل میں دو غزلیں نمونتاً درج کی جاتی ہیں:

راہ میں خون کے بوندوں کے نشاں ملتے ہیں
دن کے بے رنگ اُجالوں میں دھواں ملتے ہیں
یوں تو ہمراہ مرے دھوپ کی تلخی ہے مگر
دشتِ پُرخار میں کچھ پھول جواں ملتے ہیں
دیکھتے ہیں میرے اپنے بھی مجھے حیرت سے
سخت حالات میں ہمدرد کہاں ملتے ہیں

خشک جب ہو گئے آنسو تو یہ احساس ہوا
مختلف شکل میں اب لوگ یہاں ملتے ہیں
ٹوٹنے اور بکھرنے کا عمل جاری ہے
لے چلو مجھ کو وہاں لوگ جہاں ملتے ہیں

☆☆☆☆☆

عرصۂ پیار میں خوابِ تمنا، ہم نہیں
تم سمجھتے ہو جسے آئینہ اپنا، ہم نہیں
جب تمہاری صورت و سیرت میں ہے واضح تضاد
متفق ہر بات پر ہو، وہ شناسا ہم نہیں
کن کی آنکھوں پر تعصب کی ہے عینک دیکھ لو
تم بھی واقف ایسے لوگوں سے ہو تنہا ہم نہیں
تم مٹاتے ہو ہمیں حرفِ مکرر کی طرح
تم نے سمجھا ہی غلط ہے بے سہارا ہم نہیں
جو مفادِ ذات کی خاطر ہے مصروفِ عمل
اس کے گن گائے گی اس کی اپنی دنیا ہم نہیں

باب سوم

نثر نگار

علامہ ظفر احمد عثمانی

(عالمِ دین، مصنف، معلّم)

ظفر احمد عثمانی (۱۸۹۳ء-۱۹۷۴ء) مشہور و معروف عالم، محدث، مفسر، فقیہ اور معلّم تھے۔ انھوں نے ساری زندگی درس و تدریس، تصنیف و تالیف، وعظ و ارشاد اور قومی و ملّی خدمات میں گزاری۔

مدرسہ مظاہر العلوم، سہارنپور، مدرسہ اشرفیہ، تھانہ بھون، ڈھاکا یونیورسٹی اور مدرسہ عالیہ ڈھاکا سے بحیثیت استاد وابستہ رہے۔ مشرقی پاکستان میں ان کی علمی، دینی اور تبلیغی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ وہ ۱۹۳۸ء میں ڈھاکا یونیورسٹی سے منسلک ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد مدرسہ عالیہ ڈھاکا سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۵۴ء میں وہاں سے سبک دوش ہونے کے بعد علامہ احتشام الحق تھانوی کی دعوت پر کراچی آ گئے اور ان کے قائم کردہ مدرسہ "دارالعلوم اسلامیہ" ٹنڈو الہ یار میں بطور شیخ الحدیث ایک عرصے تک درس دیتے رہے۔ علامہ عثمانی "جامعہ قرآنیہ" لال باغ، ڈھاکا کے بانی اور سرپرست تھے، لہٰذا وہ ہر سال رمضان کی تعطیلات وہیں جا کر گزارتے تھے اور بخاری شریف کا درس بھی دیتے تھے۔ ۱۹۷۱ء سے یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

علامہ عثمانی کی سیاسی اور قومی خدمات بھی نہایت اہم ہیں۔ انھوں نے حضرت اشرف علی تھانوی (جو ان کے سگے ماموں، استاد اور مرشد تھے) کے حکم پر مسلم لیگ کی جدوجہد آزادی اور قیامِ پاکستان کے سلسلے میں کئی سال تک مسلسل کام کیا۔ قائدِ اعظم کے ایما پر مشرقی پاکستان میں ۱۴ اگست

۱۹۴۷ء کو پرچم کشائی انھیں کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی (اور مغربی پاکستان میں علامہ شبیر احمد عثمانی کے ہاتھوں)۔ مشرقی پاکستان کے علما اور عوام میں ان کی بڑی عزت تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد نظامِ اسلام کے نفاذ کے لیے بھی جدوجہد جاری رکھی۔

علامہ عثمانی کی وفات کراچی میں ۱۹۷۴ء میں ۸۱ سال کی عمر میں ہوئی۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے۔!

تصانیف

علامہ ظفر احمد عثمانی ایک ممتاز مصنف و مؤلف تھے۔ لیکن روایت و تقلید کے دائرے سے باہر نکلنے کے قائل نہ تھے۔ انھوں نے عربی اور اُردو میں بے شمار کتابیں لکھیں۔ ان کی اکثر کتابیں عربی میں ہیں۔ ان کی سب سے اہم اور مشہور کتاب 'اعلاء السنن' ہے جو بیس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب علم حدیث پر عربی میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کی تالیف پر دنیائے اسلام کے برگزیدہ عالموں نے انھیں خراجِ تحسین پیش کیا۔

علامہ کی چند اردو کتابوں کے نام درج کیے جاتے ہیں:

حقیقتِ معرفت۔ تردیدِ پرویزیت۔ برأتِ عثمانؓ۔ معاویہؓ۔ ابوسفیانؓ۔ فضائلِ جہاد۔
فضائلِ قرآن۔ فضائلِ سید المرسلینؐ۔ ولادتِ محمدیہ کا راز۔ حوائجِ بشریہ اور تعلیمِ نبوت۔
سفرنامہ حجاز۔ انوار النظر فی آثار الظفر وغیرہ۔

علامہ عثمانی نے بعض عربی کتابوں کے اردو میں ترجمے بھی کیے اور اخباروں اور رسالوں میں مضامین بھی لکھے۔

اہل و عیال

علامہ عثمانی کی اہلیہ محترمہ کا ۴۱ سال کی رفاقت کے بعد ڈھاکے میں ۱۹۵۰ء میں انتقال ہو گیا۔ ان سے دو بیٹے عمر احمد عثمانی اور قمر احمد عثمانی اور تین بیٹیاں تھیں۔ اس کے بعد انھوں نے دوسرا

نکاح کیا لیکن کچھ ہی عرصہ بعد ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد دو اور نکاح کیے۔ تیسری اہلیہ سے ان کے چھوٹے بیٹے محمد مرتضیٰ ہیں جو دارالعلوم اسلامیہ، ٹنڈو الہ یار کے فارغ التحصیل عالم ہیں۔ یہ تینوں نکاح ڈھاکے میں ہوئے۔ (''تذکرۃ الظفر'')

علامہ عثمانی کی ایک صاحبزادی کی شادی ڈھاکے کے مشہور و معروف صحافی اور ادیب سید وحید قیصر ندوی سے غالباً 1951 یا ۱۹۵۲ء میں ہوئی تھی۔ ۱۹۷۰ء میں وحید قیصر ندوی کی ڈھاکے میں وفات ہوگئی۔

علامہ عثمانی کے دونوں بڑے صاحبزادے عمر احمد عثمانی اور قمر احمد عثمانی بھی جید عالم اور ادیب و مصنف تھے۔ ان دونوں بھائیوں نے بھی کئی سال مشرقی پاکستان میں گزارے۔ لہٰذا ان کا مختصر تذکرہ بھی ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

عمر احمد عثمانی

عمر احمد عثمانی ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ (تاریخی نام ''مرغ محمد'' ہے جس سے ۱۳۳۲ھ برآمد ہوتا ہے) مدرسہ امدادیہ تھانہ بھون اور مظاہر العلوم، سہارنپور میں تعلیم حاصل کی۔ درس نظامی کی تکمیل کے بعد مدرسہ مظاہر العلوم ہی میں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اس دوران انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ''آنرز عربی'' (۱۹۳۷ء) اور اردو و فارسی میں آنرز (۱۹۴۰ء) کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے بعد ہی مشرقی پاکستان چلے گئے۔ دارالعلوم چندن پور، چاٹگام میں شیخ الحدیث مقرر ہوئے۔ وہاں ایک عرصے تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۲ء تک ڈین آف تھیالوجی بیورو آف نیشنل ری کنسٹرکشن حکومتِ پاکستان، کراچی کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر گورنمنٹ کالج ناظم آباد، کراچی سے صدر شعبۂ اسلامیات کی حیثیت سے وابستہ ہوگئے اور یہیں سے ریٹائر ہوئے۔

تالیفات

ذیل میں ان کی تالیفات و تصنیفات کی ایک فہرست "فقہہ القرآن" جلد اوّل کے دیباچے سے درج کی جاتی ہے:

۱۔ "آنرز ان عربک کے امتحان میں یونی ورسٹی میں اوّل آئے تو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ریسرچ کے لیے اسکالرشپ ملا جس کے تحت پرنسپل محمد شفیع صاحب کی زیر نگرانی 'قلائد الجمان' کو ایڈٹ کیا جو انساب عرب پر ایک قلمی کتاب ہے۔

۲۔ نیز عضد الدولہ دیلمی (دور عباسی کا ایک شیعہ وزیر اعظم) کی بایوگرافی مرتب کی۔

۳۔ فضائل الایام والشہور (اردو) مطبوعہ کتب خانہ امداد الغرباء، سہارنپور۔

۴۔ شرح نحو میر (درس نظامی کی عربی قواعد پر مشہور کتاب کی اردو شرح) مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ، جامع مسجد، دہلی۔

۵۔ ترجمہ فجر الاسلام (ڈاکٹر احمد امین مصری کی اسلامی تہذیب و ثقافت پر مشہور عالم کتاب کے پہلے حصے کا ترجمہ)

۶۔ ترجمہ ضحیٰ الاسلام (ڈاکٹر احمد امین کی کتاب کے دوسرے حصے کا ترجمہ)

یہ دونوں ترجمے قیمتاً خرید کر ادارہ طلوع اسلام، لاہور نے شائع کیے۔

۷۔ قرآن پڑھو۔ مطبوعہ بیورو آف نیشنل ری کنسٹرکشن، حکومت پاکستان

۸۔ خاتمۃ الکلام فی قرأت خلف الامام (مع تقریظ مولانا ظفر احمد عثمانی) مطبوعہ العزیز پبلی کیشن، ہیرآباد، حیدرآباد

۹۔ فقہہ القرآن

ان کے علاوہ متعدد طویل اور اہم مضامین جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے مگر کتابی صورت میں نہ آسکے۔"

("فقہہ القرآن" جلد اول۔ دیباچہ از مفتی محمد طاہر مکی)

"مقتبسِ القرآن" پروفیسر عمر احمد عثمانی کی سب سے اہم علمی، دینی اور تحقیقی کتاب ہے جو آٹھ ضخیم جلدوں میں ادارۂ فکرِ اسلامی کراچی سے شائع ہوئی۔

مفتی محمد طاہر مکی ان کے اخلاق و کردار کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مولانا عمر احمد صاحب پختہ کردار کے مسلمان اور معاملات میں انتہائی کھرے انسان ہیں۔ وعدے کے پکے اور چغلی و غیبت سے انتہائی متنفر شخص۔ حالانکہ یہ وہ امراض ہیں جن میں آج اچھے اچھے مدعیانِ اصلاح و تہذیب اور مسند نشینانِ دین و اخلاق مبتلا ہیں۔"

(ایضاً)

۲رنومبر ۱۹۹۱ء کو علامہ عمر احمد عثمانی کراچی میں انتقال کر گئے۔ اللہ مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔ آمین۔

قمر احمد عثمانی

"حضرت مولانا کے دوسرے صاحبزادے مولوی قمر احمد عثمانی ہیں۔ انھوں نے عربی کتب درسیہ مدرسہ تھانہ بھون، دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور میں پڑھیں۔ پھر دورۂ حدیث کی تکمیل جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں اپنے والدِ محترم، حضرت مولانا شمس الحق افغانی اور مولانا منتخب الحق سے کی اور اس کے بعد سرکاری مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ آج کل گورنمنٹ نارمل اسکول کمالیہ ضلع لائل پور (فیصل آباد) میں مدرس ہیں۔ موصوف بھی نہایت ذہین، ذی استعداد اور صاحبِ تحریر ہیں۔" ("تذکرۃ الظفر" مطبوعہ ۱۹۷۷ء۔ ص: ۱۳۵)

قمر احمد عثمانی بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح تحقیقی ذوق رکھتے تھے اور ایک اچھے ادیب و شاعر تھے۔ اپنے والد محترم کے ساتھ وہ ایک عرصے تک ڈھاکے میں قیام پذیر رہے۔ وہ "ارمنی ٹولہ گورنمنٹ اسکول، ڈھاکا" میں ٹیچر بھی رہے۔ ۱۹۵۱ء میں جب "ایصالِ ثواب" کے موضوع پر ان

کے والد اور علامہ تمنا عمادی (۱۸۸۸۔۱۹۷۲ء) کے درمیان تحریری مذاکرہ ہوا تو وہی قاصد کا کام انجام دیتے رہے۔ یہ مذاکرہ کئی مہینوں تک جاری رہا۔ (ان خطوط کا مجموعہ الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ، کراچی نے ''مذاکرہ'' کے نام سے شائع کر دیا ہے)۔ لطف کی بات یہ ہے کہ قمر احمد عثمانی اپنے والدِ محترم کی بجائے علامہ تمنا کے ہم خیال تھے۔ کراچی آنے کے بعد انھوں نے اپنے بڑے بھائی کی نگرانی میں متعدد تحقیقی کتابیں اور مقالے لکھے۔ ان کی سب سے مشہور کتاب ''مذہبی جماعتوں کا فکری جائزہ'' ہے، جس کی بڑی پذیرائی ہوئی اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔

چند سال قبل قمر احمد عثمانی کا بھی انتقال ہو گیا۔ اللہ مغفرت فرمائے۔!

علاّمہ راغب احسن

(عالم، ادیب، سیاسی رہنما)

راغب احسن غالباً تاریخی نام ہے۔ جس سے ان کا سن پیدائش ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء نکلتا ہے۔ ان کا خاندانی تعلق گیا (بہار) سے تھا۔ غالباً وہیں پیدا ہوئے۔ لیکن بچپن ہی میں والدین کے ساتھ کلکتہ آ گئے۔ وہیں تعلیم و تربیت ہوئی۔ ان کے والد ریاض الدین احمد کلکتہ میں محکمہ ڈاک میں ملازم تھے۔

راغب احسن کو حصولِ علم کا بچپن ہی سے بہت شوق تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سیاست سے بھی گہرا لگاؤ تھا ابھی غالباً میٹرک ہی پاس کیا تھا کہ محمد علی جوہر اور "کامریڈ" سے تعلق پیدا ہو گیا۔ اور ان کے زیرِ اثر وہ بھی "تحریک خلافت" میں شامل ہو گئے۔ اسی نوعمری میں وہ کلکتہ خلافت کمیٹی کے ممبر بنا دیے گئے" جو ایک نوجوان کے لیے قابلِ رشک اعزاز تھا"۔ اسی سلسلے میں ۲۱۔۱۹۲۰ء میں گرفتار ہوئے اور علی پور (کلکتہ) جیل بھیج دیے گئے۔ رہائی کے بعد اپنا تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع کیا اور غالباً تاریخ اور عمرانیات میں کلکتہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ زبان، ادب، تاریخ، سیاسیات، معاشیات، مذاہب اور علومِ اسلامی کا بڑا گہرا اور وسیع مطالعہ کیا۔ وہ غیر معمولی طور پر ذہین تھے اور ان کا حافظہ بھی بہت قوی تھا۔ لہٰذا وہ نوجوانی ہی میں کئی زبانوں کے ماہر اور مختلف علوم و فنون پر حاوی ہو گئے۔

اُردو، عربی اور فارسی کے علاوہ انگریزی تحریر و تقریر پر انھیں ایسا عبور حاصل ہو گیا تھا کہ

اہلِ علم انھیں محمد علی ثانی کہنے لگے۔ محمد انیس الرحمن (ایڈوکیٹ) لکھتے ہیں:

"راغب احسن ایک بہت ہی محنتی شخص تھے۔ ان کے شب و روز مطالعہ و مقالہ نویسی اور صحیفہ نگاری میں بسر ہوتے تھے۔ انھوں نے دنیا کے مختلف ممالک کے دساتیر اور ان کے سیاسی و معاشی نظام کا عمیق مطالعہ کیا تھا۔ ان کا حافظہ بہت ہی تیز تھا، جس کی تعریف حسین شہید سہروردی کیا کرتے تھے۔ اہلِ علم و دانش کے مجمع میں جب گفتگو کرتے تو حاضرین ان کے تبحرِ علمی اور سیاسی بصیرت سے انگشت بدنداں ہوئے بغیر نہ رہتے۔"

("شائق، عثمان و راغب"۔ ص: ۴۲)

راغب احسن پچیس چھبیس سال کی عمر ہی میں اپنے سیاسی، علمی، معاشی اور مذہبی عنوانات پر لکھے گئے انگریزی اور اُردو مضامین کی وجہ سے اہلِ علم کی نظر میں کافی وقعت حاصل کر چکے تھے۔ علامہ اقبال ۱۵ر جنوری ۱۹۳۱ء کو انھیں اپنے خط میں لکھتے ہیں:

"ڈیر راغب صاحب، السلام علیکم۔ دنیا تعمیرِ جدید کی محتاج ہے۔ جمہوریت فنا ہو رہی ہے۔ سرمایہ داری کے خلاف جہاد جاری ہے۔ تمدن و تہذیب بھی بحران میں ہے۔ ان حالات میں دنیا کی تعمیرِ جدید میں اسلام کون سا پارٹ ادا کر سکتا ہے؟ مہربانی فرما کر مجھے اس موضوع پر اپنے خیالات تحریر فرمائیں۔"

مخلص محمد اقبال۔ ۱۵ر جنوری ۱۹۳۱ء

(بحوالہ "شائق، عثمان و راغب"۔ ص: ۴۰)

چند سال کے بعد علامہ اقبال ایک خط میں انھیں لکھتے ہیں:

"مجھ کو آپ کے خیالات سے پورا اتفاق ہے۔ میں آپ سے دلی ہمدردی رکھتا ہوں۔ اصل چیز علم نہیں بصیرت ہے اور عطائے ربانی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بصیرت کا وافر حصہ عطا فرمایا ہے۔"

مخلص محمد اقبال۔ ۳ر جولائی ۱۹۳۳ء

(بحوالہ "شائق، عثمان وراغب"۔ص:۴۰)

اسی دوران راغب احسن، علامہ اقبال کی دعوت پر لاہور آگئے اور کئی سال تک علامہ کی ہدایت کے مطابق مختلف اخباروں میں تحریری کام انجام دیتے رہے۔

غالباً ۱۹۳۵ء میں راغب کلکتہ واپس آگئے۔ یہاں انھوں نے مسلم لیگ کی تنظیمِ نو کا کام شروع کیا۔ وہ کلکتہ ضلع مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے اور اپنی تحریر وتقریر سے انھوں نے بنگال مسلم لیگ میں ایک نئی جان ڈال دی۔ اس سے پہلے برِصغیر کے مسلم نوجوانوں کی ایک جماعت آل انڈیا مسلم یوتھ لیگ کے نام سے قائم کر چکے تھے اور اس کے بھی وہ سکریٹری تھے۔

اسی دوران راغب احسن نے "جمعیت علمائے ہند" (جو کانگریس کی ہم نوا تھی) کے مقابلے میں "جمعیت علمائے اسلام" قائم کی اور اس کا صدر علامہ شبیر احمد عثمانی کو بنایا۔ علما کی یہ جماعت مسلم لیگ کی حامی تھی۔ ۱۹۳۵ء سے قیامِ پاکستان (۱۹۴۷ء) تک راغب احسن نے بہت مصروف ایام گزارے۔ تحریری وتقریری، علمی وعملی ہر لحاظ سے وہ مصروفِ جہاد رہے۔ تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں سب سے فعال بنگال مسلم لیگ تھی اور اس میں سب سے بڑا ہاتھ راغب احسن کا تھا۔ اس دور میں قائدِ اعظم محمد علی جناح نے انھیں بے شمار خطوط لکھے۔ ان میں سے اکثر خطوط نیشنل میوزیم لاہور میں محفوظ ہیں۔ انیس الرحمٰن صاحب نے اپنی کتاب (شائق، عثمان وراغب"۔ص:۸۲) میں ان خطوط کی تعداد تین سو بیان کی ہے۔

اس دور میں راغب احسن نے تحریکِ پاکستان اور دو قومی نظریے پر انگریزی اور اُردو میں اس کثرت سے مضامین لکھے کہ ان کے مقابلے میں کسی اور شخص کا نام نہیں لیا جاسکتا۔ وہ ایم۔ پی بھی رہے۔

قیام، پاکستان کے بعد ہی راغب احسن ڈھاکا آگئے۔ لیکن یہاں ان کی سیاسی سرگرمیاں رفتہ رفتہ محدود ہوگئیں۔ اس لیے کہ قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان بنانے والوں کی کوئی اہمیت نہ رہی۔ پھر زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ مسلم قومیت کی جگہ علاقائی قومیتوں نے لے لی۔ مہاجروں

کی آبادکاری کے لیے راغب احسن نے "انجمن مہاجرین" کے نام سے مشرقی پاکستان میں ایک انجمن قائم کی۔ "جمعیت علمائے اسلام" پاکستان کی اس دور میں تنظیم نو کی اور اس کے کئی جلسے ڈھاکے میں منعقد کیے۔ جس میں مشرقی و مغربی پاکستان کے مشاہیر علماء شامل ہوئے۔ ڈھاکے میں دو بار "کشمیر کانفرنس" منعقد کی اور اس میں مغربی پاکستان کے ممتاز زعماء کو شریک کیا۔ کشمیری رہنما مثلاً سردار عبدالقیوم خاں، سردار ابراہیم وغیرہ بھی شریک ہوئے۔ اس دور میں انھوں نے بہت سے اہم اور فکر انگیز خطبات لکھے جو کتابچوں کی شکل میں شائع ہوتے رہے۔ ۱۹۵۷ء میں وہ پاکستان لا کمیشن کے ممبر بھی مقرر ہوئے۔ پاکستان میں نظام اسلام کے قیام کے سلسلے میں بھی وہ کوشاں رہے اور کئی بار علماء کی کانفرنس بھی اس سلسلے میں انھوں نے منعقد کی تھی۔

مشرقی پاکستان کے آخری دور میں جب سیاسی شورشیں بہت بڑھ گئیں تو علامہ نے سیاست سے علاحدگی اختیار کر لی ور گوشہ نشیں ہو گئے۔ اس دوران ان پر فالج کا حملہ بھی ہوا لیکن علاج معالجے سے بڑی حد تک تندرست ہو گئے۔ ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو انھیں اپنی زندگی کا سب سے بڑا المیہ دیکھنا پڑا۔ جس پاکستان کو برصغیر کے لاکھوں مسلمانوں نے اپنا خون دے کر حاصل کیا تھا اور جس کی تحریک کو علامہ نے اپنا خونِ جگر دے کر پروان چڑھایا تھا وہ ان کی آنکھوں کے سامنے دو ٹکڑے ہو گیا اور دو قومی نظریے کی دھجیاں بکھر کر رہ گئیں۔ پیرانہ سالی، بیماری اور اس پر یہ جانکاہ صدمہ۔ علامہ بڑی مشکل سے ڈھاکے سے نکلے اور کراچی پہنچے (وہ غالباً سقوطِ ڈھاکا سے چند ماہ قبل کراچی آ گئے تھے)۔

چند سال کراچی میں گوشہ نشینی کی زندگی گزار کر علامہ راغب احسن ۲۸ر نومبر ۱۹۷۵ء کو وفات پا گئے۔ وفات بھی ایسی ہوئی کہ ہر مسلمان کے لیے قابلِ رشک ہے۔ جمعہ کے دن نہا دھو کر اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر جمعہ کی نماز کے لیے مسجد پہنچے۔ مسجد کے دروازے کے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ پاؤں میں کچھ لرزش محسوس ہوئی۔ وہ مسجد کے صحن ہی میں بیٹھ گئے اور بیٹھے ہی بیٹھے غالباً تحیۃ المسجد یا سنت پڑھنے لگے۔ جوں ہی سجدے میں گئے روح پرواز کر گئی۔

ع مردِ درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ

مجھے یاد نہیں کہ یہ واقعہ مجھے کس شخص نے سنایا تھا یا ان کی وفات کے بعد کسی مضمون میں یہ واقعہ پڑھا تھا۔ لیکن ایڈووکیٹ محمد انیس الرحمن صاحب اپنی کتاب ''شائق، عثمان و راغب'' میں لکھتے ہیں:

''جمعہ کے دن نمازِ جمعہ کے لیے مسجد پہنچے اور بارگاہِ خداوندی میں بے ہوش ہو کر گر پڑے، مسجد کی زمین ان کے خون سے رنگین ہوئی...... ۲۸ رنومبر ۱۹۷۵ء کو پاکستان کا لاثانی عملی سیاسی فلسفی شہادت کی لذتوں سے ہم کنار ہوا۔''

(ص: ۸۰)

بہر حال موت جس طرح ہوئی ہو یہ بات تصدیق شدہ ہے کہ ان کی وفات جمعہ کے دن مسجد میں نمازِ جمعہ سے کچھ پہلے ہوئی۔

علامہ راغب احسن ایک بلند پایہ سیاسی اور دینی مفکر تھے۔ ان کی فکر و نظر کا محور و مرکز اسلام تھا۔ ان کی ساری سیاسی، علمی اور عملی سرگرمیاں صرف اسلام کے لیے تھیں۔ ان کی ساری زندگی دراصل اسلام کے لیے تھی۔ اسلام کے معاملے میں وہ کسی کی رو رعایت نہ کرتے تھے۔ ایڈووکیٹ انیس الرحمن صاحب لکھتے ہیں:

''قائدِ اعظم محمد علی جناح نے ۱۵ رجون ۱۹۳۶ء کے ایک خط میں مولانا راغب احسن کو مندرجہ ذیل الفاظ میں مخاطب کیا: ''کروڑوں ہیں جو میرے اندھے مقلد ہیں، لاکھوں ہیں جو میرے لیے سرگرمی سے کام کرتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے طول و عرض میں مسلم لیگیوں میں صرف اور صرف راغب احسن ہیں جو اسلام اور پاکستان کے اصول کی محبت میں مجھ پر بے باکی کے ساتھ تنقید کی جرأت کرتے ہیں۔ پاکستان کے نصب العین کی خاطر وہ مجھ پر سخت ترین گرفت کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ وہ مجھ کو چاہتے ہیں لیکن مجھ سے زیادہ اسلام اور پاکستان کو چاہتے ہیں۔ راغب احسن لیگ اور تحریکِ پاکستان کے

زندہ ضمیر ہیں، دراغب احسن پر مجھ کو فخر ہے۔"

("شائق، عثمان وراغب"۔ ص: ۳۸)

علامہ کی شخصیت اور کارناموں پر تحقیقی مقالہ یا کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ ایسے لوگ

صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

❖❖

ڈاکٹر شوکت سبزواری

(ماہرِ لسانیات، ناقد)

سوانحی خاکہ

نام: سیّد شوکت علی

قلمی نام: شوکت سبزواری

والد کا نام: سیّد اسد علی

تاریخِ پیدائش: اکتوبر ۱۹۰۸ء (یہ تاریخ میٹرک سرٹیفکیٹ کے مطابق ہے)

مقامِ پیدائش: میرٹھ (یو پی ۔ بھارت)

تعلیم: مولوی فاضل، منشی فاضل (مدرسہ امداد العلوم، میرٹھ)

ایم ۔ اے، فارسی (آگرہ یونیورسٹی)

ایم ۔ اے، عربی (کلکتہ یونیورسٹی)

ایم ۔ اے، اُردو (آگرہ یونیورسٹی)

ایل ایل بی (میرٹھ کالج)

پی ایچ ڈی (ڈھاکا یونیورسٹی)

پہلی ہجرت: ۱۹۵۰ء ۔ ڈھاکا (شعبۂ اردو و فارسی، ڈھاکا یونیورسٹی)

دوسری ہجرت: ۱۹۵۹ء ۔ کراچی (رکن اُردو لغت بورڈ، کراچی)

وفات: ۱۹؍ مارچ ۱۹۷۳ء ۔ کراچی

اولاد: کئی بیٹیاں تھیں، شاید کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی۔

ایک بیٹی کی شادی ڈھاکے میں ہوئی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کی علمی زندگی

ڈاکٹر شوکت سبزواری ماہر لسانیات اور ایک منفرد ناقد کی حیثیت سے برصغیر میں مشہور و معروف ہیں۔ وہ ۱۹۰۸ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے پاس ڈگریوں کی ایک لمبی فہرست تھی۔ وہ مدرسے کے عالم و فاضل، اردو، فارسی اور عربی میں ایم۔اے اور ایل ایل بی تھے۔ انھیں اردو، فارسی اور عربی کے علاوہ انگریزی، سنسکرت، پالی اور بعض دوسری زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ وہ ۱۹۵۰ء میں ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو و فارسی سے منسلک ہو کر ڈھاکا آئے اور یہاں کم و بیش ۹ سال گزارنے کے بعد ۱۹۵۹ء میں اُردو لغت بورڈ کے ممبر کی حیثیت سے کراچی چلے گئے۔ راقم کو ان کے شاگرد ہونے کی سعادت حاصل ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری کی علمی صلاحیت و قابلیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ ہند و پاک کے ممتاز ماہرین لسانیات میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ڈھاکا آ کر انھوں نے اپنا تحقیقی مقالہ "اُردو زبان کا ارتقا" کے عنوان سے پی ایچ ڈی کے لیے ڈھاکا یونیورسٹی میں پیش کیا جس پر انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔ یہ کتاب ڈھاکے سے شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ چند اور کتابیں بھی ان کی وہیں اشاعت پذیر ہوئیں۔

ڈاکٹر صاحب کے مزاج میں تیزی اور تندی کچھ زیادہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بحث و مباحثہ پر بہت جلد آمادہ ہو جاتے تھے اور معمولی معمولی باتوں پر لوگوں سے الجھ پڑتے تھے۔ ابتدا میں انھوں نے غیر مسلم مناظروں سے اسلام کی تائید و حمایت میں مناظرے بھی کیے۔ وہ یونیورسٹی میں ایک استاد کی حیثیت سے کچھ زیادہ مقبول نہ تھے۔ ان کا طریقۂ تدریس بہت فرسودہ تھا۔ وہ مکتب کے مولویوں کی طرح طلباء کو ڈانٹتے ڈپٹتے رہتے تھے۔ "نقوش" کے شخصیات نمبر میں ڈاکٹر عندلیب

شاداني كی شخصیت پر مضمون لکھتے ہوئے انھوں نے ان کی انانیت کا ذکر بڑی شد و مد سے کیا تھا، حالانکہ خود ان میں بھی کچھ کم انانیت نہ تھی۔ وہ اکثر کلاس روم میں بھی اور نجی محفلوں میں بھی اپنے علمی اور ادبی کارناموں کا ذکر بڑے فخر سے کرتے رہتے تھے اور اپنی ذات ہی کو موضوعِ گفتگو بناتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب میں تحریر کے علاوہ تقریر کی بھی اچھی صلاحیت تھی۔ جب تک ڈھاکے میں رہے، علمی و ادبی مذاکرات میں برابر شریک ہوتے رہے۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کے مصنف، محقق اور نقاد تھے۔ مختلف زبانوں کے علاوہ مذہبیات، منطق، فلسفہ اور تاریخ اسلام کے بھی عالم تھے۔ "فلسفۂ کلامِ غالب"، "اُردو زبان کا ارتقا" اور "داستانِ زبانِ اُردو" ان کے قیامِ ڈھاکا کی یادگار ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے ڈھاکا کے قیام کے دوران بے شمار تنقیدی، تحقیقی اور علمی مضامین لکھے جو مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے اور بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوئے۔

ڈاکٹر سبزواری فطری طور پر مذہبی انسان تھے۔ اسلام اور دیگر مذاہب کا مطالعہ انھوں نے خوب کیا تھا۔ انھیں منطق اور فلسفہ سے بھی دلچسپی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی قدر آزاد خیال بھی تھے۔ بہر حال ان کے تبحرِ علمی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے تنقیدی مضامین سے ان کے تبحرِ علمی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مشرقی و مغربی اور جدید و قدیم ادب پر گہری نظر رکھنے کی وجہ سے ان کے مضامین بڑے وقیع ہوتے تھے۔ ان کا طرز صاف ستھرا اور استدلالی ہوتا تھا، وہ اس سلسلے میں علامہ حالی اور مولوی عبدالحق سے متاثر تھے۔

تنقید میں نقطۂ نظر کی اہمیت

تنقید میں نقطۂ نظر کی جو اہمیت ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جب کہ بعض لوگ تنقید یا ادب میں کسی نظریے کے قائل نہیں۔ "نقوش" میں فراق گورکھپوری کے ہفوات کے جواب میں محمد حسن عسکری اور بعض دوسرے حضرات کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے بھی اسلام اور اسلامی ادب کی حمایت میں مضمون لکھا تھا۔ کمیونسٹ ادیب و ناقد اپنے نظریات کی تبلیغ و اشاعت ہر سطح پر کرتے ہیں

اوران پر کوئی معترض نہیں ہوتا بلکہ انھیں سراہا جاتا ہے۔ لیکن اسلامی نظریات کی بات آتے ہی سب چونک اٹھتے ہیں اور بیک وقت سب اس کے خلاف نعرہ زن ہو جاتے ہیں اور وہ بھی پاکستان جیسے ملک میں جو بنا ہی اسلام کے نام پر ہے۔

ع جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

ڈاکٹر صاحب تنقید میں نقطۂ نظر کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس سے ظاہر ہے کہ فطرت کا مزاج ابتدائی فطری تقاضوں کی تحسین و تہذیب ہے جو معاشرتی ارتقا کے قدم بہ قدم ہوئی اور ادب جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا، سماج کے تمدنی تقاضوں کی پیداوار ہے۔ اس لیے تہذیب یا تطہیر فطرت کا مزاج ہی نہیں سماج کا ارتقائی رُخ اور ادب کا منہاج بھی ہے۔ جو لوگ ادب کی بنیاد ابتدائی جنسی جذبے یا غذا کو قرار دیتے ہیں وہ الٹے پاؤں پیچھے کی طرف لوٹ جانا چاہتے ہیں اور حیات و کائنات ساتھ لے چلنے کی جگہ اسے پیچھے دھکیل رہے ہیں۔ یہ اگر ترقی ہے تو ترقی معکوس ہے۔"

(مقالہ "تنقید میں نقطۂ نظر کی اہمیت")

قدیم و جدید

قدیم و جدید کی بحث ایک لایعنی چیز ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا:

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم

اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"اب ذرا غور کیجیے کہ قدیم و جدید کا مفہوم کیا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ قدیم و جدید اضافی مفہوم ہے۔ عرب کے ایک شاعر نے نئی نسل کے شعرا کو خطاب کرتے ہوئے لکھا تھا، 'قدیم گزرے ہوئے زمانے میں جدید تھا اور جدید آئندہ قدیم ہو جائے گا۔' محض جدید ہونا فخر کی بات نہیں۔ لیکن میں یہاں قدیم و جدید کے اضافی مفہوم پر زور دینا نہیں

چاہتا۔ ان کے باہمی رشتے اور زندگی سے ان کے تعلق کو واضح کرنا چاہتا ہوں۔ زندگی تغیر کے باوجود ایک اکائی ہے۔ ایک وحدت ہے۔ بقول علامہ اقبال زندگی کے دو عنصر ہیں۔ ایک قدیم دوسرے جدید۔ افراد کی طرح اقوام کی زندگی میں بھی قدیم ایسا ہی ضروری عنصر ہے جیسا جدید۔" (مقالہ "تنقید یا تقلید")

تقلید

تقلید مذہب میں ہو یا ادب میں دونوں ہی جگہ نقصان دہ اور تباہ کن ہے۔ مذہب میں تقلید، اجتہاد کا دروازہ بند کر دیتی ہے اور ادب میں تقلید، تخلیق کے سوتے خشک کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"اُردو ادب کو جس چیز نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا وہ تقلید ہے۔ تقلید اور تخلیق میں خدا واسطے کا بیر ہے۔ جہاں تقلید کا دور دورہ ہو وہاں تخلیق کا پنپنا مشکل ہے۔ تخلیقی صلاحیتیں تقلید کے اثر سے کمھلا جاتی ہیں۔ جیسے گرم ہوا کے اثر سے نرم و نازک کلیاں۔ ادب تخلیق کا نام ہے۔ نظم و نثر دونوں تخلیق کے سہارے زندہ رہتی ہیں اور تخلیق کی مدد سے نشو و نما پا کر پروان چڑھتی ہیں.......... ہمارے نئے ادیب جن میں کچھ یقیناً بڑی اچھی تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہیں تقلید کے شوق میں اپنی ان صلاحیتوں کو کھو چکے ہیں اور برابر کھوتے جا رہے ہیں۔" ("تنقید یا تخلیق")

تصانیف

ڈاکٹر شوکت سبزواری کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

فلسفۂ کلامِ غالب۔ اُردو زبان کا ارتقا۔ داستانِ اُردو زبان۔ غالبؔ۔ فکر و فن۔

نئی پرانی قدریں۔ اُردو قواعد۔ معیارِ ادب۔ لسانی مسائل اور اُردو لسانیات۔

۱۹؍ مارچ ۱۹۷۳ء کو ڈاکٹر صاحب کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔ اللہ مغفرت فرمائے۔!

❖❖

ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی
(ناقد، محقق، معلّم)

ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی (۱۹۱۵ء-۱۹۹۸ء) ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو و فارسی سے منسلک تھے۔ انھوں نے تقریباً تمام تصنیفی اور تحریری کارنامے یہیں انجام دیے۔ کئی تحقیقی اور تنقیدی کتابیں لکھ کر اُردو دنیا سے خراج تحسین حاصل کیا۔

ڈاکٹر صاحب ۲۵ر جولائی ۱۹۱۵ء کو ردولی، ضلع بارہ بنکی (یو پی) میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے تھا۔ گورنمنٹ انٹر میڈیٹ کالج، فیض آباد سے انٹر، کرسچین کالج، لکھنؤ سے بی۔ اے اور مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے ایم۔ اے (اُردو) کیا۔ وہیں سے شبلی نعمانی پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ ۱۹۵۰ء میں ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو و فارسی کے استاد کی حیثیت سے ڈھاکا آئے اور سقوطِ ڈھاکا تک اس سے وابستہ رہے۔ ڈاکٹر شادانی کے ریٹائر ہونے کے بعد ۱۹۶۹ء میں وہ صدر شعبہ مقرر ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب کو طالب علمی کے زمانے ہی سے تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران تحقیقی و تنقیدی مضامین پر مشتمل چند کتابچے شائع کیے۔ علی گڑھ میگزین کے مدیر معاون اور مدیر رہے۔ لیکن ایک محقق و نقاد کی حیثیت سے وہ ڈھاکا میں قیام کے دوران ہی معروف ہوئے۔ انھوں نے متعدد شاعروں اور ادیبوں کی زندگی اور ادبی کارناموں پر بلند پایہ کتابیں لکھیں جن میں ”گلہائے داغ“، ”صہبائے مینائی“ اور ”شبلی ایک دبستان“ ڈھاکے سے شائع ہوئیں ان

کی آتش لکھنوی پر ایک کتاب ''آتش کدہ'' مغربی پاکستان کے کسی ناشر نے شائع کی اور ایک کتاب ''ترجمانِ عصر'' جو اکبرالہ آبادی پر تھی۔ غالباً شائع نہ ہو سکی۔ ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے متعدد تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی لکھے۔

ڈاکٹر صاحب کی تحریریں بڑی شگفتہ ہوتی تھیں۔ ان کی طرزِ تحریر میں سادگی بھی تھی اور پُرکاری بھی۔ وہ علامہ شبلی نعمانی اور علامہ عبدالماجد دریابادی سے بہت متاثر تھے، لہٰذا ان کے اثرات ان کی طرزِ تحریر پر نمایاں نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب مشرقی و مذہبی طبیعت کے حامل تھے۔ ڈھاکا آنے کے بعد ان کا لباس ہمیشہ شیروانی اور پاجامہ رہا۔ وہ بڑے وضع دار، مہمان نواز، ملنسار اور مجلسی انسان تھے۔ ہم عصروں کے علاوہ اگر طلبہ بھی ان کے گھر جاتے تو ان سے بڑے تپاک سے ملتے، چائے پلاتے اور گھنٹوں باتیں کرتے رہتے تھے۔

سقوطِ ڈھاکا کے چند سال بعد مع اہل و عیال کراچی آ گئے۔ یہاں انھوں نے گوشہ نشینی کی زندگی گزاری۔ ۱۹۹۸ء میں یہیں وفات پائی۔ (''محفل جو اجڑ گئی'')

مرحوم میرے استاد تھے۔ یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد بھی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ جب بھی میری کوئی کتاب شائع ہوتی، ان کی خدمت میں پیش کرتا اور وہ میری کتابوں کے چھپنے پر خوش ہوتے۔ آخر ملاقات غالباً ۱۹۷۳ء میں محمد پور میں ہوئی، جہاں وہ عارضی طور پر قیام پذیر تھے۔

ڈاکٹر صاحب ۱۹۷۴ء سے ۱۹۹۸ء تک کراچی میں رہے۔ اس دوران میرا ان سے کوئی رابطہ نہ رہا۔ اس لیے کراچی میں ان کے حالات کا مجھے کوئی علم نہیں۔ اللہ مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔ آمین۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک بیٹا اور کئی بیٹیاں یادگار چھوڑیں۔

❖❖

ڈاکٹر معزالدین

(محقق، ناقد، معلم)

ڈاکٹر معزالدین کا تعلق بہار سے تھا۔انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے اُردو میں ایم۔اے کیا اور وہیں کسی کالج میں لیکچرار مقرر ہوئے۔غالباً ۱۹۵۰ء میں ڈھاکا آگئے۔ایک عرصے تک جگن ناتھ کالج، ڈھاکا سے وابستہ رہے۔اسی دوران ڈھاکا یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔اے کیا اور پھر وہیں سے ''قائم چاند پوری'' پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔۱۹۶۱ء میں ان کا تقرر ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو و فارسی میں ہوگیا۔چند سال کے بعد وہ لندن چلے گئے اور وہاں سے Phonetic پر ڈگری حاصل کی۔۱۹۷۱ء میں کراچی آئے۔اسی دوران وہاں انقلاب آگیا اور وہ یہیں رہ گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے تحقیقی مقالے کے علاوہ چند کتابیں اور بھی مرتب کیں اور بہت سے تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی لکھے۔''رہنمائے سخن'' کے نام سے علمِ عروض و بلاغت پر ان کی کتاب طلبا اور اساتذہ میں بہت مقبول ہوئی۔ڈاکٹر شادانی کے چند مضامین (جو بی۔اے میں اُردو آپشنل کے کورس میں تھے) مرتب کر کے ایک مقدمہ کے ساتھ ''مضامین شادانی'' کے نام سے شائع کیا۔

ڈاکٹر معزالدین نہایت بااخلاق، ملنسار اور بااصول انسان تھے۔وقت کے پابند تھے اور وقت کی خوب قدر کرتے تھے۔اُردو کے اکثر شاعروں اور ادیبوں کی طرح اپنا وقت فضول گپ شپ میں ضائع نہ کرتے تھے۔شاگردوں سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔بے تکلفی کے

ساتھ ظاہری رکھ رکھاؤ کا بھی بڑا خیال رکھتے تھے۔ چال ڈھال اور نشست و برخاست میں ایک خاص وقار تھا۔

کراچی آنے کے بعد "اقبال اکیڈمی" کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ ایک عرصے تک اس منصب پر فائز رہے۔ پھر انگلینڈ چلے گئے۔ وہاں کئی سال تک کیمبرج یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے منسلک رہے۔ فی الحال گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ (''محفل جو اجڑ گئی'')

ڈاکٹر صاحب نے کراچی آنے کے بعد کوئی کتاب نہیں لکھی اور نہ اپنا مقالہ شائع کروایا۔ چند مضامین شائع ہوئے۔ وہ جگن ناتھ کالج میں میرے استاد تھے۔ جب تک ڈھاکے میں رہے، میں وقتاً فوقتاً ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ وہ ''فضل الحق ہال'' کے ٹیچرز کوارٹر میں رہتے تھے (ڈاکٹر آفتاب مرحوم بھی وہیں تھے)۔ فی الحال اسلام آباد میں مقیم ہیں۔ ان کے بڑے صاحبزادے (حالی) بحریہ میں کسی بڑے عہدے پر تھے، اب وہ بھی ریٹائر ہو گئے ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب، پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی کے بڑے داماد ہیں۔ دوسرے داماد پروفیسر انیس الحق (سابق اُستاد قائدِ اعظم کالج، ڈھاکا) ہیں جو معروف افسانہ نگار حسنہ مرحومہ کے شوہر ہیں۔

پروفیسر شبیر علی کاظمی

(محقق، ماہر لسانیات، معلّم)

پروفیسر شبیر علی کاظمی ۱۹۱۵ء میں سنبھل (ضلع مراد آباد۔ یوپی) میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے اُردو میں ایم۔ اے اور بی ٹی کیا۔ ۱۹۴۹ء میں مشرقی پاکستان آ گئے۔ یہاں راج شاہی گورنمنٹ کالج سے وابستہ ہو گئے۔ انھیں تحقیق و تنقید اور خاص طور پر لسانیات سے دلچسپی تھی۔ اس سلسلے میں ان کے متعدد مضامین رسالوں میں شائع ہوئے۔ جب تک راج شاہی میں رہے، اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے کام کرتے رہے۔ انھیں اُردو، انگریزی، سنسکرت، پالی، فارسی، عربی، بنگالی اور ہندی پر عبور حاصل تھا۔ سقوطِ مشرقی پاکستان سے چند ماہ پہلے ۱۹۷۱ء میں وہ کراچی آ گئے۔ وہ یہاں انجمن ترقی اردو سے منسلک تھے۔ یہاں ان کا تحقیقی کام جاری رہا۔ انھوں نے پراکرتوں پر بہت کام کیا۔ ان کی وفات ۱۹۸۵ء میں ہوئی۔ وہ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ ان کی ایک کتاب ''اردو اور بنگلہ مشترک الفاظ'' (۱۹۶۴ء) پر داؤد جی انعام بھی ملا۔ انھوں نے مشرقی پاکستان کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے لیے درسی کتابیں بھی لکھیں۔ ان کی علمی اور ادبی خدمات پر انھیں ''تمغۂ امتیاز'' بھی ملا۔ (''محفل جو اجڑ گئی'')

منظر علی خاں منظر اپنے شعری مجموعہ ''کربِ آگہی'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''جناب شبیر علی کاظمی جو گورنمنٹ کالج، راجشاہی کے شعبۂ اُردو و فارسی کے صدر تھے، اپنا ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ کچھ اس لیے بھی کہ ایک طویل عرصے سے وہ کالج سے منسلک

رہے، پھر کالج اسپورٹس کے نگرانِ اعلیٰ ہونے کی وجہ سے وہ طلبا کے ہر طبقے میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ مشاعروں میں اشعار کم ہی پڑھتے لیکن ہر اچھے شاعر کی کھل کر ہمت افزائی کرتے خواہ وہ مبتدی ہی کیوں نہ ہو۔ مشرقی پاکستان میں اُردو کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کرتے رہے اور اب یہاں انجمن ترقی اردو کے زیرِ سایہ لہو کے بچے کھچے قطرے بھی اردو کا حُسن نکھارنے میں صَرف کر رہے ہیں۔"

منظر مرحوم نے اس المیہ کا ذکر نہیں کیا جو پروفیسر کاظمی کو پیش آیا۔ ۱۹۷۱ء کے ہنگاموں میں مکتی باہنی نے ان کے تین بیٹوں اور داماد کو شہید کر دیا، جس کی وجہ سے وہ کچھ عرصے تک ہوش و حواس میں نہ رہے۔ حالت سنبھلتے ہی وہ دوبارہ تحقیق و تدقیق میں لگ گئے۔ علم کے دیوانے کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔

اللہ مغفرت فرمائے۔!

ڈاکٹر محمد صدر الحق

(محقق و ناقد)

سوانحی خاکہ

نام: محمد صدر الحق

تاریخ پیدائش: ۲ رجنوری ۱۹۳۰ء

مقام پیدائش: پٹنہ (بہار)

تعلیم: ایم۔اے (اُردو) پٹنہ یونیورسٹی

ایم۔اے (فارسی) پٹنہ یونیورسٹی

ایم۔اے (اسلامی تاریخ و ثقافت) ڈھاکا یونیورسٹی

پی ایچ ڈی۔ ڈھاکا یونیورسٹی

پیشہ: درس و تدریس

ا۔ استاد کار مائکل کالج، رنگ پور

۲۔ شعبۂ اُردو و فارسی۔ ڈھاکا یونیورسٹی

پہلی ہجرت: مشرقی پاکستان۔ قیام: رنگ پور، ڈھاکا

دوسری ہجرت: سقوطِ ڈھاکا کے بعد۔ کراچی

(پاکستان ٹیلی ویژن، کراچی سے منسلک رہے)

تصانیف:

۱۔ عبدالغفور نساخ۔ حیات وتصنیفات

مطبوعہ "انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی" ۱۹۸۰ء

۲۔ انکشافات (تحقیقی مضامین)

مطبوعہ "دبستانِ جدید، کراچی"۔ ۱۹۸۱ء

ڈاکٹر صدرالحق مشرقی پاکستان کے ممتاز محققین میں تھے۔ ایک عرصے تک کارمائیکل کالج، رنگپور میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹۶۷ء میں ڈھاکا یونیورسٹی سے بنگال کے مشہور ومعروف شاعر وتذکرہ نگار عبدالغفور نساخ پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ غالباً ۱۹۶۸ء میں ان کا تقرر ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو وفارسی میں ہو گیا۔ لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ سقوطِ ڈھاکا کا المیہ پیش آ گیا۔ دوسری ہجرت کے بعد وہ کراچی میں قیام پذیر ہوئے۔ افسوس کہ ایسے بلند پایہ محقق ومعلم کو پاکستان کی کسی یونیورسٹی میں جگہ نہ مل سکی۔ مجبور ہو کر انھیں پی ٹی وی سے منسلک ہونا پڑا۔

"عبدالغفور نساخ۔ حیات وتصانیف"

یہ تحقیقی مقالہ ڈاکٹر صدرالحق کا ایک بڑا علمی کارنامہ ہے۔ اس کتاب کو انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی نے ۱۹۸۰ء میں شائع کیا۔ ادیب سہیل لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر محمد صدرالحق صاحب سے میری رفاقت اس وقت کی ہے جب وہ ڈاکٹر نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت میں انھیں کارمائیکل کالج، رنگپور (مشرقی پاکستان) میں اردو کے ایک معتبر استاد کی حیثیت سے جانتا تھا.......... بعد ازاں جب یہ مژدہ ملا کہ صدر الحق صاحب نے پی ایچ ڈی کے لیے بنگال کے نامور فرزند عبدالغفور نساخ کا انتخاب کیا ہے تو یہ باور کرنا پڑا کہ ان کا مزاج نہ صرف تحقیقی ہے بلکہ اس میدان میں وہ مشکل پسند

اور مہم جوئی کے بھی قائل ہیں.......... وہ بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ تلاش و تحقیق کے سفر میں مرحلہ در مرحلہ قدم مارتے گئے۔ پٹنہ، ڈھاکا اور کلکتہ کے کتب خانوں کو ایک کر دیا۔ ان کے انتھک قدم اور مسلسل پیش رفت کے جذبے نے بنگال میں اُردو کے نامور شاعر نساخ پر اتنا کچھ مواد فراہم کیا کہ جس کی روشنی میں مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ڈاکٹر محمد صدرالحق صاحب کا نساخ پر تحقیقی مقالہ ایسا حرف آغاز ہے جس میں حرف آخر کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔"

("انکشافات۔" تعارف)

ڈاکٹر صدرالحق اپنے مقالہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"نساخ پر میں نے اپنا تحقیقی مقالہ دسمبر ۱۹۶۶ء میں پی ایچ ڈی کے لیے ڈھاکا یونیورسٹی میں پیش کیا تھا جس پر ۲۲ جولائی ۱۹۶۷ء کو یونیورسٹی نے مجھے ڈگری دی۔

نساخ بنگال کی ایک پہلو دار اور پُرکشش شخصیت تھے۔ گیسوئے اُردو کو سنوارنے اور بنگال کی فضاؤں کو اس کی خوشبو سے معطر کرنے کا جو عظیم کارنامہ انھوں نے انجام دیا اس کے پیش نظر میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ میں نے ان کی حیات اور فکر و فن کے تمام گوشوں کو بطریق احسن اجاگر کیا ہے تاہم ان پر کام کرنے کے دوران اپنے محدود وسائل کی بنا پر جن دشواریوں کا مجھے سامنا کرنا پڑا ان کے پیش نظر اتنا کہنے کی جسارت کروں گا کہ میں نے نساخ اور بنگال کے دیگر اکابرین کے بارے میں کام کرنے کی راہ ہموار کر دی ہے۔"

("انکشافات۔" حرف آغاز)

ڈاکٹر صاحب کے اس تحقیقی مقالے کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں:

"نساخ کی ملک کے ممتاز محققین اور ناقدین نے جو پذیرائی کی وہ ان کی اُردو ادب سے گہری محبت کی آئینہ دار ہے۔ مجھ جیسے ادب کے ایک ادنیٰ طالب علم کی تحقیق کو سراہنا ان

کی اعلیٰ ظرفی، بلند حوصلگی، ہمت افزائی اور مجھ ناچیز سے ان کی محبت کی دلیل ہے۔"

("انکشافات۔" حرفِ آغاز)

"انکشافات"

نساخ پر کام کرنے کے سلسلے میں بنگال میں اردو ادب سے متعلق بہت سا مواد ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ آیا اور انھوں نے بنگال میں اردو ادب کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کرلیا تھا کہ سقوطِ ڈھاکا کا المیہ پیش آگیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"نساخ پر کام کرنے کے دوران میں نے بنگال میں اُردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے کا بھی فیصلہ کرلیا تھا اور اس سلسلے میں بہت کچھ مواد بھی اکٹھا کرلیا تھا لیکن ترتیب و توضیح کا کام ابھی پوری طرح ہونے بھی نہ پایا تھا کہ مشرقی پاکستان کا المیہ رونما ہوا اور میرا سارا سامان جس میں متعلقہ مواد اور ضروری کتابیں بھی شامل ہیں نہ جانے کس بے رحم ہاتھوں کی درندگی کا شکار ہوئیں۔ اور اس طرح مشرقی پاکستان کی علاحدگی نے بنگال میں اردو ادب کی تاریخ لکھنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔"

(ایضاً)

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"بنگال میں اُردو پر اب تک باضابطہ کام نہیں ہوا ہے۔"

حالانکہ یہ ڈاکٹر صاحب کے سامنے کی بات ہے کہ ڈاکٹر سید یوسف حسن کو ان کے تحقیقی مقالہ "بنگال میں اُردو" پر ۱۹۷۰ء میں ڈھاکا یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ ڈاکٹر یوسف حسن کے مقالے کا پہلا حصہ ۱۹۹۹ء میں کھلنا سے شائع ہوا۔

"انکشافات" ڈاکٹر صدر الحق کے چند تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۱ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ یہ کتاب ۱۲۶ صفحات اور حسب ذیل پانچ مضامین پر مشتمل ہے:

ا۔ شمالی ہند میں باضابطہ اُردو شاعری کی ابتدا

۲۔ بنگال میں اُردو کا طلوع

۳۔ حقیقت وانکشاف

۴۔ شمس کلکتوی اور داغ کی شاگردی

۵۔ مشرقی بنگال میں اُردو نثر

اس میں شک نہیں کہ یہ پانچوں تحقیقی مضامین بڑے اہم اور قابلِ قدر ہیں۔ یہی وجہ ہے اہلِ علم نے اس کتاب کی بھی پذیرائی کی۔ اس کتاب کے آخری حصے میں "نقد ونظر" کے عنوان سے پروفیسر ڈاکٹر عبدالقیوم، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری اور پروفیسر سحر انصاری کے توصیفی مضامین ہیں جن میں ڈاکٹر صدرالحق کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر صدرالحق نے اپنی اس کتاب کو اپنی رفیقۂ حیات عاصمہ نجمی کے نام معنون کیا ہے۔ ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی تاریخ وفات نہ مل سکی۔ اللہ مغفرت فرمائے!

سیّد محمد متین ہاشمی

(عالم، ادیب، محقق، صحافی)

سوانحی خاکہ

نام: سیّد محمد متین ہاشمی

سال پیدائش: ۱۹۲۵ء

مقام پیدائش: غازی پور (یوپی)

تعلیم: فارغ التحصیل دارالعلوم دیوبند

ایم۔ اے (اُردو) کراچی یونیورسٹی

پیشہ: درس و تدریس (اسکول، کالج، مدرسہ) اس سے پہلے صحافت

پہلی ہجرت: ۱۹۵۰ء۔ مشرقی پاکستان۔ سید پور

سیاسی سرگرمیاں۔ رکن جمعیت علمائے اسلام، پاکستان

رکن نظام اسلام پارٹی، پاکستان

جنرل سکریٹری۔ انجمن مہاجرین مشرقی پاکستان

دوسری ہجرت: سقوطِ ڈھاکا کے بعد۔ ۱۹۷۲ء، لاہور

آخری ملازمت: ڈائرکٹر دیال سنگھ لائبریری، لاہور

رکن اسلامی نظریاتی کونسل، پاکستان

وفات: ۱۲ رجنوری ۱۹۹۱ء (فالج کے مرض میں)

اولاد: سراج منیر غالباً ان کی اکلوتی اولاد تھے۔ عربی، اردو اور فارسی تحریر و تقریر پر ماہرانہ عبور رکھتے تھے۔ جنرل ضیاء الحق نے انھیں اسلامی نظریاتی کونسل کا چیئرمین بنادیا تھا لیکن افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور جوانی ہی میں انتقال کر گئے۔ جوان بیٹے کی موت نے ہاشمی مرحوم کو اندر سے شکستہ کردیا۔

تفصیلی حالات وکوائف

سید محمد متین ہاشمی سابق مشرقی پاکستان کے سرکردہ مہاجروں میں تھے۔ ان کی مختلف حیثیتیں تھیں۔ وہ بلند پایہ عالم، ادیب، محقق، مقرر اور سیاسی کارکن و رہنما تھے۔ پہلے وہ ایک اسکول سے بہ طور مدرس وابستہ ہوئے پھر اسی اسکول کو کالج بنوایا جو قائد اعظم کالج، سید پور کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کالج میں وہ ایک عرصے تک اُردو اور عربی پڑھاتے رہے۔ وہ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ ۱۹۴۸ء میں وہاں سے فارغ ہونے کے بعد دہلی پہنچے اور ایک اخبار ''نئی دنیا'' میں بطور جوائنٹ ایڈیٹر کام کرنے لگے۔ اسی دوران ۱۹۴۹ء میں آگرہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان بھی پاس کرلیا۔ اخبار میں کانگریسی حکومت کی پالیسیوں پر سخت تنقید کرنے کی وجہ سے ان کا دہلی میں رہنا مشکل ہوگیا، لہٰذا وہ ہجرت کر کے مشرقی پاکستان آگئے اور درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ چند سال کے بعد کراچی یونیورسٹی سے اُردو میں ایم۔ اے بھی کرلیا۔

متین ہاشمی نے سید پور میں ایک مدرسہ ''جامعہ عربیہ اسلامیہ'' بھی قائم کیا۔ اس ادارہ کے وہ صدر منتخب ہوئے اور وہاں ۱۶ سال تک علم حدیث پڑھاتے رہے۔

ہاشمی صاحب کو سیاست سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ جمعیت علمائے اسلام اور نظام اسلام پارٹی کے سرگرم رکن تھے اور پاکستان میں نظام اسلام قائم کرنے کی کوششوں میں پیش پیش رہتے تھے۔ آخری دور میں وہ ''انجمن مہاجرین مشرقی پاکستان'' کے جنرل سکریٹری بنائے گئے۔

سقوط ڈھاکا کے بعد بڑی مشکلوں سے جان بچا کر سید پور سے نکلے اور ہندوستان ہوتے

ہوئے کراچی پہنچے۔ وہاں سے لاہور آگئے۔ کچھ دنوں تک جامعہ محمدی شریف جھنگ میں پرنسپل رہے۔ اس کے بعد دیال سنگھ لائبریری کے ڈائرکٹر مقرر کیے گئے۔ یہاں انھوں نے بہت سی علمی، دینی اور تحقیقی کتابیں لکھیں اور بعض عربی کتابوں کے ترجمے کیے۔ صدر ضیاء الحق نے انھیں اسلامی نظریاتی کونسل کا رکن بھی نامزد کیا۔ ان کی تصنیف کردہ کتب کی تعداد ۳۵ سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ دو سو سے زائد مقالات رسالوں میں شائع ہوئے۔ وہ دیال سنگھ لائبریری کے علمی و تحقیقی مجلّہ سہ ماہی "منہاج" کے مدیر بھی تھے۔

اگست ۱۹۹۰ء میں ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ چند ماہ تک زیر علاج رہنے کے بعد ۱۳ر جنوری ۱۹۹۱ء کو انتقال کر گئے۔ اللہ مغفرت فرمائے!

تصانیف

ذیل میں ہاشمی مرحوم کی چند تصانیف کے نام درج کیے جاتے ہیں:

اسلامی حدود۔ تذکرہ سید ہجویریؒ۔ روشنی۔ دو قومی نظریہ۔ اسلام کا قانونِ شہادت۔ شاہ ولی اللہؒ۔ اسلامی نظامِ عدل۔ فلسفۂ اسلام۔ تفسیر سورۂ یٰسین۔ تشریح سنن ابی داود۔ مشکلات اور ان کا حل وغیرہ۔

اختر حامد خاں

(ناول نگار، خاکہ نگار، ناقد)

سوانحی خاکہ

نام: اختر حامد خاں

والد کا نام: منشی امیر احمد خاں

سالِ پیدائش: ۱۹۲۱ء

مقامِ پیدائش: میرٹھ (بھارت)

تعلیم: بی۔ ایس۔ سی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

سیاست سے وابستگی: نوجوانی میں علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک سے وابستہ رہے۔

پیشہ: ملازمت۔ تجارت (سماجی کارکن۔ رفاہِ عام کے کام)

پہلی ہجرت: ۱۹۵۳ء۔ مشرقی پاکستان۔ کومیلا

دوسری ہجرت: ۱۹۷۱ء۔ کراچی

وفات: ۲۰۰۹ء

اولاد: شادی نہیں کی

تصانیف:

گنگا جمنی میدان (ناول)۔ آئینہ (ناولٹ)

چند خاکے۔ چند بزرگ۔ نئے خاکے

میری ناکام زندگی (خودنوشت)۔ چند تبصرے

پیامِ قرآن۔ کومیلا سے اورنگی تک (ترجمہ)

تفصیلی حالات

اختر حامد خاں دورِ حاضر کے ایک ممتاز مصنف و مفکر ہیں۔ وہ ناول نگار، سوانح نگار، خاکہ نگار اور تاریخ و اسلامیات کے موضوع پر لکھنے والے ایک منفرد ادیب ہیں۔ حق گوئی اور بے باکی ان کی خصوصیت ہے۔ وہ سچائی کے علم بردار ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع اور نظر گہری ہے۔ ہمارے ادب کی یہ ایک عجیب بات ہے کہ چند افسانے یا چند بے تکے تنقیدی مضامین لکھ کر لوگ ادیب کی حیثیت سے معروف ہو جاتے ہیں اور اعلیٰ درجے کی علمی و فکری صلاحیت و بصیرت کے حامل اہلِ قلم غیر معروف رہ جاتے ہیں۔ اس میں ہمارے نام نہاد تنقید نگاروں کا بڑا ہاتھ ہے۔ ایک ادبی تقریب میں پروفیسر آفاق صدیقی نے جب اپنی تقریر کے دوران اختر حامد خاں کا نام لیا تو جلسے کے اختتام پر اُردو ادب کے ایک پروفیسر نے پوچھا کہ اختر حامد خاں کون ہیں؟ اس کے جواب میں پروفیسر آفاق صدیقی نے ''کون اختر حامد خاں؟'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھ دی جو پڑھنے کے لائق ہے اور جس میں اختر حامد خاں کی سیرت و شخصیت اور ادبی کارناموں کا سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے۔

اختر حامد خاں ۱۹۲۱ء میں میرٹھ میں ایک تعلیم یافتہ اور خوش حال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی امیر احمد خاں وہاں کورٹ انسپکٹر تھے۔ سات بھائی بہنوں (چار بھائی، تین بہنیں) کے خاندان میں ان کی پرورش ہوئی۔ وہ بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی چلے گئے۔ ۱۹۴۲ء میں بی۔ ایس۔ سی کیا اور

انجینئرنگ میں داخلہ لیا۔ لیکن خاکسار تحریک میں شامل ہونے کی وجہ سے علامہ مشرقی کے حکم پر قحط بنگال کے سلسلے میں کلکتہ جانا پڑا اور تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ وہ زندگی بھر اپنے بڑے بھائی اختر حمید خاں (۱۹۱۴ء-۱۹۹۹ء) سے وابستہ رہے۔ اختر حمید خاں خاکسار تحریک کے نمایاں لوگوں میں تھے اور وہ علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی (۱۸۸۸ء-۱۹۶۱ء) کے داماد بھی تھے۔ اختر حامد خاں اپنی خود نوشت "میری ناکام زندگی" (مطبوعہ ۲۰۰۰ء) میں بڑے حسرت آمیز انداز میں لکھتے ہیں:

"میری ناکامی کی اصل وجہ میری حد سے بڑھی ہوئی بھائی صاحب سے محبت تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں اکثر ان کے مشوروں پر عمل کیا۔ بچپن ہی سے وہ میرے ہیرو تھے۔ میں نے وہ تمام شوق اپنائے جو میرے خیال میں بھائی صاحب کے تھے۔ تعلیم میں بھی وہ میرے رہنما، دلچسپی تو ادب اور تاریخ سے تھی لیکن ان کے کہنے سے سائنس پڑھی اور تعلیم ادھوری رہ گئی۔"

خاکسار تحریک کی سرگرمیوں میں وہ اپنے بھائی اختر حمید خاں کے شریک رہے۔ میرٹھ سے انگریزی ہفت روزہ "ریڈینس" اور اُردو ہفت روزہ "الامین" نکالا۔ یہ دونوں رسالے خاکسار تحریک کے ترجمان تھے جو کئی سال تک نکلتے رہے۔ پروفیسر کرار حسین (۱۹۱۱ء-۱۹۹۹ء) بھی "ریڈینس" کی ادارت میں شامل تھے۔ ان کے قلم سے اس دور میں بڑے زوردار مضامین نکلے۔ علامہ مشرقی کی بعض پالیسیوں سے ان تینوں کو بڑی مایوسی ہوئی۔ قیام پاکستان سے کچھ قبل ہی عملی طور پر یہ تحریک ختم ہو چکی تھی۔

۱۹۴۷ء کے ہنگامی دور میں اختر حامد خاں، اختر حمید خاں کے ساتھ "جامعہ ملیہ اسلامیہ" دہلی چلے گئے۔ اختر حمید کے ساتھ وہ بھی وہاں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۴۹ء میں انھیں کے ساتھ کراچی آ گئے۔ ۱۹۵۱ء میں ڈاکٹر اختر حمید خاں "وکٹوریہ کومیلا کالج" کے پرنسپل ہو کر مشرقی پاکستان چلے گئے۔ اختر حامد خاں بھی ۱۹۵۲ء میں وہیں پہنچ گئے۔ وہاں اپنے بھائی صاحب کے قائم کردہ رفاہی و فلاحی اداروں کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکا سے چند ماہ قبل وہ اپنے برادر

بزرگ کے ساتھ کراچی آ گئے۔ یہاں ڈاکٹر صاحب نے "اورنگی پائلٹ پرجیکٹ" کا آغاز کیا تو اس کے لیے انھوں نے ایک عرصے تک کام کیا۔ اس دوران ان کی تحریر و تصنیف کا سلسلہ بھی جاری رہا اور ان کی متعدد کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں۔ آخر میں کئی سال تک گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے کے بعد ۲۰۰۹ء کے آخری مہینوں میں ۸۸ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اللہ مغفرت فرمائے۔ انھوں نے شادی نہیں کی اور بھائی کی اولاد ہی کو اپنی اولاد سمجھا۔

بحیثیت ادیب و مصنف

اختر حامد خاں ایک شگفتہ نگار ادیب تھے۔ ان کے قلم میں بڑا زور دواثر تھا۔ انھوں نے اپنا رہوارِ قلم ادب کے مختلف میدانوں میں دوڑایا اور ہر جگہ فاتح و کامران رہے۔ ذیل میں ان کی تصانیف پر ایک نظر ڈالی جاتی ہے۔

"گنگا جمنی میدان"

اختر حامد خاں نے "گنگا جمنی میدان" کے نام سے ایک ایسا ناول لکھا ہے کہ اگر وہ کچھ اور نہ لکھتے تو بھی ان کا نام اردو ادب میں زندہ جاوید ہوتا۔ اس ناول میں ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۷ء تک ہندوستان کی سیاسی و ثقافتی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ تحریکِ آزادی، سیاسی جماعتوں کی کشمکش، سیاسی شخصیات اور ان کی رنگا رنگیاں سب اس میں جلوہ گر ہیں۔ یہ ناول عام ناولوں سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں ایک جملہ بھی خلافِ حقیقت یا زیبِ داستاں کے طور پر نہیں۔ یہ ناول اس دور کی سچی تاریخ بھی ہے اور مصنف کی خود نوشت بھی اور دلچسپی میں عام ناولوں سے بڑھ کر۔ علی گڑھ کے تعلیمی، ثقافتی اور سیاسی ماحول کی عکاسی بھی خوب کی گئی ہے۔ خاکسار تحریک کی تاریخ لکھنے والوں کو اس ناول کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ اندازِ بیان تو ایسا ہے کہ "وہ کہیں اور سنا کرے کوئی"۔ بے شک یہ خدائی عطیہ ہے، وہ جسے چاہے نواز دے۔

سچ تو یہ ہے کہ "گنگا جمنی میدان" جیسا ناول اُردو میں کوئی اور نظر نہیں آتا۔ اس میں شک

نہیں کہ فضل احمد کریم فضلی کا ناول "خونِ جگر ہونے تک" (۱۹۵۷ء) میں بھی تمام تر حقیقت (قحطِ بنگال) کی عکاسی کی گئی ہے اور فضلی کے منجھے ہوئے شاعرانہ قلم نے اس میں منظر نگاری کے خوب صورت گل بوٹے بھی کھلائے ہیں۔ میری نظر میں یہ اُردو کا بہترین ناول ہے۔ اس کے باوجود "گنگا جمنی میدان" میں جو بات ہے وہ کچھ اور ہی ہے۔ قرۃ العین حیدر کا "آگ کا دریا" (۱۹۵۹ء) ہمارے تنقید نگاروں کی نظر میں اُردو کا عظیم ترین ناول ہے۔ اس ضخیم ناول میں مصنفہ نے ہندوستان کی ڈھائی ہزار سالہ تاریخ پیش کی ہے۔ افکار و نظریات سے قطعِ نظر اس میں شک نہیں کہ فنی لحاظ سے یہ ایک بڑا ناول ہے لیکن اس میں دلچسپی کی بڑی کمی نظر آتی ہے۔ اس کی تعریف و توصیف کرنے والوں میں کتنے ہیں جنھوں نے اس ناول کو پورا پڑھا ہے۔ "گنگا جمنی میدان" میں جو دلچسپی اور پُرکاری ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

پروفیسر سحر انصاری اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں:

"(اختر حامد خاں) ناول کے فن کو اس کے تاریخی اور ادبی تناظر میں برتنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ اس لیے ایک ایسے موضوع کو جو تاریخ کے ابواب کا حصہ ہو سکتا ہے، اختر حامد خاں نے ایک دلچسپ اور اثر انگیز ناول میں تبدیل کر دیا۔"

("کون اختر حامد خاں۔" ص: ۱۷۷)

"گنگا جمنی میدان" ۱۹۵۲ء میں لکھا گیا۔ ۱۹۵۹ء میں شاہد احمد دہلوی نے ماہنامہ "ساقی" کراچی کے سالنامہ میں اسے مکمل پیش کیا۔ ۱۹۸۳ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا اور ۱۹۹۹ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن چھپا۔ ۲۰۰۲ء میں اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا۔

"آئینہ" (ناولٹ) اختر حامد خاں کا دوسرا مختصر ناول ہے جو ۱۹۳۹ء سے ۱۹۵۲ء تک کے حالات وواقعات پر مشتمل ہے۔ اس کا پس منظر کراچی اور اس کے مضافات ہیں۔ یہ ناولٹ بھی پہلی بار "ساقی" کے مذکورہ سالنامے میں شائع ہوا۔ بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ یہ ناول بھی دلچسپ اور تاریخی و ثقافتی حقائق کا ترجمان ہے۔

خاکے

اختر حامد خاں کو خاکہ نگاری میں بھی کمال حاصل ہے۔ وہ بڑے دلچسپ اور پُر اثر خاکے لکھتے ہیں۔ شخصیت کی اصل خوبیوں اور خامیوں کو بڑی خوبی سے اجاگر کرتے اور معنی خیز جملوں اور فقروں سے ناگفتنی کو بھی گفتنی بنا دیتے ہیں۔ ان کے حسب ذیل تین خاکوں کے مجموعے شائع ہوئے۔

''چند خاکے'' (۱۹۷۰ء)۔ ''چند بزرگ'' (۱۹۸۲ء) اور ''نئے خاکے'' (۱۹۹۹ء)۔ ان کتابوں کی بڑی پذیرائی ہوئی اور ان کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔

''میری ناکام زندگی''

اختر حامد خاں نے اپنی مختصر خودنوشت ''میری ناکام زندگی'' کے نام سے لکھی۔ یہ کتاب بھی اپنا مخصوص انداز اور تیکھا پن لیے ہوئے ہے۔ پروفیسر آفاق صدیقی اور دیگر مصنفین نے اس نام سے اختلاف کیا ہے کہ اختر حامد خاں کی سیرت و شخصیت اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کے پیش نظر ان کی زندگی کو ناکام نہیں کہا جاسکتا۔ یہ بات بڑی حد تک درست ہے۔ لیکن زندگی کی بعض خواہشات اور آرزوئیں ایسی ہوتی ہیں جو انسان کو اندر ہی اندر گھلاتی رہتی ہیں۔ اختر حامد نے اپنی ناکام زندگی کی وجہ بڑے بھائی اختر حمید کے ساتھ ضرورت سے زیادہ وابستگی قرار دی ہے (اقتباس مضمون کے شروع میں دیا جاچکا ہے)، رہی ادھوری تعلیم پر اظہار افسوس تو یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ وہ علی گڑھ کے سائنس گریجویٹ ہیں۔ علم و مطالعہ اتنا وسیع ہے کہ بہت سے پی ایچ ڈی ان سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

''چند تبصرے''

اختر حامد خاں میں بڑی اچھی ناقدانہ صلاحیت ہے۔ انھوں نے مختلف ادیبوں اور کتابوں پر وقتاً فوقتاً جو تبصرے کیے ہیں ان میں بھی ایک نیا انداز نمایاں ہے۔ ان کے تبصروں کا ایک مجموعہ

"چند تبصرے" کے نام سے ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔

"پیامِ قرآن"

اختر حامد خاں ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہیں اور عملی لحاظ سے شریعت کے پابند ہیں۔ وہ شرک و بدعت (جو مسلمانوں میں پھیلی ہوئی ہے) کے خلاف ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسلمان صحیح اسلام کو سمجھیں اور اس پر کاربند ہوں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ قرآنی تعلیمات کو کافی وشافی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا کئی سال کی محنت کے بعد انھوں نے "پیامِ قرآن" کے نام سے ایک کتاب لکھی اور قرآنی آیتوں کے آسان اور عام فہم ترجموں کے ذریعہ اسلامی زندگی کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۲۰۰۲ء میں اور دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا۔

تراجم

اختر حامد خاں کو انگریزی تحریر و تقریر پر بھی عبور حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر اختر حمید خاں کی انگریزی کتاب "کومیلا سے اورنگی تک" کا ترجمہ بڑی خوبی اور روانی سے کیا اور جا بجا اس میں نوٹس بھی لکھے۔ یہ ایک اہم معلوماتی کتاب ہے۔

اختر حامد کے اس قول پر میں یہ مضمون ختم کرتا ہوں:

"قائم رہنے والا ادب صرف وہ لوگ تخلیق کرتے ہیں جن کے اندر ایمان اور عمل کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے، جو اپنے خیالات میں کھو جاتے ہیں اور جن کے خیالات ان کی زندگی بن جاتے ہیں۔"

("گنگا جمنی میدان۔" ص: ۱۳۲)

❖❖

رفیع احمد فدائی

(صحافی، افسانہ نگار، کالم نگار، مترجم، شاعر)

سوانحی خاکہ

قلمی نام: رفیع احمد فدائی

نام: رفیع احمد

والد: حافظ مقبول احمد (مرحوم)

ولادت: ۱۱ر نومبر ۱۹۲۵ء

مولد: کلکتہ (مغربی بنگال۔ بھارت)

آبائی وطن: بہار (بھارت)

تعلیم: بی۔اے (کلکتہ اور ڈھاکا یونیورسٹی)

پہلی ہجرت: ۱۹۵۰ء۔ ڈھاکا

دوسری ہجرت: سقوطِ ڈھاکا کے بعد۔ کراچی

پیشہ: صحافت (۱۹۴۳ء سے وفات تک۔ کلکتہ، ڈھاکا اور کراچی کے کئی اخبارات سے وابستہ رہے۔)

وفات: ۱۸ر مئی ۱۹۸۸ء

تصانیف: تقریباً ۱۶ کتابیں اردو، بنگلہ اور انگریزی میں شائع ہو چکی ہیں

رفیع احمد فدائی (۱۹۲۵ء-۱۹۸۸ء) ایک ممتاز صحافی، کالم نگار، فکاہیہ نگار، مضمون نگار، مترجم، افسانہ نگار اور شاعر تھے۔ ایسی گوناگوں خوبیوں اور صلاحیتوں کے انسان بہت کم پائے جاتے ہیں۔ ان میں زبانوں کے سیکھنے کی فطری استعداد بھی بہت زیادہ تھی۔ وہ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی، فارسی، عربی اور بنگالی پر بھی دسترس رکھتے تھے۔

رفیع احمد فدائی کلکتہ میں ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک پاس کیا اور صحافت کے پیشے سے منسلک ہو گئے۔ کلکتہ کے علمی و ادبی ماحول میں ان کی ذہنی تربیت ہوئی۔ وہ بزرگ ادباء، شعراء اور صحافیوں سے ایک عرصے تک کسب فیض کرتے رہے۔ متعدد اخباروں "عصر جدید"، "آزاد ہند" اور "ہند" میں کام کیا۔ ترجمہ، کالم نگاری، مضمون نگاری اور افسانہ نگاری کرتے رہے۔ ۴۸-۱۹۴۷ء تک وہ ایک مستند اور معتبر صحافی اور ادیب کی حیثیت سے معروف ہو چکے تھے۔ وہ تحریکِ پاکستان اور مسلم لیگ کے حامی تھے۔ اس سلسلے میں بھی زورِ قلم صرف کیا

فدائی صاحب ۱۹۵۰ء میں کلکتہ کے فسادات کے بعد ڈھاکا آ گئے اور یہاں روزنامہ "پاسبان" سے وابستہ ہو گئے۔ ڈھاکا یونیورسٹی سے انٹر اور بی۔ اے کے امتحانات بھی پاس کیے۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ کئی بنگلہ کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جن میں "جوع العجل" (ناول) اور "جھکا تا" (افسانے) شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ بنگلہ سیکھنے کے لیے اُردو میں اور اُردو سیکھنے کے لیے بنگلہ زبان میں کتابیں لکھیں۔ یہ دوران کا بڑا مصروف اور خوش گوار دور تھا۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اپنی زندگی کا بہترین دور ڈھاکے میں گزارا۔

سقوطِ ڈھاکا کے بعد وہ مع اہل و عیال جنگی قیدیوں میں شامل ہو گئے اور تقریباً دو سال ہندوستان کی قید میں گزار کر کراچی پہنچے۔ یہاں روزنامہ "جنگ" سے منسلک ہو گئے۔ ان کی زندگی بڑی پُرمشقت ہو گئی۔ دوست احباب سب بکھر چکے تھے، جو کراچی آئے وہ بھی روزگار کی چکی میں پس رہے تھے۔ گھریلو اخراجات پورے کرنے کے لیے انھیں مختلف تحریری اور تصنیفی کام کرنے پڑتے

تھے۔فدائی صاحب نے بیویوں کی وفات کی وجہ سے غالباً تین شادیاں کیں۔وہ کثیر الاولاد تھے۔ بچوں کی پرورش وکفالت اور تعلیم وتربیت سے وہ کبھی بے پرواہ نہ ہوئے۔سخت محنت اور تفکرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ وفات سے چند سال قبل ان کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔اس حال میں بھی وہ گھر بیٹھے ہوئے کام کرتے رہے۔کئی ماہ کی طویل علالت کے بعد ۱۸ر مئی ۱۹۸۸ء کو کراچی میں انتقال کیا۔اللہ مغفرت فرمائے۔

فدائی صاحب بڑے زندہ دل، شریف النفس اور با اخلاق انسان تھے۔ہر مصیبت کو صبر و تحمل سے سہہ جاتے تھے اور کبھی کوئی شکوہ، شکایت نہ کرتے تھے۔وہ اپنے دوستوں اور رفقائے کار کے ساتھ ہمیشہ ہنستے بولتے رہتے تھے۔ان میں غرور و تمکنت نام کو نہ تھا۔ڈھاکے میں "امجدیہ ہوٹل" میں پروفیسر اظہر قادری کی نشستوں میں اکثر ان سے میری ملاقات ہو جاتی تھی۔گرمیوں میں کرتا پاجامہ اور سردیوں میں شیروانی میں نظر آتے تھے۔میں نے انھیں مغربی لباس میں کبھی نہیں دیکھا۔ پان خوب کھاتے تھے۔آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک ہوتی تھی۔ہمیشہ مسکراتے رہتے تھے۔

فدائی صاحب کی وفات کے بعد ان کے بیٹے محمد ہمایوں ظفر سلمہٗ نے (جو خود بھی ایک اچھے صحافی اور ادیب ہیں) ان کی متعدد کتابیں مرتب کر کے شائع کیں۔چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

۱۔اثاثۂ حیات۔ شعری اور نثری مجموعہ۔۱۹۹۶ء

۲۔اکیسویں صدی۔سائنسی و دیگر کہانیوں کا مجموعہ۔۱۹۹۸ء

۳۔رفیع احمد فدائی۔فن اور شخصیت۔۱۹۹۹ء

۴۔شیشہ و تیشہ۔فکاہیہ کالموں کا مجموعہ۔۲۰۰۲ء

محمود شام، ایڈیٹر روزنامہ "جنگ" کراچی "ایک فرض شناس صحافی" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"رفیع احمد فدائی ہمارے سینئر رفیقِ کار تھے۔وہ اخبار نویسوں کی اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جو ادب کے راستے صحافت میں داخل ہوتی تھی۔جس کی بنیاد انتہائی مضبوط ہوتی

تھی۔ جن کی طبیعت حساس، جن کے ذہن رسا، جن کے الفاظ پُر تاثیر ہوتے تھے۔ جو اپنے ضمیر کی آواز پر عمل کرتے تھے، جو اپنے نظریات سے عشق کرتے تھے۔

انھیں بار بار ہجرتوں کے زخم برداشت کرنا پڑے۔ لیکن قناعت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیا۔ صحافت کو کبھی منفعت کا ذریعہ نہیں بنایا۔ بچوں کے لیے انھوں نے حرف شناسی اور خودداری کے علاوہ کوئی اثاثہ نہیں چھوڑا۔

رفیع احمد فدائی صاحب سے ہم نے ہمیشہ دیانت، احساسِ فرض اور اپنی ذمہ داری سے لگن کا چلن سیکھا۔ ہفت روزہ 'معیار' اور 'جنگ' دونوں میں مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ اخبار اور رسالے کی ضروریات اور وقت کی پابندی کا انھوں نے ہمیشہ خیال رکھا۔ الفاظ پر انھیں قدرت حاصل تھی۔ غیر ملکی ادبی، سیاسی اور اقتصادی تصنیفات کو انھوں نے اردو میں منتقل کیا تو ایسا لگا کہ یہ اُردو ہی میں لکھی گئی تھیں۔"

(فلیپ ''اثاثۂ حیات۔'' مرتبہ: محمد ہمایوں ظفر)

شہزاد منظر

(افسانہ نگار، ناقد، صحافی)

سوانحی خاکہ

نام: ابراہیم عبدالرحمن عارف

قلمی نام: شہزاد منظر

تاریخ پیدائش: یکم جنوری ۱۹۳۳ء

مقام پیدائش: کلکتہ (مغربی بنگال)

تعلیم: بی۔اے

پیشہ: صحافت

پہلی ہجرت: ڈھاکا۔۱۹۶۵ء

دوسری ہجرت۔ کراچی۔ سقوط ڈھاکا سے ایک ماہ پہلے۔۱۹۷۱ء

وفات: ۱۹۹۷ء

اولاد: تین بیٹے، ایک بیٹی

شہزاد منظر مشرقی پاکستان کے ممتاز صحافیوں اور افسانہ نگاروں میں تھے۔ وہ ۱۹۳۳ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم و تربیت ہوئی۔ ۱۹۵۰ء میں صحافت کے پیشے سے منسلک ہوئے اور کلکتہ کے مختلف اخباروں میں کام کرتے رہے۔ اس دوران افسانے اور مضامین بھی لکھتے رہے۔

۱۹۶۵ء میں ترکِ وطن کر کے ڈھاکا آ گئے۔ پہلے وہ روزنامہ "پاسبان" سے وابستہ رہے، پھر ہفت روزہ "چترالی" سے منسلک ہو گئے۔

شہزاد منظر ترقی پسند نظریات کے حامل تھے۔ وہ ایک اچھے اور منفرد افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر مضامین بھی لکھے۔ قیامِ ڈھاکا کے دوران ان کے دو ناول "زندگی ایک نغمہ" ہے ہفت روزہ "چترالی" ڈھاکا اور "اندھیری رات کا تنہا مسافر" پندرہ روزہ "آہنگ" کراچی میں قسط وار شائع ہوا۔ یہ ناول ۱۹۸۳ء میں کراچی سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔

نومبر ۱۹۷۱ء میں شہزاد منظر کراچی منتقل ہو گئے۔ یہاں مختلف اخباروں میں کام کرتے رہے۔ کراچی آنے کے بعد انھوں نے ایک تنقید نگار کی حیثیت سے امتیاز حاصل کیا اور ان کے تنقیدی مضامین کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ ۱۹۹۰ء میں ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "ندیا کہاں ہے تیرا دیس" شائع ہوا۔ یہ ان افسانوں کا مجموعہ ہے جو مشرقی پاکستان کی عوامی زندگی اور المیہ سقوطِ ڈھاکا کے موضوع پر لکھے گئے۔ شہزاد منظر نے ۱۹۹۷ء میں کراچی میں کینسر کے مرض میں وفات پائی۔ اللہ مغفرت فرمائے۔ آخر میں وہ "انجمن ترقی اردو پاکستان" سے منسلک تھے۔

شہزاد منظر کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست یہاں درج کی جاتی ہے:

۱۔ جدید اردو افسانہ (تنقید) ۱۹۸۲ء

۲۔ اندھیری رات کا تنہا مسافر (ناول) ۱۹۸۳ء

۳۔ ردِ عمل (تنقید) ۱۹۸۶ء

۴۔ ندیا کہاں ہے تیرا دیس (افسانے) ۱۹۹۰ء

۵۔ علامتی افسانے میں ابلاغ کا مسئلہ (تنقید) ۱۹۹۰ء

۶۔ غلام عباس۔ ایک مطالعہ (تنقید) ۱۹۹۱ء

۷۔ سندھ کے نسلی مسائل (سیاسیات) ۱۹۹۴ء

۸۔ مشرق و مغرب کے چند مشاہیر ادبا (تنقید) ۱۹۹۶ء

۹۔ پاکستان میں اُردو تنقید کے پچاس سال (تنقید) ۱۹۹۷ء

۱۰۔ عصمت چغتائی کے دس بہترین افسانے (انتخاب و مقدمہ) ۱۹۹۷ء

۱۱۔ پاکستان میں اُردو افسانے کے پچاس سال (تنقید) ۱۹۹۷ء

۱۲۔ راجندر سنگھ بیدی کے دس بہترین افسانے (انتخاب و مقدمہ) ۱۹۹۸ء

۱۳۔ کرشن چندر کے دس بہترین افسانے (انتخاب و مقدمہ) ۲۰۰۰ء

۱۴۔ غلام عباس کے دس بہترین افسانے (انتخاب و مقدمہ) ۲۰۰۰ء

(''محفل جو اجڑ گئی'')

۱۵۔ تین شہروں کی کہانی (سفر نامہ)

۱۶۔ انجمن ترقی اُردو کی تاریخ

۱۷۔ بیدی کے دس بہترین افسانے (انتخاب و مقدمہ)

۱۸۔ قرۃ العین حیدر کے دس بہترین افسانے (انتخاب و مقدمہ)

شہزاد منظر۔ فن اور شخصیت

علی حیدر ملک اور صبا اکرام نے ''شہزاد منظر۔ فن اور شخصیت'' کے نام سے ۱۹۹۶ء میں ایک کتاب مرتب کر کے شائع کی اور اس طرح اپنے دوست کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ اس میں متعدد حضرات کے لکھے ہوئے مضامین، تبصرے اور آراء شامل ہیں۔ علی حیدر ملک اور صبا اکرام کے چند مضامین بھی ہیں۔ پروفیسر علی حیدر ملک اس کے دیباچہ ''نذرانۂ محبت'' میں کہتے ہیں:

''یہ کتاب چند دوستوں کی طرف سے اپنے ایک سینئر دوست کی خدمت میں محبت کا نذرانہ بھی ہے اور اس دورِ اشتہار بازی میں ایک بے لوث اور سچے ادیب کی خدمات کا اعتراف بھی۔''

شہزاد منظر کی بعض شخصی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر علی حیدر ملک اپنے مضمون ''کچھ یارِ شہزاد منظر کے بارے میں'' میں لکھتے ہیں:

''شہزاد کو ادب سے سچا اور گہرا لگاؤ ہے۔ یہاں ادب سے مراد صرف نثری ادب ہے۔ شاعری سے اسے مس نہیں ہے اور نہ وہ شاعری پڑھتا ہے، نثر میں وہ ہر طرح کی کتابیں پڑھتا ہے۔ افسانہ، ناول، تنقید، سوانح عمری، سفرنامہ اور تاریخ وغیرہ۔ مگر پیچیدہ اور مشکل نثر لکھنے والوں سے وہ ہمیشہ شاکی رہتا ہے۔ وہ سادہ آدمی ہے اور نثر بھی سادہ پسند کرتا ہے۔''

''شہزاد کا ایک شوق دعوتیں کرنا ہے۔ جب بھی اس کا کوئی دوست یا واقف کار باہر سے آتا ہے تو وہ اس کی دعوت ضرور کرتا ہے اور اس کے دوستوں اور واقف کاروں کی تعداد بے شمار ہے...... اے خیام کو وہ ہوٹلوں اور خورد ونوش کا ماہر سمجھتا ہے اس لیے مینو کے سلسلے میں کسی اور کی بجائے ہمیشہ اسی سے مشورہ کرے گا۔''

''شہزاد منظر اخلاص، محنت اور لگن کا نمونہ ہے اور اس نے جو کچھ حاصل کیا ہے اس خلوص، محنت اور لگن کا ثمرہ ہے..... شہزاد منظر دوستوں کا دوست اور ایک شریف انسان ہے۔ وہ ایک منفرد شخصیت کا مالک ہے اور یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ چھوٹے بڑے ہزاروں لکھنے والوں میں کوئی دوسرا شہزاد منظر موجود نہیں ہے۔''

(''شہزاد منظر۔ فن اور شخصیت۔'' ص: ۲۵، ۲۶)

بحیثیت ناقد

شہزاد منظر کی سب سے نمایاں حیثیت تنقید نگار کی ہے۔ ان میں تنقید نگاری کی فطری صلاحیت تھی۔ وہ اگرچہ نظریاتی لحاظ سے ترقی پسند تھے لیکن ان میں کسی قسم کی تنگ نظری اور تعصب نہ تھا۔ وہ ادبی روایات اور مذہبی و اخلاقی اقدار کے قائل تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع اور اسلوب دلکش تھا۔ وہ بڑے صاف و سادہ اور واضح انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اردو کے منفرد نقادوں میں تھے۔ ان کی تنقیدی کتابیں ''اردو تنقید کے پچاس سال'' اور ''اردو افسانہ نگاری کے پچاس سال'' بڑی اہم اور دلچسپ ہیں۔ ان کی ایک ضخیم اور اہم کتاب ''محمد حسن

عسکری۔ایک مطالعہ" کسی ناشر کی نذر ہوگئی۔ان کی دیگر مطبوعہ تنقیدی کتابوں کے نام یہ ہیں:
"جدید اردو افسانہ"۔"علامتی افسانے میں ابلاغ کا مسئلہ"؛"ردِ عمل"؛"غلام عباس۔
ایک مطالعہ" اور "مشرق و مغرب کے چند مشاہیر ادبا"۔
اُردو کے دیگر نقادوں اور دانشوروں کی طرح مرحوم کا دینی مطالعہ نہایت محدود تھا۔

افسانہ نگار

شہزاد منظر کی دوسری نمایاں حیثیت افسانہ نگار کی تھی۔ان کے افسانوں کا مجموعہ "ندیا کہاں ہے تیرا دیس" کے نام سے شائع ہوا۔اس کے تمام افسانوں کا تعلق مشرقی پاکستان کی دیہی اور عوامی زندگی اور المیہ سقوطِ مشرقی پاکستان سے ہے۔یہ تمام افسانے ذاتی مشاہدات و تجربات کی بنیاد پر لکھے گئے ہیں جن میں ان کا ترقی پسندانہ نظریہ بھی شامل ہے۔لیکن ترقی پسندی اور بنگالیوں کی ہر تحریک میں شمولیت کے باوجود جب بنگالی قومیت کی تحریک نسلی قومیت میں بدل گئی تو ایسے لوگوں کو بھی قتل گاہ پہنچا دیا گیا، اس لیے کہ وہ بنگلہ زبان بولنے اور لکھنے اور بنگالی کلچر اختیار کرنے کے باوجود نسلی لحاظ سے غیر بنگالی تھے۔

یہ کون نہیں جانتا کہ پاکستان اسلام اور دو قومی نظریے کی بنیاد پر عالمِ وجود میں آیا ہے۔ جب تک یہ نظریہ قائم رہے گا پاکستان بھی قائم رہے گا۔ بنگالیوں نے اس سے انحراف کیا اور ہندوستان کے ساتھ مل کر پاکستان کے ایک بازو کو کاٹ دیا۔لسانی، علاقائی اور نسلی قومیت مسلمانوں کے لیے زہرِ ہلاہل ہے۔ یہ اتحاد، یک جہتی اور تحفظ کی جڑ کاٹ دینے والی چیز ہے، جس کا آج پاکستان میں دور دورہ ہے۔اگر یہ غیر اسلامی، غیر اخلاقی اور غیر پاکستانی رویہ نہ بدلا گیا تو پھر کسی خیر کی امید نہیں۔

شہزاد منظر نے ایک ناول "اندھیری رات کا تنہا مسافر" بھی لکھا جس کی بڑی پذیرائی ہوئی۔

سیاسی تجزیہ نگار

شہزاد منظر بنیادی طور پر ایک صحافی تھے۔ ساری زندگی ان کا یہی پیشہ رہا۔ لہٰذا سیاسی تجزیہ نگاری کی حیثیت سے بھی وہ نمایاں تھے۔ انھوں نے ایک اہم کتاب ''سندھ کے نسلی مسائل'' کے عنوان سے لکھی جس میں لسانی اور نسلی قوم پرستی کے مضر اثرات کی نشاندہی کی۔ انھوں نے بڑی تفصیل سے اس مسئلے پر بحث کی ہے۔ وہ مشرقی پاکستان کی نسلی قومیت کی تحریک اور اس کے نتائج دیکھ چکے تھے، اس لیے انھیں اس جائزے میں سہولت ہوئی۔ اے خیام اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شہزاد منظر کے نزدیک افہام و تفہیم اور جمہوری طرز فکر ہی ان مسائل کا حل ہے۔ انھوں نے واضح کر دیا ہے کہ نسلی قوم پرستی کے مسئلے کو حل نہ کیا گیا تو اس کا مہلک نتیجہ بھی برآمد ہو سکتا ہے۔''
>
> (''شہزاد منظر۔ فن اور شخصیت''۔ ص:۱۸۵)

پروفیسر محمود واجد

(افسانہ نگار و ناقد)

سوانحی خاکہ

نام: سید محمد واجد ہاشمی

قلمی نام: محمود واجد

والد کا نام: سید عبدالواحد ہاشمی

تاریخ پیدائش: ۱۷؍مارچ ۱۹۳۱ء

تعلیم: ایم۔کام، ایم۔اے معاشیات

پہلی ہجرت: ۱۹۶۵ء۔ سابق مشرقی پاکستان۔ ڈھاکا

(ملازمت: قائدِ اعظم کالج، ڈھاکا)

دوسری ہجرت: سقوطِ ڈھاکا کے بعد۔ کراچی

اولاد: تین بیٹے، دو بیٹیاں

تصانیف:

۱۔ خزاں کے پھول بہار کے دن۔ افسانے۔ ۱۹۶۶ء۔ کلکتہ

۲۔ موسم کا مسیحا۔ افسانے۔ ۱۹۸۸ء۔ کراچی

۳۔ ابوالکلام آزاد۔ آثار و افکار۔ تحقیق۔ ۱۹۹۰ء۔ کراچی

۴۔ لمحہ لمحہ زندگی (فکشن)۔ ۲۰۰۲۔ کراچی

لمحہ لمحہ زندگی

"لمحہ لمحہ زندگی" پروفیسر محمود واجد کا افسانوی مجموعہ ہے۔ ان افسانوں کو انھوں نے فکشن کا نام دیا۔ یہ تمام فکشن علامتی ہیں۔ کتاب کا انتساب یہ ہے:

"فکشن میں با معنی تجربات کے نام"

گویا محمود واجد نے "با معنی تجربات" کیے ہیں۔ ان علامتی افسانوں میں کوئی بنیادی قصہ یا کہانی نہیں۔ ان فکشنوں کے موضوعات دوسری جنگ عظیم، تقسیم ہند، ہجرت مشرقی پاکستان، مشرقی پاکستان کی سیاست، سقوط ڈھاکا، دوسری ہجرت، کراچی کے سیاسی حالات وغیرہ ہیں۔ ان سب موضوعات پر علامتی انداز میں ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ بعض افسانوں میں ماضی، حال، مستقبل سب کو سمیٹ لیا گیا ہے۔ زیادہ تر فکشن مصنف کے ذاتی حالات اور افراد خاندان کے گرد گھومتے ہیں۔ جگہ جگہ قرآنی آیات اور مذہبی روایات کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف پر مذہب کے اثرات بہت زیادہ ہیں۔ چند دلچسپ اور معنی خیز عبارتیں دیکھیے:

۱۔ "سامنے وہ غار تھی جہاں سے روشنی ہوئی تھی

وہ پہاڑی بھی جس کی چوٹی پر کوئی کھڑا تھا

'لوگو!

سب کو ایسا لگا جیسے کوئی اسے مخاطب کر رہا ہو

'کیا تم اس پر یقین کرو گے جو میں پہاڑ کے اس طرف دیکھ رہا ہوں۔'

'ہاں ہمیں یقین ہے کہ تم سچ بولو گے'

سب لوگوں نے جو وہاں بھاگ کر آئے تھے یک زبان ہو کر کہا۔

(موسم کا مسیحا)

۲۔ "بار الٰہی! ہم تیرے حضور میں حاضر ہیں اور تیرا کرم دیکھ رہے ہیں۔ کل جن کی بمباری سے ہم محفوظ مقامات کی تلاش میں بھاگتے پھرتے تھے آج تو ان سے ہماری حفاظت

کروار ہا ہے۔

کل جو ہماری نمازوں میں شریک تھے آج عقوبت خانوں میں ہمارے منتظر ہیں۔ یہ کیسا کرم ہے میرے مولا! کیسا کرم۔ عجیب وقت ہے۔"

(واجبات = اثاثہ)

۳۔ "مجھے وہ لوگ عجیب لگتے ہیں جو بچوں کی سال گرہ مناتے ہیں، تالیاں بجاتے ہیں، مٹھائیاں تقسیم کرتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے شاید وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ موت کا غار اب ایک قدم اور نزدیک آ گیا ہے۔ سوتے میں بچے کی مسکراہٹ کو جنازے کے جلوس کے آہنگ کے ساتھ دیکھنا شاید کسی کو سند نہ ہو، مگر حقیقت ایسی ہی ہے۔"

(خوشبو کا ایک لمحہ)

اس مجموعے میں چندرہ فکشن اور تین افسانے ذرا روایتی انداز کے ہیں۔ شروع میں افتخار جالب، ڈاکٹر وہاب اشرفی اور جیلانی کامران کے مضامین ہیں۔ کتاب ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

"محمود واجد ایک ایسے افسانہ نگار بن کر ابھرتے ہیں کہ جو لمحہ لمحہ زندگی سے متاثر ہوتے ہیں اور اسے برت لینے میں ایک اہم فن کارانہ قوت کا ثبوت فراہم کرتے جاتے ہیں اور جب کبھی وقت اور حالات کے تحت سماجی کیف وکم پر نگاہ ڈالتے ہیں تو پھر ان کا کینوس وسیع تر ہو کر سماجی بیماریوں کو بھرپور طریقے سے سمیٹ لیتا ہے۔ لیکن یہ دونوں اپنی ایک خاص فنی چابک دستی سے کرتے ہیں، وہ محض اپنے موضوعات کو کسی طور پر نثری جامہ پہنا کر مطمئن نہیں ہو جاتے بلکہ فن اور تکنیکی طریق کے استعمال سے اپنی تخلیقات کو تازہ اور پُرکار بنا ڈالتے ہیں۔ یہ ایسا وصف ہے کہ ان کے معاصرین میں بہت کم کو حاصل ہے۔"

("لمحہ لمحہ زندگی۔" ص:۹۴)

محمود واجد ایک منفرد تنقید نگار بھی ہیں۔ انھوں نے بہت سے تنقیدی مضامین بھی لکھے۔

فکشن اور جدیدیت سے متعلق دو تنقیدی مجموعے بھی انھوں نے مرتب کر لیے تھے جو غالباً اب تک شائع نہ ہوئے۔

پروفیسر محمود واجد نے ایک بہت اہم تحقیقی کتاب ''ابوالکلام آزاد۔ آثار و افکار'' بھی لکھی ہے جسے ابوسلمان شاہجہان پوری نے اپنے دیباچے کے ساتھ شائع کی ہے۔ یہ ایک یادگار کتاب ہے۔

واجد صاحب ایک عرصے سے سہ ماہی ''آئندہ'' نکال رہے ہیں جو جدید ادب کا ترجمان ہے۔

❖❖

حسین احمد

(منفرد تنقید نگار)

سوانحی خاکہ

نام: حسین احمد

والد کا نام: سید نجم الدین احمد (مرحوم)

تاریخ پیدائش: ۵؍اکتوبر ۱۹۳۸ء

مقام پیدائش: پٹنہ (بہار)

پہلی ہجرت: تقسیم کے بعد والدین کے ساتھ ڈھاکا آئے

تعلیم: اسکول، کالج، یونیورسٹی کی تعلیم ڈھاکے میں ہوئی۔

۱۹۵۹ء میں ڈھاکا یونیورسٹی سے غالباً معاشیات میں ایم۔ اے کیا

ملازمت: ۱۹۶۲ء میں اعلیٰ ملازمت کا امتحان پاس کیا۔ اس وقت سے مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔

دوسری ہجرت: سقوط ڈھاکا سے پہلے ان کا تبادلہ مغربی پاکستان ہو چکا تھا۔

ریٹائرمنٹ: ۱۹۹۸ء میں ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔

اولاد: دو بیٹے، دو بیٹیاں۔

کتابیں: ا۔ ''تنقیدی جائزے'' حصہ اول ۔ ۲۰۰۱ء کراچی

۲۔ ''تنقیدی جائزے'' ۔حصہ دوم ۔۲۰۰۲ء۔ کراچی

تحسین احمد اگرچہ ادب کے طالب علم نہ تھے لیکن انھیں اردو شعر و ادب سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ تاریخ اور انگریزی ادب کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے مضمون نویسی اور انگریزی افسانوں کے ترجمے کرنے لگے تھے۔ ان کے تنقیدی مضامین زیادہ تر ماہنامہ ''ساقی''، کراچی (مدیر شاہد احمد دہلوی) میں شائع ہوتے رہے۔

تحسین احمد ڈھاکے کی مخصوص ادبی نشستوں اور مشاعروں میں بھی شریک ہوتے رہے۔ پروفیسر نظیر صدیقی، عطاء الرحمٰن جمیل اور محبوب خزاں ان کے دوستوں میں تھے۔ (محبوب خزاں سرکاری ملازم تھے۔ کراچی سے ان کا تبادلہ ڈھاکا ہو گیا تھا۔ اس طرح ڈھاکے میں وہ ایک عرصے تک قیام پذیر رہے۔ ''محفل جو اجڑ گئی'' میں ان کا ذکر کیا جا چکا ہے)

''تنقیدی جائزے'' ۔حصہ اوّل و دوم

تحسین احمد صاحب کے تنقیدی مضامین کے دو مجموعے ''تنقیدی جائزے'' حصہ اوّل اور ''تنقیدی جائزے'' حصہ دوم ۲۰۰۱ء اور ۲۰۰۲ء میں کراچی سے شائع ہوئے۔ ان مجموعوں میں نصف سے زیادہ مضامین مشرقی پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں سے متعلق ہیں۔ احسن احمد اشک، محبوب خزاں، عطاء الرحمٰن جمیل اور نظیر صدیقی ان کے پسندیدہ شاعروں میں تھے۔ خاص طور پر نظیر صدیقی کی تنقید نگاری اور ادبی کارناموں کے وہ بڑے مداح تھے۔ ان چاروں پر ان کے کئی مضامین ان دونوں مجموعوں میں شامل ہیں۔

تحسین احمد کی نظر میں بھارت کے شعرا میں فراق گورکھپوری، جمیل مظہری، کلیم عاجز، نشور واحدی اور اختر الایمان وغیرہ زندہ رہنے والے شاعروں میں تھے۔ وہ کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری کے بھی بڑے قائل تھے۔ انھوں نے ان سب پر اظہار خیال کیا ہے۔ ''تنقیدی جائزے'' کا حصہ اوّل ۱۲۶ صفحات اور حسب ذیل دس مضامین پر مشتمل ہے:

اردو شاعری تقسیم کے بعد۔ اردو تنقید عہدِ حاضر میں۔ کچھ نہیں ہے تو یہی کیوں ہے۔ اردو شاعری مشرقی پاکستان میں۔ کلیم الدین احمد۔ جمیل مظہری کی شاعری۔ پروین شاکر۔ حسرت اظہار...... نظیر صدیقی کی شاعری کا ایک جائزہ۔ حاصلِ سفر (ذکی آذر کا مجموعہ)

حصہ دوم ۱۸۲ صفحات اور حسب ذیل ۱۳ مضامین پر مشتمل ہے:

نظیر صدیقی۔ محبوب خزاں، عہدِ حاضر کا ایک اہم شاعر۔ کلیم عاجز، عہدِ حاضر کا ایک منفرد شاعر۔ "خوشبو" سے "انکار" تک۔ فسانۂ خورشیدی، انیسویں صدی کا ایک فکر انگیز اور دلچسپ ناول۔ سابقہ مشرقی پاکستان کے اُردو شعرا۔ سابقہ مشرقی پاکستان میں اُردو افسانہ نگاری۔ اردو ادب میں انتخاب کی اہمیت۔ جدہ میں مقیم چند شعرا کے کلام کا ایک مختصر جائزہ۔ "امیر نامہ" کا جائزہ اور اس کے مصنف کا ایک مختصر تعارف۔ کچھ جاوید وارثی مرحوم کے بارے میں۔ "گزرگاہِ خیال" پر ایک نظر۔

افکار و نظریات

ان مضامین سے چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں تاکہ ناقد کا اندازِ تحریر اور افکار و نظریات واضح ہو جائیں۔

۱۔ "میراجی اور راشد دونوں ہی تقسیم سے پہلے اُردو شاعری میں جانے پہچانے جاتے تھے۔ یہ عجیب سی بات ہے کہ ان شعراء کا کوئی اہم کارنامہ اردو شاعری میں نہیں اور نہ ان کے یہاں اچھی شاعری کی کوئی مثال ملتی ہے۔ پھر بھی ان کا اثر تقسیم کے بعد کے شعرا پر زبردست رہا۔"

("تنقیدی جائزے۔" حصہ اوّل۔ ص: ۱۷)

۲۔ "اُردو نقاد سچ بولنا نہیں چاہتے۔ وہ کھل کر کسی موضوع پر اپنی رائے ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔ یہ بات نہیں کہ وہ سچ نہ بولنے کے اثرات سے واقف نہیں، وہ سمجھتے ہیں اور

خوب سمجھتے ہیں لیکن ان میں انصاف کا جذبہ نہیں۔"

(ایضاً۔ص:۳۵)

۳۔ "ترقی پسند نقاد ادب کو مارکس اور اینگلز کے نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ صرف ان فن کاروں کے فن کی داد دیتے ہیں جو ان کے مقصد اور مسلک سے وابستہ ہیں اور وہ صنفِ ادب جو ان کے مخصوص نظریے پر پوری نہیں اترتی وہ انھیں فرسودہ اور ناقص نظر آتی ہے۔ سردار جعفری، عزیز احمد سے صرف اس لیے خفا ہو گئے کہ عزیز احمد اپنی تنقیدی تحریروں کو مخصوص نظریۂ فکر تک محدود نہیں رکھ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جعفری نے بڑے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ دیا کہ 'عزیز احمد کے تنقیدی زاویے ٹیڑھے ہیں'۔"

(ایضاً۔ص:۳۹)

❖❖

محی الدین نواب

(افسانہ نگار، ناول نگار)

نام نواب محی الدین اور قلمی نام محی الدین نواب ہے۔ والد کا نام شہاب الدین، آبائی وطن اور جائے پیدائش کھڑ گپور (مغربی بنگال) ہے۔ ۱۹۴۷ء میں سید پور (مشرقی پاکستان) آ گئے۔ یہیں سے میٹرک پاس کیا۔ تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور کمرشیل آرٹسٹ کا پیشہ اختیار کیا۔

محی الدین نواب نے ۱۹۵۶ء سے افسانہ نگاری کا آغاز کیا اور بہت جلد افسانہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ ان کے افسانے پاکستان کے موقر جریدوں میں شائع ہوتے رہے۔ اس دور میں ان کا ایک افسانہ "گڑیا رانی" بہت مشہور ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ سید پور سے ڈھاکا منتقل ہو گئے۔

محی الدین نواب ۱۹۶۹ء میں کراچی آ گئے۔ یہاں انھوں نے متعدد ناول لکھے۔ کئی سال تک لاہور میں قیام رہا۔ گزشتہ چند سال سے وہ زیادہ تر ڈائجسٹوں میں لکھنے لگے تھے۔ افسانوں کے دو مجموعے "ایمان کا سفر" اور "کچرا گھر" شائع ہو چکے ہیں۔ ("محفل جو اجڑ گئی")

محی الدین نواب نے ڈائجسٹوں میں طویل افسانے اور قسط وار ناول لکھ کر کافی شہرت و مقبولیت حاصل کر لی اور مالی لحاظ سے بھی خوش حال ہو گئے۔ انھوں نے تین شادیاں کیں اور تینوں بیویوں سے اولاد بھی ہیں۔

''ایمان کا سفر''

ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''ایمان کا سفر'' میرے پیش نظر ہے یہ مجموعہ ۵۲۸ صفحات پر مشتمل ہے اور بہت ہی خراب اخباری کاغذ پر چھاپا گیا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ کتاب پر کہیں سن اشاعت درج نہیں۔ اسی طرح افسانوں کی فہرست بھی نہیں دی گئی۔ مصنف نے بھی اپنی کتاب پر کوئی دیباچہ وغیرہ نہیں لکھا۔ ''حرف اوّل'' کے عنوان سے دو صفحوں کا ایک مختصر دیباچہ ہے جو معراج رسول نے لکھا ہے۔ اس مختصر دیباچے سے محی الدین نواب کے حالات وکوائف اور ان کی تخلیقات پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے۔ چند اقتباسات دیکھیے:

۱۔ ''محی الدین نواب ایک زندہ اور روشن ادب پیش کرنے والے قلم کار کا نام ہے۔ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جہاں جہاں اردو زبان کی کہانیاں پڑھی جاتی ہیں وہاں محی الدین نواب کو لوگ پڑھتے اور یاد رکھتے ہیں۔ اگرچہ زیر نظر کہانیاں پچھلے پانچ سالوں کے دوران ماہ بہ ماہ شائع ہو چکی ہیں تاہم کتابی صورت میں انھیں محفوظ کیا جا رہا ہے۔ آئندہ نسلیں کہانیوں کے اس البم کو کھول کر پچھڑے دور کے مزاج کو سمجھ سکیں۔''

۲۔ ''نواب نے اپنی عمر کے پچاس برس گزارے ہیں۔ نصف صدی کا چہرہ دیکھا ہے۔ زندگی کے بے شمار طمانچے کھائے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم، قحطِ بنگال اور قیام پاکستان ایسے تاریخی موڑ آئے۔ جب وہ آگ اور خون کے دریاؤں سے گزرتا رہا۔ ان حالات میں آدمی ضرورت سے زیادہ سنجیدہ اور خشک مزاج ہو جاتا ہے لیکن نواب کی تحریر کی شوخیاں شاہد ہیں کہ وہ کانٹوں کے بستر سے گلاب کی شوخی، رنگا رنگی اور خوشبو نچوڑتا ہے اور اسے پڑھنے والوں تک پہنچاتا ہے۔''

۳۔ ''نواب کے پاس نہ خیالات کی کمی ہے نہ الفاظ کی۔ مضامین کی کثرت نے نواب کو ٹیپ ریکارڈر کا سہارا لینے پر مجبور کیا۔ لکھتے لکھتے نواب کا ہاتھ تھک جاتا ہے اور انگلیاں دُکھنے لگتی ہیں۔ لیکن خیالات کی فراوانی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ میری دانست میں نواب اُردو کا وہ

واحد مصنف ہے جو اپنی کہانی ٹیپ ریکارڈر پر ٹیپ کرتا ہے اور اس ٹیپ سے یہ کہانیاں صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوتی ہیں۔''

اس کتاب کے شروع میں افسانوں کی کوئی فہرست درج نہیں کی گئی۔ اس میں حسب ذیل دس افسانے شامل ہیں:

ایمان کا سفر۔ چور رشتہ۔ سدا سہاگن۔ میٹھا زہر۔ آئینہ خانہ۔ آدمی کا باپ۔ شیشوں کا مسیحا۔ جزیرے کی چاندنی۔ ممتا کی واپسی۔ کلی کا کفن

یہ تمام افسانے ضرورت سے زیادہ طویل ہیں۔ پہلا افسانہ ''ایمان کا سفر'' ۱۰۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ بھی اکثر افسانے چالیس پچاس صفحات سے کم نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈائجسٹ کے تقاضوں کے تحت افسانے کو غیر ضروری طور پر طول دیا جا رہا ہے۔ ایسی حالت میں افسانوں کو فنی لحاظ سے جو زک پہنچتا ہے، وہ ظاہر ہے۔ جو لوگ محض روپیہ کمانے کے لیے سستا اور غیر معیاری ادب پیش کرتے ہیں وہ ادب اور ادیب دونوں پر ظلم کرتے ہیں۔

اُمِ عمارہ

(افسانہ نگار، ناول نگار)

اُمِ عمارہ مشرقی پاکستان کی ممتاز خاتون افسانہ نگار تھیں۔ وہ ۱۹۴۱ء میں ضلع گیا کے ایک گاؤں (سوگاؤں) میں، جہاں ان کی نانیہال تھی، پیدا ہوئیں۔ آبائی وطن پٹنہ ہے۔ ان کے والد ریلوے میں ملازم تھے، تقسیم کے بعد ہی ۱۹۴۷ء میں مشرقی پاکستان آگئے۔ اُمِ عمارہ کی تعلیم و تربیت وہیں ہوئی۔ انھوں نے ڈھاکا یونیورسٹی سے ۱۹۶۳ء میں اُردو میں ایم۔ اے کیا اور سرکاری کالج سے وابستہ ہوگئیں۔ ان کے افسانے ہندو پاکستان کے موقر جریدوں میں شائع ہوتے رہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے انھوں نے اپنا مقام بنا لیا تھا۔

اُم عمارہ ترقی پسند نظریات کی حامل تھیں۔ وہ ڈھاکا کی ادبی محفلوں اور خاص طور پر ''انجمن ادب'' کی نشستوں میں شریک ہوتی رہیں۔ مشہور صحافی صلاح الدین محمد کی وہ چھوٹی ہمشیرہ تھیں۔ قیام لاہور میں ہے۔ چند سال قبل ان کا ایک ناول ''روشنی قید ہے'' اور افسانوں کے دو مجموعے ''آگہی کے ویرانے'' اور ''درد روشن ہے'' لاہور سے شائع ہوئے۔ ایک ناول ''کیا کیا رنگ محبت کے ہیں'' زیر ترتیب ہے۔ (''محفل جو اجڑ گئی'')

افسوس کہ اُمِ عمارہ کی کوئی کتاب مجھے دستیاب نہ ہوسکی۔ مشرقی پاکستان کی خواتین افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ شہرت انھوں نے ہی حاصل کی۔ انھوں نے بہت کم عمری میں افسانہ نگاری شروع کردی تھی۔ ابھی وہ انٹر میں تھیں کہ ان کے افسانے شائع ہونے لگے۔

اُم عمارہ بڑی ذہین اور زیرک تھیں۔ بچپن ہی سے انھوں نے معاشرتی اور گھریلو زندگی کا گہرا مشاہدہ کیا تھا اور نفسیاتی تجزیہ کی صلاحیت بھی ان میں اعلیٰ درجے کی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے اکثر افسانے دلچسپ اور معیاری ہیں۔ انھیں عورتوں کی زبان اور محاوروں پر خاص طور پر عبور حاصل ہے۔ جزئیات نگاری، مکالمہ نگاری، منظر کشی اور کردار کی عکاسی میں انھیں کمال حاصل ہے۔ عصمت چغتائی کی طرح وہ کچھ بیباک بھی ہیں۔

جب میں ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو و فارسی میں ایم۔ اے کا طالب علم تھا، اُم عمارہ نے اُردو آنرز میں داخلہ لیا۔ اس طرح تقریباً دو سال تک ان سے تقریباً روز کا ملنا جلنا رہا۔ وہ بڑی صاف گو، کھری اور زندہ دل طالبہ تھیں۔ خوب بولتی اور قہقہے لگاتی تھیں۔ اپنے خیالات کا برملا اظہار کرتی تھیں لیکن ہمیشہ تہذیب و شائستگی کے دائرے میں رہتی تھیں۔ ان میں محبت اور ہمدردی کے جذبات بھی نمایاں تھے۔ ۱۹۶۳ء میں ایم۔ اے کرنے کے بعد وہ ایڈن گرلس کالج میں پڑھانے لگیں۔

اُم عمارہ اپنے بڑے بھائی صلاح الدین محمد کے ساتھ سقوطِ ڈھاکا کے بعد نیپال ہوتے ہوئے پاکستان آ گئیں۔ یہاں بھی درس و تدریس کے شعبے سے منسلک رہیں۔ شادی بھی ہوئی لیکن اولاد نہ ہونے کی وجہ سے کئی سال کے بعد علاحدگی ہو گئی۔ یہاں بھی لکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ دو افسانوی مجموعے اور ایک ناول شائع ہوا۔ دوسرا ناول بھی لکھ رہی تھیں، معلوم نہیں اس کا کیا ہوا۔ وہ کراچی آتی رہتی ہیں۔ ان کے اعزاز میں ادبی نشستیں بھی ہوتی ہیں۔

صلاح الدین محمد

چند روز پہلے اُم عمارہ کے بڑے بھائی صلاح الدین محمد کا ۷ر اکتوبر ۲۰۱۱ء کو لاہور میں انتقال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ وہ مشرقی پاکستان کے ممتاز ترقی پسند صحافی اور شاعر تھے۔ انھوں نے ڈھاکا یونیورسٹی سے ۱۹۵۷ء میں اردو میں ایم۔ اے کیا تھا۔ اس کے بعد صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ زیادہ تر انگریزی اخباروں سے منسلک رہے۔ غالباً ۱۹۶۴ء میں جب ڈھاکے میں

پاکستان فیچر سنڈیکیٹ قائم ہوا تو وہ اس کے نگراں بنائے گئے۔ مشرقی پاکستان جرنلسٹ یونین کے وہ صدر بھی رہے۔ ایوب خاں کے زمانے میں جب رائٹرز گلڈ قائم ہوا تو اس میں بھی پیش پیش رہے۔ وہ بڑے متحرک اور فعال انسان تھے۔ انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں پر انھیں عبور حاصل تھا۔ اچھے شاعر بھی تھے۔ زیادہ تر آزاد نظمیں اور کبھی کبھی غزل لکھتے تھے۔ ایک ادبی تنظیم "انجمنِ ادب" قائم کی تھی جس کی ماہانہ نشستیں پابندی سے ہوتی تھیں۔ صلاح الدین محمد ادیب سے زیادہ ادیب گر تھے۔ انھوں نے بہت سے نوجوانوں کو ادیب اور صحافی بنا دیا۔

صلاح الدین محمد اور مشرقی پاکستان کے دیگر ترقی پسند اُردو ادیبوں نے بنگالی قوم پرستوں کی ہر تحریک کا ساتھ دیا۔ بنگلہ زبان کو پاکستان کی سرکاری زبان بنانے کی تحریک چلی تو یہ ان کے ساتھ تھے۔ مسلم قومیت (جس کی بنیاد پر پاکستان قائم ہوا) کے مقابلے میں بنگالی قومیت کو پروان چڑھانے میں بھی یہ ان کے شریک رہے۔ لیکن ۱۹۷۱ء میں جب غیر بنگالیوں کا قتل عام شروع ہوا تو مکتی باہنی والوں نے صلاح الدین محمد اور ان جیسے دیگر ترقی پسندوں اور عوامی لیگ کے اردو بولنے والے حامیوں کو بھی نہیں چھوڑا۔ اس لیے کہ وہ نسلی لحاظ سے بنگالی نہیں "بہاری" تھے۔ کیا یہ عبرت کا مقام نہیں؟ بہر حال سقوطِ ڈھاکا کے بعد ہی صلاح الدین محمد اپنے گھر والوں کے ساتھ کسی طرح نیپال پہنچ گئے اور وہاں سے لاہور آ گئے۔ لاہور آنے کے بعد انھوں نے شعر و ادب اور صحافت و سیاست سے قطع تعلق کر لیا (کبھی کبھی نظمیں کہہ لیتے تھے)۔ ان کے خواب اور آدرش چکنا چور ہو چکے تھے۔ یہ ایک بڑا دھچکا تھا جوان کی شخصیت کو لگا۔ حصولِ معاش کے لیے وہ کاروبار کرنے لگے۔ ان کی اہلیہ بانو اختر شہود (افسانہ نگار) ایک کالج میں پڑھانے لگیں۔ اس طرح تقریباً چالیس سال کا عرصہ گزر گیا۔ بچے پڑھ لکھ کر جوان ہو گئے۔

وفات کے وقت صلاح الدین محمد کی عمر تقریباً ۸۰ سال تھی۔ اللہ مغفرت فرمائے۔!

❖❖

شاہد کامرانی

("ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی")

سوانحی خاکہ

نام: محمد شاہد

قلمی نام: شاہد کامرانی

تاریخ پیدائش: ۱۷ر جنوری ۱۹۴۰ء (میٹرک سرٹیفکیٹ کے مطابق یکم فروری ۱۹۴۲ء)

جائے پیدائش: پٹنہ (بہار)

پہلی ہجرت: قیام پاکستان کے فوراً بعد۔ والد ریلوے میں تھے۔ قیام سید پور میں رہا۔

تعلیم: میٹرک قائدِ اعظم ہائی اسکول، سید پور۔ ۱۹۵۸ء

انٹر: ٹی اینڈ ٹی کالج، ڈھاکا، ۱۹۶۷ء

بی۔ اے آنرز (اُردو)، ڈھاکا یونیورسٹی۔

(آخری سال کا امتحان ۱۹۷۱ء میں منسوخ کر دیا گیا)

ایم۔ اے (صحافت) کراچی یونیورسٹی۔ ۱۹۸۲ء

پیشہ: صحافت۔ ریڈیو اور ٹی وی سے بھی تعلق رہا۔

دوسری ہجرت: ۱۹۷۱ء سقوطِ ڈھاکا سے چند ماہ پہلے۔ کراچی

وفات: ۱۹۹۳ء۔ کراچی

اولاد: متعدد بیٹے اور بیٹیاں۔

تصانیف: ۱۔ بے انت سفر (افسانوں کا مجموعہ)۔۱۹۹۲ء

۲۔ سندھ کا منظر نامہ (سیاسی تجزیہ) ۱۹۸۸ء

شاہد کامرانی مشرقی پاکستان کے معروف افسانہ نگاروں اور صحافیوں میں تھے۔ وہ بچپن میں اپنے والدین کے ساتھ سید پور آئے اور ان کے لڑکپن اور نوجوانی کا زمانہ وہیں گزرا۔ ابھی اسکول میں تھے کہ مضامین اور کہانیاں وغیرہ لکھنے لگے تھے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد (۱۹۵۸ء) اخباروں میں رپورٹنگ وغیرہ کرنے لگے۔ کچھ عرصے کے بعد ڈھاکا آگئے اور صحافت سے منسلک ہو گئے۔ ڈھاکا کے متعدد اخباروں میں کام کرتے رہے۔ آخری دور میں ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو وفارسی میں بی۔ اے آنرز اُردو داخلہ لیا لیکن ۱۹۷۱ء میں آخری سال کا امتحان منسوخ کر دیا گیا۔ ایک ضخیم ادبی رسالہ "دائرہ" بھی نکالا جس کا ایک ہی شمارہ نکل سکا۔

شاہد کامرانی معاشی طور پر کبھی خوش حال نہ رہے۔ شادی بھی نوعمری میں ہوگئی تھی۔ ان کی ساری زندگی معاشی تنگ ودو میں گزر گئی۔ اس کے باوجود ان میں حصول علم کا لگن بھی شدید تھا۔ صبح سے رات تک تھکا دینے والی ملازمتوں کے باوجود ان کے لکھنے پڑھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ سقوطِ مشرقی پاکستان سے چند ماہ پہلے تک وہاں جو کچھ ہوا اور جو المیۂ عظیم گزرا وہ اس کے چشم دید گواہ تھے۔ جس کی تفصیل انھوں نے اپنی کتاب "سندھ کا منظر نامہ" اور "بے انت سفر" میں پیش کیا ہے۔ اس عالیہ نے انھیں اندر سے بہت گھائل کر دیا تھا۔ وہ جب تک زندہ رہے ان کا دل خون کے آنسو روتا رہا۔

سقوطِ ڈھاکا سے کچھ پہلے ۱۹۷۱ء میں کراچی آگئے۔ یہاں بھی وہ مختلف اخباروں سے وابستہ رہے اور ریڈیو اور ٹی وی سے بھی۔ ٹی وی میں انھیں باقاعدہ ملازمت بھی مل گئی تھی۔ زندگی نے انھیں زیادہ مہلت نہ دی اور وہ ۱۹۹۴ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اللہ مغفرت فرمائے۔!

شاہد کامرانی محض ایک صحافی نہ تھے بلکہ وہ ایک مفکر اور دانشور بھی تھے۔ اس کا جیتا جاگتا

ثبوت ان کی تصنیف ''سندھ کا منظر نامہ'' ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے قرآن اور دینی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا۔ قوموں کے عروج و زوال پر غور بھی کیا تھا۔ سقوطِ ڈھاکا کی عبرت خیز مثال ان کے سامنے تھی۔ وہ روتے بھی رہے اور رُلاتے بھی رہے۔ سنگین قومی اور ملکی مسائل کی نشاندہی بھی کی اور ان کے حل کی تجویزیں بھی پیش کرتے رہے لیکن ع کون سنتا ہے فغانِ درویش۔

''بے انت سفر''

''بے انت سفر'' شاہد کامرانی کے افسانوی مجموعے کا نام ہے جو ۱۹۹۲ء میں کراچی سے شائع ہوا جس میں ۲۲ افسانے ہیں۔ زیادہ تر افسانے سقوطِ مشرقی پاکستان کے متاثرین سے متعلق ہیں۔ اس سے پہلے مسعود مفتی کا اسی موضوع پر افسانوں کا مجموعہ شائع ہو چکا تھا لیکن ان افسانوں میں وہ سوز و درد نہیں جو شاہد کامرانی کے افسانوں میں ہے۔ شاہد کامرانی کے اس مجموعے کی اشاعت کے کئی سال بعد (۲۰۰۲ء) جمیل عثمان کے افسانوں کا مجموعہ ''جلاوطن کہانیاں'' شائع ہوا جو اسی موضوع پر ہے۔ یہ مجموعہ بہت مشہور ہوا۔

''بے انت سفر'' ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ بعض افسانے مکمل طور پر علامتی انداز کے ہیں۔ اس کا انتساب دیکھیے:

''مرحوم مشرقی پاکستان کی بیسویں برسی پر محصورین کے نام''

شروع میں معروف شاعر شاہین (مقیم کناڈا) کی چار نظمیں (جو غالباً ''بے نشاں'' سے ماخوذ ہیں) درج کی گئی ہیں۔ یہ نظمیں اسی موضوع پر ہیں جن میں بنگالی قوم پرستوں کے ہاتھوں غیر بنگالیوں (بہاریوں) کے قتلِ عام اور ظلم و ستم کی ترجمانی کی گئی ہے۔ وہ ایام کس قدر خوف و دہشت کے تھے، اس کا اندازہ متاثرین ہی کر سکتے ہیں۔ ساحل سے طوفان کا نظارہ کرنے والے نہیں۔ شاہد کامرانی اس کتاب کے ''پیش لفظ'' میں لکھتے ہیں:

''میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں نے اس مجموعے میں جو کچھ پیش کیا ہے اس میں نہ کوئی شعبدے بازی ہے اور نہ ہی بددیانتی۔ میں زندگی کے دکھوں کا امین ہوں۔ میں نے جو

کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ بہت اندوہناک، بہت حوصلہ شکن، بہت خون آشام ہے
اسی لیے میں نے وہ ساری اندوہناکی، حوصلہ شکنی اور خون آشامی اپنے لیے الگ رکھ لی
ہے اور آپ کے سامنے جو کچھ پیش کر رہا ہوں وہ محض ایک اشاریہ ہے اس بات کا کہ ایک
قافلہ اس طرح لٹا کہ آج بھی گم گشتہ راہ ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ "بے انت سفر" ایک افسانوی مجموعہ ہی نہیں ایک تاریخ بھی ہے،
ایک عظیم المیہ کی تاریخ۔

"سندھ کا منظر نامہ"

"سندھ کا منظر نامہ" شاہد کامرانی کی صحافیانہ یا سیاسی تجزیے پر مشتمل ایک ضخیم (صفحات
۵۱۲) کتاب ہے جو ۱۹۸۸ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔ حیرت کی بات ہے کہ اتنی ضخیم کتاب
(بقول مصنف) انھوں نے صرف چار مہینے میں لکھ ڈالی۔ اپنے دیباچہ "جواز" میں مصنف لکھتے ہیں:

"۲۳ جنوری ۱۹۸۷ء کو جب فضا میں بارود کی بو رچی بسی تھی اور رات نے اپنا نصف سفر
طے کیا تھا میں اسے لکھنے بیٹھا اور آج (۱۹ رمئی ۱۹۸۷ء) اس کا دیباچہ تحریر کر رہا ہوں......
چار مہینے کے اس عرصے میں، میں نے ایک رات بھی سکون کی نیند نہیں لی ہے۔ ہر رات
جاگتا رہا ہوں اور سپیدۂ سحر نمودار ہونے کے بعد جب بستر پر دراز ہوا ہوں تو بھی میرے
ذہن میں اکثر حالات و واقعات کی شبیہیں بنتی اور بگڑتی رہی ہیں۔ اور اکثر ایسا بھی ہوا
ہے کہ رات بارہ بجے سے صبح کے دس بجے تک لکھتا ہی رہا ہوں کہ کہیں واقعات کی ڈور
ہاتھوں سے چھوٹ نہ جائے۔"

("سندھ کا منظر نامہ" ص:۲۲)

شاہد کامرانی المیۂ مشرقی پاکستان سے بہت متاثر ہیں۔ وہ بڑے دکھ بھرے انداز میں
وہاں کے واقعات کا ذکر کرتے ہیں اور انھوں نے اسی کے پس منظر میں "سندھ کا منظر نامہ" لکھا
ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''میں نے بہت کشت و خون دیکھے ہیں۔ میری نظروں کے سامنے بہت سے لوگ شہید کیے گئے...... کہ جن کے لیے کوئی شہید مینار نہیں بنایا گیا، کوئی یادگار تعمیر نہیں کی گئی۔ میں نے ایسی بہت سی لاشیں دیکھی ہیں جنھیں قبر نصیب نہ ہوئی اور جو دو گز زمین کے سزاوار نہ ٹھہرائے گئے۔ میں نے ایسی مائیں دیکھی ہیں جن کے پستان اس جرم میں ان کے جسموں سے الگ کر دیے گئے کہ انھوں نے جو بچے پیدا کیے تھے وہ اُس سرزمین پر پائے جانے والے لوگوں سے نسلاً مختلف تھے۔ میں نے ایسے نوجوان دیکھے ہیں جن کے سروں کو تن سے جدا کر کے عبرت کا نشان بنایا گیا۔ میں نے ایسے بوڑھے دیکھے ہیں جن کے بیٹوں کو ان کی نظروں کے سامنے تہِ تیغ کیا گیا۔ اور میں نے ایسی مائیں دیکھی ہیں جن کی بیٹیوں کے دوپٹے ان کے سامنے تار تار کر کے انسان نما درندوں کے حوالے کر دیا گیا۔ میں نے ایسی مسجدیں دیکھی ہیں جنھیں مقتل بنایا گیا۔ اور میں نے ایسی جائے اماں دیکھی ہے جہاں نسل پرستوں کی نسل سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے ہی بے آسرا لوگوں کو پناہ دے کر دین کا اور انسانیت کا بھرم قائم رکھا۔ میں نے ان لوگوں کو مٹتے دیکھا جو خدا بن گئے تھے اور ان لوگوں کو سرخرو ہوتے دیکھا جو بے مایہ تھے...... میں نے وہ سب کچھ دیکھا ہے جو بہت کم لوگوں کو دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔''

(ایضاً۔ ص: ۲۸، ۲۹، ۳۰)

اس پس منظر میں شاہد کامرانی نے ''سندھ کا منظر نامہ'' لکھا ہے۔ وہ یہ بتانا اور دکھانا چاہتے ہیں کہ قوم جب قومیت، نسلیت اور لسانیت کے تعصب میں گرفتار ہو جاتی ہے تو پھر اس کے لیے خیر و فلاح کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ جہاں علاقائیت، نسلیت اور لسانیت کی سیاہ زبانیں شعلے اُگل رہی ہوں، وہاں سچ بولنا آسان نہیں ہوتا۔ یہ کارِ پیغمبری ہے، جس میں جان کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ اس دیباچہ کے شروع میں وہ لکھتے ہیں:

''یہ کتاب لکھنے سے پہلے میں بہت بے چین رہا ہوں...... بلکہ سچ یہ ہے کہ میں کئی برسوں

سے بے چینی کا شکار ہوں۔ میں احوالِ وطن پر بہت سوچتا رہا ہوں کہ حالات آئے دن قابو سے باہر کیوں ہوتے جا رہے ہیں؟ ہم ان پر کسی ردِ عمل کا اظہار کیوں نہیں کرتے؟ ہم انھیں جوں کا توں کیوں قبول کر لیتے ہیں؟"

(ایضاً۔ص:۲۱)

شاہد کامرانی کی نظر میں تمام مسائل کا حل سچا مسلمان بن جانے اور قرآنی احکام پر عمل کرنے میں ہے۔ انھوں نے کھل کر بڑی جرأت اور بے خوفی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"سندھ کا منظر نامہ" ایک دیباچہ اور چار ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب کے متعدد ضمنی ابواب ہیں۔ ہر باب اور ضمنی ابواب کے شروع میں پورے ایک صفحے پر اس باب کی مناسبت سے قرآنی آیت یا آیتوں کا ترجمہ درج کیا گیا ہے۔ درمیان میں جگہ جگہ اخباری تراشوں کے فوٹو بھی شامل کیے گئے ہیں۔ بعض اہلِ نظر کے طویل بیانات یا مضامین بھی پورے کے پورے درج کر دیے گئے ہیں۔

کتاب کا انتساب دیکھیے:

"ان لوگوں کے نام جو وطن کی آن پر قربان ہوئے اور شہادت کی نعمت سے محروم رہے
ان لوگوں کے نام جو شہیدوں کی امانت ہوتے ہوئے آج بھی وطن کی مٹی پر قدم رکھنے اور اسے بوسہ دینے کے منتظر ہیں

اور

ان تمام لوگوں کے نام جنھیں امن و آشتی اور ترقی و خوش حالی عزیز ہے..... جنھیں آزادی اپنی جان سے زیادہ پیاری ہے۔"

یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ "سندھ کا منظر نامہ" کے تمام مباحث پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے۔ اس کتاب کے ایک ضمنی باب "اسلام" سے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔ میری نظر میں اس

کتاب کا سب سے اہم باب یہی ہے۔ کامرانی صاحب لکھتے ہیں:

۱۔ ''محسوس یہ ہوتا ہے کہ پاکستان میں جہاں پچھلے دس سال سے اٹھتے بیٹھتے اسلام کا نام لیا جا رہا ہے اور اسلامی نظام کے نفاذ کی باتیں کی جا رہی ہیں، اسلام کے نام لیوا پہلے سے کہیں زیادہ گمراہی کا شکار ہو گئے ہیں اور اسلامی رواداری نام کی اب کوئی شے ان میں باقی نہیں بچی ہے......... علماء کا ایک طبقہ ملک میں جس گمراہی کا پرچار کر رہا ہے اس کا نتیجہ ہے کہ لوگ اسلام کے ابدی اور آفاقی اصولوں کو تو بھول گئے ہیں اور صرف قبروں پر منتیں ماننے پر اکتفا کرنے لگے ہیں۔''

(ایضاً۔ ص: ۲۳۱، ۲۳۲)

۲۔ ''کیا اسلام آج واقعی ہماری زندگی کا حصہ بن گیا ہے اور ہم صحیح معنوں میں مسلمان بن گئے ہیں؟ میرے محسوسات یہ ہے کہ ہم شہر میں ہوں یا دیہات میں کہیں بھی اسلام پر عمل نہیں کرتے، حقیقت یہ ہے کہ ہماری آبادی کی اکثریت اسلام سے دور ہے اور اس کا عمل اسلام کی تعلیمات کے قطعی منافی ہے۔''

(ایضاً۔ ص: ۲۳۲)

اس کے بعد کامرانی صاحب ان غیر اسلامی اور غیر شرعی حرکات کا ذکر کرتے ہیں جو بزرگوں کے مزارات پر دیکھنے میں آتے ہیں۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اسلام کے علم بردار علماء ان باتوں پر خاموشی اختیار کرتے ہیں، کیوں؟ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

۳۔ ''حمیت دینی اور غیرت اسلامی کا تقاضہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام پہلے دین میں شامل بدعتوں اور لادینی حرکتوں کا خاتمہ کریں اور اسلام کو ویسا ہی اسلام بنائیں جیسا یہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بعد آنے والے خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں تھا۔ اگر ہمارے علماء اس فرض سے غفلت برتتے ہیں تو یقیناً ان سے سخت باز پرس ہوگی۔''

(ایضاً۔ص:۲۳۴)

۴۔ ''اسلام ایک مکمل دین ہے اور یہ محض وقتی ضرورت کے لیے نہیں، رہتی دنیا تک کے لیے ہر دور اور ہر مسئلے کے حل کے طور پر آیا ہے۔ سو جو لوگ اسے ایسا نہیں مانتے وہ خود ہی اپنے آپ کو دائرۂ اسلام سے خارج کرنے کا اعلان کردیں کہ اسلامی معاشرہ دو عملیوں کو برداشت نہیں کرتا اور نہ ہی منافقتوں کو۔''

(ایضاً۔ص:۲۳۸)

۵۔ ''سندھ میں اسلام کی آمد جبر کے تحت ہوئی تھی یا ضرورت کے تحت۔ اس کی تفصیلات بیان کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں اس لیے کہ متعصب سے متعصب مستشرق اور تاریخ داں نے بھی یہ اعتراف کیا ہے کہ سندھ میں اسلام محبت اور اخلاص کے ذریعہ پھیلا اور اس میں تلوار کو نہیں کردار کا دخل تھا جس نے لوگوں کے دل لمحوں میں جیت لیے اور انھیں دامنِ اسلام میں پناہ لینے کی ترغیب دی۔ لیکن آج دھرتی کی پوجا کرنے والے لوگ اپنی پانچ ہزار سال پرانی تاریخ کے حوالے دے رہے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ وہی لوگ، جو آج اپنی قدامت کا ذکر کر رہے ہیں، جو صرف ہزار ڈیڑھ ہزار سال قبل باہر سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے۔''

(ایضاً۔ص:۲۳۸)

۶۔ ''دھرتی ہندوؤں کی ماتا ہے۔ اسی طرح جس طرح گائے ان کی ماتا ہے۔ اگر آپ دھرتی کو وہی مقام دینا چاہتے ہیں جو اسے ہندو دیومالا میں حاصل ہے تو آپ اعلان کریں کہ آپ مسلمان نہیں۔ اس لیے کہ مسلمان دھرتی کا بیٹا نہیں دھرتی کا باپ ہوتا ہے۔ وہ ابن تراب نہیں۔ ابو تراب ہے اور مسافرت اور ہجرت اس کا مقدر ہے اور دین کی خاطر وہ کہیں بھی جا سکتا ہے۔''

(ایضاً۔ص:۲۳۹)

۷۔ ’’اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قسطائیت کا عفریت ہم میں دور تک سرایت کر چکا ہے۔ ہم مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں، بزرگوں کی بزرگی کا دم بھی بھرتے ہیں لیکن وہ کچھ کرنے سے گریز کرتے ہیں جو اسلام کے مطابق یا خود ان بزرگوں کے عمل سے ہم آہنگ ہو۔ اس طرح کے طرز عمل کو کون سا نام دیا جائے؟ کہ انسان خود اپنے اندر کے تضادات سے آزاد نہیں ہو سکا ہے۔ اس نے مُلّا کو اسلام سمجھ لیا ہے۔ اسلام کی نمائندگی کا حق صرف اس شخص کو ودیعت کیا گیا ہے جو صرف قرآن و سنّت کو اپنا راہبر و رہنما جان کر اس پر اسی طرح عمل کر رہا ہے جس طرح قرونِ اولیٰ کے بزرگوں اور خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کیا تھا۔ اسلام میں ہر فرد بجائے خود دین کا ستون ہے لیکن اس کا حق یقیناً ان لوگوں کو نہیں دیا گیا ہے جو اسلام کے عامل نہیں ہیں۔‘‘

(ایضاً۔ص:۲۳۱،۲۳۲)

مختصر یہ کہ ’’سندھ کا منظر نامہ‘‘ ایک یادگار اور قابلِ قدر کتاب ہے۔ جس میں شاہد کامرانی نے ایک مسلم دانشور، صحافی اور مورخ کی حیثیت سے سندھ اور پورے پاکستان کے سلگتے مسائل کا بڑی دردمندی اور دل سوزی اور تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور ان مسائل کا حل بھی پیش کیا ہے جو اسلام کے اصول و قوانین کو عملی لحاظ سے اختیار کرنے پر منحصر ہے۔ اللہ مصنف کو جزائے خیر دے، ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔ آمین۔

❖❖

پروفیسر علی حیدر ملک

(افسانہ نگار، ناقد، کالم نویس)

سوانحی خاکہ

نام: علی حیدر ملک

والد کا نام: مظہر العلیم (مرحوم)

تاریخ پیدائش: ۷؍ اگست ۱۹۴۳ء

جائے پیدائش: گیا (بہار)

تعلیم: بی۔اے (آنرز)، ایم۔اے

پیشہ: درس و تدریس (سابق استاد وفاقی گورنمنٹ اُردو یونیورسٹی، کراچی)

پہلی ہجرت: غالباً ۱۹۶۴ء۔ کھلنا۔ سابق مشرقی پاکستان

دوسری ہجرت: سقوطِ ڈھاکا کے بعد۔ کراچی

اولاد: چار بیٹے، چار بیٹیاں

مطبوعہ کتابیں:

۱۔ بے زمیں بے آسماں (افسانے)

۲۔ افسانہ اور علامتی افسانہ (مضامین)

۳۔ عمر خیام اور دوسری غیر ملکی کہانیاں (تراجم)

۴۔دبستانِ مشرق (ترتیب)

۵۔اُردو ٹائپ اور ٹائپ کاری (ترتیب)

۶۔شاہ لطیف بھٹائی نمبر (ترتیب)

۷۔شہزاد منظر۔فن اور شخصیت (ترتیب بہ اشتراک صبا اکرام)

۸۔ادبی معروضات (مضامین)

۹۔ان سے بات کریں (انٹرویوز)

پروفیسر علی حیدر ملک ایک ممتاز اور مشہور و معروف ادیب و ناقد ہیں۔انھوں نے ادب کی مختلف جہتوں میں کام کیا ہے۔اس سلسلے میں ان کی تین حیثیتیں بہت نمایاں ہیں۔افسانہ نگار، ناقد اور ادبی کالم نویس۔

افسانہ نگار

پروفیسر علی حیدر ملک ایک منفرد افسانہ نگار ہیں۔ان کے افسانوں کا مجموعہ ''بے زمیں بے آسماں'' ۱۹۸۶ء میں کراچی سے شائع ہوا۔یہ کتاب ۱۲۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ۲۲ افسانے ہیں۔یہ ان کی بیس سال کی کاوشوں کا ایک انتخاب ہے۔اس میں تقریباً نصف افسانے علامتی ہیں۔ان افسانوں سے پتا چلتا ہے کہ افسانہ نگار کی معاشرے پر گہری نظر ہے اور وہ انسانی دکھ درد اور مسائل سے کماحقہٗ آگاہ ہے۔ان کے افسانے زیادہ طویل نہیں ہوتے اور وہ اپنے ہر افسانے میں عموماً زندگی کے کسی ایک پہلو یا کسی ایک مسئلے کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

علی حیدر ملک اپنی افسانہ نگاری کے بارے میں اپنے دیباچہ ''کہانیوں سے پہلے'' میں لکھتے ہیں:

''کہانیاں لکھنا میرے لیے کوئی خوش گوار فعل نہیں ایک اذیت ناک عمل ہے۔اس لیے میں حتی الامکان اس سے گریز کی کوشش کرتا ہوں اور صرف اسی وقت قلم اٹھاتا ہوں جب فرار کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔گویا کہانیاں لکھنا میرا شوق نہیں بلکہ مجبوری

ہے۔ مجبوری یہ کہ میں ایک فرد کی حیثیت سے جو کچھ دیکھتا، سوچتا اور محسوس کرتا ہوں اس کا اظہار بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے۔ دیکھنے، سوچنے اور محسوس کرنے کا عمل آدمی کو ہمیشہ ایک آشوب میں مبتلا رکھتا ہے۔ اس آشوب سے دوچار ہو کر جہاں خاموش رہنا دشوار ہوتا ہے وہاں دوسری طرف اظہار بھی آسان نہیں ہوتا۔"

علی حیدر ملک نے کچھ غیر ملکی افسانوں کا ترجمہ بھی کیا ہے جن کا مجموعہ "عمر خیام اور دوسری غیر ملکی کہانیاں" کے نام سے شائع ہوا۔

تنقید نگار

پروفیسر علی حیدر ملک ایک اچھے ناقد و مبصر ہیں۔ انھوں نے افسانہ نگاری کے ساتھ فنِ افسانہ نگاری پر تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ ان کے ان مضامین کا مجموعہ "افسانہ اور علامتی افسانہ" کے نام سے شائع ہوا۔

ملک صاحب کے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ "ادبی معروضات" کے نام سے ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا۔ (صفحات ۲۳۰)۔ یہ ایک خوب صورت اور دیدہ زیب مجموعہ ہے جس میں بعض بڑے اہم تحقیقی اور تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ کل ۲۷ مضامین اور آخر میں دو خط ہیں۔ اس میں چند شخصی خاکے بھی ہیں مثلاً جوش صاحب، مجنوں صاحب، فتحی صاحب اور خواجہ صاحب۔ یہ مضامین دلچسپ بھی ہیں اور معلومات افزا بھی۔

علی حیدر ملک صاحب اپنی کتابوں پر کسی سے دیباچہ یا تقریظ وغیرہ نہیں لکھواتے۔ وہ دیباچہ خود ہی لکھتے ہیں جس میں اپنے افکار و نظریات کی وضاحت کرتے اور کتاب کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہیں۔

"ادبی معروضات کے دیباچہ ("کچھ تنقید اور اس کتاب کے بارے میں") میں علی حیدر ملک لکھتے ہیں:

"تذکرہ نگاری سے مولانا حالی کی تشریحی تنقید اور مولانا حالی کی تشریحی تنقید سے رؤنو

آبادیاتی تنقید تک اردو میں نظری و عملی تنقید کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ اس ذخیرے میں رطب و یابس اور پست یا معمولی درجے کی تنقید کے علاوہ اعلیٰ پائے کی تنقید بھی یقیناً نظر آتی ہے۔ لیکن یہ بات صرف تنقید کے بارے میں نہیں بلکہ ادب کی ہر صنف کے بارے میں بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے۔ اعلیٰ، اچھا اور لائقِ اعتنا ادب ہر صنف میں آج ہی نہیں، ہمیشہ اور ہر زبان میں کم ہی پایا جاتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ فی زمانہ، سیاست اور زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح جانب داری، گروہ بندی، خوف اور لالچ کا عارضہ اردو تنقید کو کچھ زیادہ ہی لاحق ہو گیا ہے۔ میرے نزدیک تنقید نگار کے لیے ادب کا تسلسل کے ساتھ بالاستیعاب مطالعہ لازمی ہونے کے علاوہ اس میں ادب فہمی، انصاف پسندی اور جرأتِ اظہار کا ہونا لازمی ہے۔''

اپنے تنقیدی مضامین کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ادب کے مطالعہ کے دوران بعض موضوعات، تصنیفات اور مصنفوں کے بارے میں میرے ذہن میں جو تاثرات مرتب ہوئے، میں نے جو آرا قائم کیں، ان تاثرات اور آرا کا اظہار گاہے گاہے اپنی تحریروں میں کرتا رہا۔ میں اس بات سے بخوبی واقف ہوں کہ رائے زنی تنقید نہیں ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھتا ہوں کہ ہر تنقید میں رائے زنی کا پہلو ضرور ہوتا ہے۔''

ادبی کالم نگاری اور انٹرویوز

پروفیسر علی حیدر ملک ایک عرصے سے ادبی کالم نگاری بھی کر رہے ہیں۔ پہلے وہ روزنامہ ''جسارت'' کراچی سے منسلک تھے اور اب ایک مدت ہوئی روزنامہ ''جنگ'' کراچی سے وابستہ ہیں اور ہر ہفتے ''اخبارِ جہاں'' میں ادبی کالم لکھتے ہیں۔

علی حیدر ملک نے اہلِ علم و ادب سے پچاسوں انٹرویوز بھی لیے جن کا مجموعہ ۲۰۰۹ء میں ''ان سے بات کریں'' کے نام سے شائع ہوا (صفحات ۲۹۴)۔ اس مجموعے میں چالیس انٹرویوز

شامل ہیں۔جن میں شروع کے تین اور آخری انٹرویو کے علاوہ سب انٹرویوز روزنامہ "جسارت" کے لیے ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۶ء کے درمیان لیے گئے۔ یہ ان کی ایک اہم کتاب ہے جس کی بڑی پذیرائی ہوئی۔

علی حیدر ملک انٹرویوز کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے اپنے دیباچہ "ادبی انٹرویوز اور یہ مجموعہ" میں لکھتے ہیں:

"انٹرویوز کا تعلق دراصل صحافت سے ہے جو ادب میں بھی رائج ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کے انٹرویوز اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ انٹرویوز کے متعدد مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں...... اسے اب ایک مستقل صنف کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے اور اس کی اہمیت و افادیت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا۔ انٹرویو چونکہ سوال و جواب پر مشتمل ہوتا ہے اور سوال کرنا عام طور پر بہت سہل سمجھا جاتا ہے اس لیے ہر بوالہوس نے حُسن پرستی اپنا شعار بنالیا ہے۔ حالانکہ سوال کرنا ایک مشکل کام ہے۔ اس کے لیے اہلیت کے ایک خاص معیار اور کچھ پیشگی شرائط پر پورا اترنا ضروری ہے۔"

آگے چل کر کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میں نے اخبارات و جرائد کے لیے پچاس سے زائد اہلِ حرف و دانش کے انٹرویو کیے جن میں سے چالیس انٹرویوز اس مجموعے میں شامل ہیں۔ انٹرویوز کے دوران مجھے بعض نہایت دلچسپ تجربات ہوئے لیکن یہاں ان کے بیان کا موقع نہیں۔"

پروفیسر علی حیدر ملک میں چند اور خوبیاں بھی ہیں۔ وہ ایک اچھے مقرر ہیں اور فی البدیہہ تقریر کا ملکہ بھی انھیں حاصل ہے۔ ادبی جلسوں کو کنڈکٹ کرنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ وہ ایک سنجیدہ، مخلص اور بااخلاق انسان ہیں۔ علم و ادب کے صحیح معنوں میں قدرداں ہیں۔

❖❖

احمد زین الدین

(افسانہ نگار، مبصر، صحافی)

سوانحی خاکہ

نام: زین الدین احمد صدیقی

قلمی نام: احمد زین الدین

والد کا نام: مولوی عبدالستار مرحوم

تاریخ پیدائش: ۲۲ر جولائی ۱۹۳۹ء (میٹرک سرٹیفکیٹ کے مطابق)

مقامِ پیدائش: غازی پور (یوپی)

تعلیم: ایم۔اے (اردو) ڈھاکا یونیورسٹی، ۱۹۶۵ء

ایم۔اے (انگریزی) کراچی یونیورسٹی، ۱۹۷۶ء

پہلی ہجرت: ۱۹۵۱ء۔ ڈھاکا

دوسری ہجرت: ۱۹۷۱ء۔ کراچی

ملازمت: محکمہ ٹیلی فون و ٹیلی گراف، بحیثیت اکاؤنٹ آفیسر، ۱۹۹۸ء میں سبک دوش ہو گئے۔

موجودہ مصروفیات: سہ ماہی ''روشنائی'' کراچی کی ادارت اور دیگر تحقیقی کام۔

کتابیں: ا۔ ''دریچے میں بجی حیرانی'' ۔ افسانوں کا مجموعہ۔ ۱۹۹۷ء

۲۔ ''رنگِ شناسائی''۔ مضامین کا مجموعہ۔۲۰۰۴ء

۳۔ ''کہانیوں کی کہکشاں۔'' ترجمے۔۲۰۰۷ء

۴۔ ''حرف پذیرائی''۔ مضامین کا مجموعہ۔۲۰۰۹ء

احمد زین الدین سابق مشرقی پاکستان کے معروف افسانہ نگار، مضمون نگار اور صحافی تھے۔ ان کی ذہنی، فکری اور ادبی نشو ونما اسی سرزمین پر ہوئی۔ ساتویں جماعت سے ایم۔اے تک وہیں تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے اپنے کیریر کو بنانے اور سنوارنے میں سخت محنت اور جد وجہد کی۔ محکمہ ٹیلی فون و تار میں مستقل ملازمت کے علاوہ بیک وقت کئی جز وقتی ملازمتیں بھی کرتے رہے۔ کچھ عرصہ ایک اسکول میں بھی پڑھایا۔ اخباروں اور ریڈیو سے بھی وابستہ رہے۔ اسی دوران ان کی شادی بھی ہوگئی اور گھریلو ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہوگیا۔

احمد زین الدین ادبی جلسوں اور نشستوں میں بھی پابندی سے شریک ہوتے رہے۔ انھیں ادبی جلسوں کی رپورٹنگ میں کمال حاصل تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ڈھاکے میں انھوں نے مصروف ترین اور بہترین دن گزارے۔

احمد زین الدین کی نثر نگاری کی کئی جہتیں ہیں۔ جن میں افسانہ نگاری، مضمون نگاری اور صحافت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ذیل میں ان کی تینوں حیثیتوں پر ایک نظر ڈالی جاتی ہے۔

افسانہ نگار

احمد زین الدین کی سب سے نمایاں حیثیت افسانہ نگار کی ہے۔ وہ مشرقی پاکستان کے ابھرتے ہوئے جدید افسانہ نگاروں میں تھے۔ ۱۹۶۱ء میں انھوں نے افسانہ نگاری کا آغاز کیا اور بہت جلد ایک افسانہ نگار کے طور پر معروف ہوگئے۔ ان کے افسانے اس دور کے اکثر اہم جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں کا مجموعہ ''دریچے میں بھی حیرانی'' ۱۹۹۷ء میں کراچی سے شائع کیا جس کی بڑی پذیرائی ہوئی۔

یہ افسانوی مجموعہ ۱۹۲ صفحات اور ۱۹ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ آخری اور سب سے طویل

(۳۳ صفحات) بیسویں کہانی ہے جو مصنف کی "اپنی کہانی" ہے جس کا عنوان "مجھ سے کہا تھا یاد تے" ہے۔ کتاب کے شروع میں ڈاکٹر حنیف فوق، پروفیسر سحر انصاری، احمد یوسف اور پروفیسر علی حیدر ملک کے مضامین ہیں۔ افسانہ نگار کی "اپنی کہانی" سب سے دلچسپ کہانی ہے۔ اس میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"قیامِ مشرقی پاکستان کے دوران میں، میں نے زیادہ کہانیاں لکھیں۔ وہاں کی سرزمین شعروادب کے لیے زیادہ سازگار تھی۔ بیس سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد اب زندگی میں ٹھہراؤ آچلا تھا۔ وہاں کی ہر چیز اپنی اپنی سی لگتی تھی۔ خلوص ومحبت کی فراوانی تھی۔ عمر عزیز کا بہترین وقت یہیں گزرا تھا، اس لیے اس سرزمین کو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ مگر ہمارے سیاسی طالع آزماؤں کی ناقص کارکردگی اور عاقبت نااندیشی نے ایک بار پھر ہمیں بے گھری کے عذاب سے دوچار کردیا اور ۱۹۷۱ء میں پاک بھارت جنگ کے نتیجے میں قایدِ اعظم کا (بلکہ ہم سب کا) پاکستان دولخت ہوگیا۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد فکر وخیال کا شیرازہ بکھر گیا۔ زندگی ایک نئے گرداب کی اسیر ہوگئی۔ اس خوں چکاں داستان کے اثرات ذہن ودل پر اس طرح حاوی رہے کہ تقریباً دس سال تک ایسا ذہنی جمود رہا کہ تخلیق کی ساری راہیں مسدود ہوکر رہ گئیں۔ اگرچہ میں سقوطِ ڈھاکا سے چند ماہ قبل ہی 'نئے پاکستان' میں آگیا تھا، مگر دوسری ہجرت کا کرب ذہنی انتشار کا سبب بنا رہا۔"

شوکت صدیقی ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"احمد زین الدین مشاق افسانہ نگار ہیں۔ لکھنے کا فن جانتے ہیں۔ تخلیق کے عمل میں موضوع کو اپنی گرفت میں رکھتے ہیں اور اس کے اظہار وابلاغ کے لیے وہ اسلوب اختیار کرتے ہیں جو موضوع سے مطابقت اور ہم آہنگی رکھتا ہے۔ احمد زین الدین کے فکروفن کا ارتقائی عمل جاری ہے، مجھے امید ہے کہ وہ بہتر سے بہتر افسانے لکھتے رہیں گے اور ادب میں وہ مقام حاصل کریں گے جس کے وہ اہل ہیں۔"

(فلیپ ”دریچے میں کئی حیرانی“)

مبصر و ناقد

احمد زین الدین کی دوسری حیثیت مبصر و ناقد کی ہے۔ وہ اُردو اور انگریزی ادب کے ایم۔اے ہیں۔ان کا مطالعہ وسیع ہے۔انھوں نے اپنی پوری زندگی ادب وصحافت کے میدان میں گزار دی۔انھوں نے بہت سے تبصرے، خاکے اور تنقیدی مضامین لکھے۔ان کے مضامین کے دو مجموعے ”رنگِ شناسائی“ اور ”حرف پذیرائی“ شائع ہوئے۔

”رنگِ شناسائی“ ۲۰۰۴ء میں کراچی سے شائع ہوا۔مضامین کا یہ مجموعہ ۲۱ مضامین اور ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔کتاب کے شروع میں ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کا مضمون اور مصنف کا ایک مختصر دیباچہ ہے۔ڈاکٹر کشفی کا مضمون بہت عمدہ، دلچسپ اور قابلِ مطالعہ ہے۔انھوں نے اس مضمون میں احمد زین الدین کی شخصیت اور فن کا بڑی خوبی سے جائزہ لیا ہے۔وہ ان مضامین کے بارے میں لکھتے ہیں:

”اس مجموعے 'رنگِ شناسائی' کے تمام مضامین انھیں ہم عصروں کے بارے میں ہیں جن سے احمد زین الدین خوب واقف ہیں.......... بعض مضامین تو مکمل خاکے ہیں بس تنقید کا ہلکا سا رنگ شامل کر دیا گیا ہے اور ان خاکوں میں مکمل صداقت کے باوصف افسانوی اسلوب کا حسن بھی نمایاں ہے۔ ان مضامین کی ایک اور خوبی ان کا توازن، 'رنگِ شناسائی' کے ساتھ 'رنگِ صداقت' بھی ہے جو کہیں کہیں غلط روایات یا اندازوں سے مجروح ہوا ہے۔“

ڈاکٹر صاحب اپنے مضمون کے آخر میں لکھتے ہیں: ”احمد زین الدین کا یہ مجموعۂ مضامین ان کتابوں میں سے ہے جو اپنے آپ کو خود پڑھوالیتی ہیں۔“ میرا خیال ہے کہ کسی کتاب کی پہلی خوبی یہی ہونی چاہیے۔

احمد زین الدین کا دوسرا مجموعۂ مضامین ”حرف پذیرائی“ ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔ یہ کتاب

۱۷۶ صفحات اور ۲۱ مضامین پر مشتمل ہے۔ احمد زین الدین اپنے ایک صفحہ کے دیباچے "اپنی بات" میں لکھتے ہیں: "اس کتاب کا نام میں نے 'حرفِ پذیرائی' اس لیے رکھا ہے کہ اس میں زیادہ تر مضامین تقریبِ رونمائی کے لیے لکھے اور پڑھے گئے تھے۔"

کتاب کے شروع میں ڈاکٹر مظفر حنفی کا مضمون ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس کتاب میں جو نگارشات شامل ہیں انھیں موضوع و مزاج کے اعتبار سے شقوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ ۱۔ تاثراتی تنقید، ۲۔ فکشن اور علمی نثر کی تنقید، ۳۔ شعری تنقید۔"

ڈاکٹر حنفی بعض مضامین کا جائزہ لینے کے بعد لکھتے ہیں:

"اس کتاب میں شامل نگارشات کی سب سے بڑی خوبی ان کی Readability ہے۔ یہ تنقیدی بصیرت کی حامل تحریریں ان بھاری بھرکم تنقیدی اصلاحات سے پاک ہیں جو عموماً پیشہ ور نقاد قاری کو مرعوب کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان میں مغربی مفکرین کے ویسے غیر ضروری اور بے جوڑ حوالے بھی نہیں ملتے جو اردو تنقید میں عام ہیں۔"

صحافی، مدیر

احمد زین الدین ڈھاکے ہی میں صحافت سے وابستہ ہو گئے تھے۔ وہ ڈھاکا کے مختلف اخباروں میں ایک عرصے تک جز وقتی ملازمت کرتے رہے۔ ۱۹۹۸ء میں ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد ۲۰۰۰ء میں ایک سہ ماہی ادبی رسالہ "روشنائی" جاری کیا جو اب تک پابندی سے نکل رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ احمد زین الدین اردو رسالوں کے کامیاب مدیروں میں ہیں۔ "روشنائی" نے اردو کے ادبی رسالوں میں ایک مقام بنالیا ہے۔ تقریباً ہر شمارے میں کسی ممتاز ادیب یا شاعر کا گوشہ بھی شائع کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ "روشنائی" کا "افسانہ صدی نمبر (تین جلدوں میں)"، "شمس الرحمن فاروقی نمبر" اور "قرۃ العین حیدر نمبر" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

❖❖

نورالہدیٰ سیّد

(افسانہ نگار)

سوانحی خاکہ

نام: سید محمد نورالہدیٰ

قلمی نام: نورالہدیٰ سیّد

والد کا نام: سید شمس الہدیٰ

تاریخِ پیدائش: ۱۹۳۷ء (میٹرک سرٹیفکیٹ کے مطابق ۵رجنوری ۱۹۳۲ء)

جائے پیدائش: بہار شریف (پٹنہ، بہار)

تعلیم: بی۔اے (پٹنہ یونیورسٹی)

۱۹۶۰ء میں ڈھاکا یونیورسٹی کامرس ڈیپارٹمنٹ میں ایم۔کام کے لیے داخلہ لیا لیکن ایک سال بعد تعلیم ادھوری چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

پیشہ: سرکاری ملازمت۔ محکمہ خوراک وزراعت حکومتِ پاکستان (ڈپٹی ڈائرکٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے)

پہلی ہجرت: ۱۹۶۹ء۔ ڈھاکا

دوسری ہجرت: ۱۹۷۱ء۔ سقوطِ ڈھاکا سے چند ماہ قبل۔ کراچی

اولاد: سات بیٹیاں، دو بیٹے

''موسم موسم''

نورالہدیٰ سید نے زیادہ تر علامتی افسانے لکھے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''موسم موسم'' ۱۹۹۰ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ۱۷ افسانے ہیں۔ کتاب کے شروع میں محمود واجد کا دیباچہ ہے اور آخر میں ''اختتامیہ'' کے طور پر احمد ہمیش کا مضمون ہے۔ کتاب میں مصنف کا لکھا ہوا ''ابتدائیہ'' بھی ہے۔ جس میں انھوں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا بلکہ ''کہانی جالوت وطالوت کی'' کے عنوان سے سورہ بقرہ کی آیت ۲۴۵ سے ۲۵۱ کا ترجمہ درج کر دیا ہے۔

پروفیسر محمود واجد کتاب کے دیباچہ میں نورالہدیٰ سید کے افسانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''خود آگہی جو دنیا کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے اور فکرِ فردا جو زندگی گزارنے کے شعور سے پیدا ہوتی ہے فن میں اگر موجود نہ ہو تو اور کچھ ہو تو ہوا سے دولتِ بیدار نہیں کہہ سکتے۔ مقامِ شکر ہے کہ نورالہدیٰ سید کے یہاں یہ موجود ہے۔ سچ ہے کہ زندگی کسی بھی عہد میں خطِ مستقیم میں نہیں چلا کرتی لیکن اب تک کے علم کی موجود حالت میں جدید ادب خود کی بازیافت اور معاشرے کے حوالے سے نسلوں اور قوموں کی سائیکی تک کی بازیافت ایک دلچسپ لیکن پیچیدہ عمل ہے۔ نورالہدیٰ سید اس عمل سے سرخرو گزرے ہیں۔

''زبان وبیان کی بات بھی نہیں کروں گا کہ یہ بنیادی طور پر فکر وخیال کے جسم کے جملہ سامانِ پوشاک میں سے ایک ہے۔ سو یہ بھی بھلا سا ہے، اچھا لگتا ہے۔ طرز ان کا اپنا، مخصوص لہجہ اور بنی بنائی دو کیبلری۔ موضوعات کے انتخاب میں خاصا تنوع ملتا ہے۔ فرد، قوم اور نسل کے مسائل سے بات عالمی بحرانوں تک جاتی ہے۔ تفہیم میں عمق اور کشادگی ہے۔.......... نورالہدیٰ سید فکشن میں زندگی کو لکھنے کی ایک کامیاب مثال ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کم بڑا اختصاص نہیں۔''

نورالہدیٰ سید افسانوں کے علاوہ تبصرے اور مضامین وغیرہ بھی لکھتے رہتے ہیں۔ وہ بااخلاق، ملنسار، خوش مزاج اور مجلسی انسان ہیں۔ انھیں ادبی نشستوں سے بھی دلچسپی ہے۔ کچھ عرصہ قبل خود ان کے گھر پر پندرہ، بیس سال تک ادبی نشستیں ہوتی رہیں۔ وہ اپنی اہلیہ کے حُسنِ انتظام اور ہوشیاری و دانش مندی کے بڑے قائل ہیں۔ یہ نشستیں انھیں کے دم قدم سے تھیں۔ غالباً ان کی وفات کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ سات بیٹیوں میں سے چھ بیٹیوں کی شادی کروا چکے ہیں۔ بڑا بیٹا بھی شادی شدہ ہے اور الگ رہتا ہے۔ ان کے ساتھ چھوٹی بیٹی اور چھوٹا بیٹا ہے۔ دونوں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اب شاید وہ بڑی تنہائی محسوس کرتے ہیں۔

فرید شہزاد

(افسانہ نگار و مبصر)

سوانحی خاکہ

نام: فرید

قلمی نام: فرید شہزاد

تاریخ پیدائش: ۳۰ جنوری ۱۹۳۷ء

مقام پیدائش: کھڑکپور (مغربی بنگال)

آبائی وطن: حیدر آباد، دکن

پہلی ہجرت: تقسیم کے بعد، مشرقی پاکستان۔ سید پور

تعلیم: میٹرک۔ سید پور

ملازمت: پی آئی اے

دوسری ہجرت: سقوطِ ڈھاکا کے بعد۔ کراچی

اولاد: صاحبِ اولاد ہیں

تصانیف: ۱۔ صحرا کی دھوپ (افسانے)۔ ۲۰۰۰ء۔ کراچی

۲۔ شہرِ زنداں (المیہ مشرقی پاکستان کی آپ بیتی)۔ ۲۰۰۹ء۔ کراچی

فرید شہزاد مشرقی پاکستان کے معروف افسانہ نگاروں میں ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ بچپن ہی میں اپنے والدین کے ساتھ سید پور آ گئے۔ ان کے والد غالباً ریلوے میں ملازم تھے۔ فرید شہزاد نے سید پور ہی سے میٹرک پاس کیا اور انھیں پی آئی اے میں نوکری مل گئی۔ اس کے بعد وہ ڈھاکا آ گئے۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد وہ تین ماہ ڈھاکا سینٹرل جیل میں رہے۔ اس کے بعد وہ مع اہل و عیال نیپال جانے کے لیے بنگلہ دیش کی سرحد پار کر کے مغربی بنگال پہنچ گئے، لیکن وہاں گرفتار کر لیے گئے۔ چونکہ کوئی پُرسانِ حال نہ تھا، بھارت کے مختلف جیلوں میں سات سال قید کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد رہا ہوئے اور پاکستانی کلیرنس پر ۱۹۷۹ء میں کراچی پہنچے۔ یہ تمام روداد ان کی کتاب ''ضمیر زنداں'' میں تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ پی آئی اے میں دوبارہ ملازمت مل گئی۔ جب ذرا سکون ملا تو دوبارہ لکھنے پڑھنے کا کام شروع کر دیا۔ فرید شہزاد مضبوط اعصاب کے مالک، باہمت اور حوصلہ مند انسان ہیں۔ جتنے طویل عرصے تک وہ شدید تکالیف اٹھا کر پاکستان پہنچے، کم از کم ادیبوں اور شاعروں میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ فرید شہزاد ایک مدت ہوئی ملازمت سے سبک دوش ہو چکے ہیں اور ایک خوش حال اور مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کا حلقۂ احباب بھی وسیع ہے۔

''صحرا کی دھوپ''

''صحرا کی دھوپ'' فرید شہزاد کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے شروع میں پروفیسر علی حیدر ملک، پروفیسر اظہر قادری، احمد زین الدین اور اے خیام کے مضامین یا تقریظیں ہیں۔ کتاب ۸ افسانوں اور ۱۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

پروفیسر اظہر قادری ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''فرید شہزاد نے ۱۹۵۴ء میں افسانہ نگاری کی ابتدا کی اور اس وقت سے اب تک انھوں نے نہایت تواتر اور مستقل مزاجی کے ساتھ افسانے لکھے ہیں اور آج بھی افسانہ نگاری میں ان کا قلم بے تکان ہمیشہ کی طرح رواں دواں ہے۔ انسان اور اس کے مختلف سماجی حالات ان کی افسانہ نگاری کا بنیادی موضوع ہیں۔ وہ اپنے اردگرد رونما ہونے والے

واقعات کو کہانی کی شکل عطا کرنے کے فن سے اچھی طرح واقف ہیں۔ روزمرہ زندگی کے واقعات کی صورت گری نے ان کی افسانہ نگاری کو زندگی کے بنیادی عناصر سے قریب تر کر دیا ہے۔"

("صحرا کی دھوپ"۔ص:۱۰)

اس مجموعے کے تمام افسانے دلچسپ اور عبرت خیز ہیں۔ ایک افسانہ "بستی کا تنہا آدمی" میں المیہ مشرقی پاکستان کی عکاسی کی گئی ہے۔

"شہرِ زنداں"

"شہرِ زنداں" (المیہ مشرقی پاکستان کی آپ بیتی/ جگ بیتی) فرید شہزاد کی ایک اہم کتاب ہے جس میں سقوطِ مشرقی پاکستان کی الم ناک داستان آپ بیتی (جگ بیتی) کے طور پر بیان کی گئی ہے۔ یہ ایک ایسا عظیم المیہ تھا جو ایک طوفان یا سیلاب کی طرح تمام انسانی عظمتوں، شرافتوں اور مروتوں کو تاراج کر گیا۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں مصنف کے ان سات سالوں کی دردناک روداد بھی ہے جو اس نے پاکستان پہنچنے کے لیے بھارتی جیلوں میں بیوی بچوں کے ساتھ گزارے۔ کتاب کے آخر میں لاہور کے رہنے والے ایک صاحب عبدالقدیر کی داستان بھی ہے جو براہِ برما پاکستان پہنچے۔ یہ داستان بھی فرید شہزاد نے لکھی ہے۔ کتاب ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کا دیباچہ مشرقی پاکستان کے مشہور و معروف ادیب، صحافی اور شاعر جناب اختر پیامی نے لکھا ہے۔ ان کی ایک نظم بھی کتاب میں درج کی گئی ہے۔ یہ کتاب پہلے کراچی کے ایک رسالہ "باغ" میں قسط وار چھپی تھی۔

تسامحات

اس کتاب میں مختلف قسم کے تسامحات بھی نظر آتے ہیں۔ ذیل میں بعض تسامحات کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

۱۔ کتاب کے صفحہ ۱۶ پر لکھتے ہیں: ''۲۱ فروری ۱۹۵۲ء کو پلٹن میدان میں ایک بڑا جلسہ ہوا۔ اس وقت شیخ مجیب الرحمن ڈھاکا یونیورسٹی کی طلبا یونین کا جنرل سکریٹری تھا۔''

حالانکہ شیخ مجیب الرحمن (۱۹۲۰ء۔۱۹۷۵ء) اس سے بہت پہلے یونیورسٹی سے نکالا جا چکا تھا۔ سید قاسم محمود ''انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا'' میں لکھتے ہیں:

''شیخ مجیب الرحمن نے اسلامیہ کالج کلکتہ اور ڈھاکا یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۴۸ء میں بنگلہ زبان کی حمایت میں بطور طالب علم احتجاجی مظاہروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چنانچہ انھیں ڈھاکا یونیورسٹی سے خارج کر دیا گیا۔'' (ص: ۸۱۳)

۲۔ صفحہ ۱۷ پر فرید شہزاد لکھتے ہیں:

''۲۱ فروری ۱۹۵۲ء کی وہ خون آشام جب ہزاروں بنگالی طلبا و طالبات ڈھاکا کی سخت کھردری سڑکوں پر خاک و خون کا حصہ بن گئے۔''

معلوم نہیں یہ تعداد انھوں نے کہاں سے حاصل کر لی۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ صرف دو طالب علم اور ایک چپراسی ہلاک ہوئے۔ (اس جگہ ''شہید مینار'' بنا کر بنگالی قوم پرست اپنی مظلومیت کا پروپیگنڈا کرتے اور بنگالی قومیت، لسانیت اور کلچر کی پوجا کرتے رہے)۔

۳۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد میر پور (ڈھاکا میں بہاریوں کی ایک بڑی بستی) کے بارے میں مصنف صفحہ ۴۳ اور ۴۴ پر لکھتے ہیں:

''خاص طور پر میر پور، محمد پور کی بستیاں ان کی (مکتی باہنی کی) چراگاہیں تھیں۔ بے خوف و خطر حملہ آور ہوتے، بزرگوں اور جوانوں کو قتل کرنے کے بعد عورتوں کی آبرو ریزی کرتے۔''

''سقوطِ ڈھاکا کے بعد صرف میر پور بستی میں دو لاکھ بہاری سفاکی سے قتل کر دیے گئے۔''

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سقوطِ ڈھاکا کے بعد بھی میر پور بہاریوں کا ایک ایسا قلعہ تھا

جہاں مکتی باہنی کی جرأت نہ ہوتی تھی کہ داخل ہو جاتے۔ وہ کئی دن تک مکتی باہنی کا مقابلہ کرتے رہے، یہاں تک کہ بہت سے مکتی باہنی والے مارے گئے۔ مجیب الرحمن نے بمباری کا حکم دیا لیکن کرنل عثمانی (بنگلہ دیشی فوج کا کمانڈر) اس بات پر راضی نہ ہوا۔ اس نے کہا کہ وہاں عورتیں اور بچے ہیں، بمباری نہیں کی جا سکتی۔ آخر انڈین آرمی (یہ فروری ۱۹۷۲ء کی بات ہے جب انڈین آرمی وہاں موجود تھی) کے چند افسران سفید جھنڈی لے کر بنگلہ دیشی فوج کے چند افسروں اور مکتی باہنی کے چند کمانڈروں کے ساتھ میر پور گیارہ نمبر میں داخل ہوئے اور ڈاکٹر معید اور بعض دوسرے سرکردہ حضرات سے گفتگو کی اور حالات کی نزاکت کو سمجھاتے ہوئے ہتھیار ڈال دینے کو کہا اور کہا کہ اس کے بعد سرچ آپریشن ہوگا۔ لہٰذا اعلان کر دیا گیا کہ جس کے پاس جو ہتھیار ہے وہ لا کر ڈاکٹر معید کی کلینک کے سامنے یا روڈ پر مسجد کے سامنے ڈال دے۔ ہتھیاروں کے ڈھیر لگ گئے۔ اس کے بعد سرچ آپریشن شروع ہوا۔ اس دوران دس ہزار نوجوان جیل بھیج دیے گئے (قیدیوں کو لے جانے والی بعض بسوں کو اغوا بھی کر لیا گیا اور سب افراد کو قتل کر دیا گیا) لیکن قتلِ عام یا عورتوں کی آبروریزی میر پور میں نہ ہوئی جیسا کہ فرید شہزاد نے لکھا ہے۔

فرید شہزاد کا یہ لکھنا کہ میر پور میں دو لاکھ آدمی مارے گئے، سمجھ سے باہر ہے۔ آدمی ضرور مارے گئے لیکن چند سو اور وہ بھی میر پور کے آس پاس۔ میر پور ایک نمبر اور محمد پور میں مکتی باہنی والوں نے بڑے ظلم ڈھائے لیکن اس کے بارے میں بھی مصنف نے مبالغے سے کام لیا ہے۔

اس قسم کی مبالغہ آرائی اس کتاب میں جگہ جگہ ملتی ہے۔ اسے سقوطِ ڈھاکا سے متعلق ایک مستند کتاب سمجھنا بڑی غلطی ہوگی۔ جب ادیب مورخ کا قلم سنبھال لے تو اس پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے۔ افسانہ نگاری اور شاعری میں مبالغہ آرائی تو ہو سکتی ہے، تاریخ نگاری میں نہیں۔

❖❖

پروفیسر حسّانہ انیس

(افسانہ نگار)

سوانحی خاکہ

نام: حسّانہ انیس

والد کا نام: پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی

تاریخِ پیدائش: ۱۲؍ جولائی ۱۹۳۹ء

مقامِ پیدائش: ہزاری باغ، جھارکھنڈ (بھارت)

تعلیم ادیب کامل (علی گڑھ یونیورسٹی)

ایم۔ اے، اردو (ڈھاکا یونیورسٹی)

پیشہ: درس و تدریس (محکمۂ تعلیم حکومتِ سندھ)

گورنمنٹ اسلامیہ کالج برائے خواتین، کراچی

گورنمنٹ کالج آف ہوم اکنامکس، کراچی

پرنسپل گورنمنٹ گرلز کالج، اورنگی ٹاؤن، کراچی

ریٹائرمنٹ: ۱۱؍ جولائی ۱۹۹۹ء بہ حیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر۔

آخری ملازمت بعد از ریٹائرمنٹ: پرنسل Axis گرلز کالج، بہادرآباد، کراچی

وفات: ۷؍ جولائی ۲۰۰۳ء، کراچی

اولاد: سات بیٹے بیٹیاں

”ڈوبتی ہوئی پہچان“

حسانہ انیس بحیثیت افسانہ نگار مشرقی پاکستان میں زیادہ معروف نہ تھیں۔ کراچی آنے کے بعد وہ معروف ہوئیں اور ان کے معیاری اور جدید انداز کے افسانوں کو بہت سراہا گیا۔ انھوں نے کچھ زیادہ نہیں لکھا۔ ان کے افسانوں کے مجموعے ”ڈوبتی ہوئی پہچان“ میں کل گیارہ افسانے ہیں۔ کتاب کے شروع میں ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر حنیف فوق، ادیب سہیل اور محمود واجد کے مضامین ہیں۔ کتاب ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ حسانہ انیس کی وفات کے چند ماہ بعد دسمبر ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا۔ وہ اپنی کتاب نہ دیکھ سکیں۔

ڈاکٹر حنیف فوق ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

”حسانہ انیس کے یہ افسانے ایک ایسی افسانہ نگار کے افسانے ہیں جسے کہانی کہنے کا غیر معمولی سلیقہ تھا، لیکن جسے وقت نے اپنی صلاحیتوں سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی مہلت نہیں دی۔ لیکن جو جو کچھ پیش کیا گیا وہ کم اہم نہیں ہے۔ ان افسانوں کی اپنی دنیا اور اپنی منطق ہے۔ اس میں کسی اجتماعی آدرش سے زیادہ انفرادی صورت حال نمایاں ہے۔ ایسا نہیں کہ ان افسانوں میں ایثار، قربانی اور آرزوئے زندگی کے عناصر نہ ملتے ہوں لیکن یہ سب عناصر فرد کے حوالے ہی سے بیان کیے گئے ہیں.......... حسانہ انیس نے اجزائے افسانہ کو رد نہیں کیا۔ بلکہ ان سے اپنے افسانوں میں کام لیا اور فنی ترتیب پیدا کی ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ حسانہ انیس زندگی کے حزن و غم کو ایسی پُر اثر تفاصیل کے ساتھ پیش کر سکی ہیں؟ شاید اس کی ایک وجہ ان کی غیر معمولی حساسیت ہے اور دوسری وجہ ان کا اندازِ نظر ہے جس میں فنی ندرت بھی موجود ہے۔ اگر افسانوں کا یہ مجموعہ سامنے نہ آتا تو ہم اس کرب سے اس طرح آشنا نہ ہوتے جس کے فنی طور پر پُر اثر اور نمایاں نقوش ہمیں ان افسانوں میں ملتے ہیں۔ حسانہ انیس کی افسانہ نگاری کی یہ ایسی خصوصیت ہے کہ جس سے اُردو افسانہ نگاری میں وہ یاد رکھی جائیں گی۔“ (”ڈوبتی ہوئی پہچان۔“ ص:۱۸)

کچھ یادیں

حسانہ انیس کے شریکِ حیات پروفیسر انیس الحق میرے سینئر دوستوں میں تھے۔ انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے اُردو اور فارسی میں ایم۔اے کیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے چند سال بعد وہ ڈھاکا پہنچے اور قائدِ اعظم کالج، ڈھاکا سے منسلک ہو گئے۔ وہ آخر وقت تک وہاں پڑھاتے رہے۔ میں نے ان کی طرح محنتی اور مسلسل جدوجہد کرنے والے اساتذہ بہت کم دیکھے ہیں۔ قائدِ اعظم کالج میں مستقل ملازمت کے علاوہ وہ بعض دوسرے کالجوں میں جز وقتی ملازمت بھی کرتے تھے۔ ریڈیو، ٹی وی اور صحافت سے بھی ان کا تعلق تھا۔ ریڈیو پاکستان ڈھاکا سے اُردو میں خبریں پڑھتے اور روزنامہ "پاسبان" میں مزاحیہ کالم لکھتے تھے۔

انیس الحق صاحب اتنی مصروفیات کے باوجود لکھنے پڑھنے کا وقت بھی نکال لیتے تھے۔ انھوں نے انٹر کے طلبا کے لیے "مضامین" اور "چند ادبی شخصیات" کے نام سے کتابیں بھی لکھیں۔ پاکستانی ثقافت کے موضوع پر انگریزی سے ایک کتاب کا ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً تنقیدی مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔

پروفیسر انیس الحق بڑے خوش مزاج، ملنسار اور با اخلاق انسان تھے۔ ایک عرصے تک (۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۹ء تک) گنڈیریا میں، میں ان کا پڑوسی رہا۔ میں ان کے گھر کے سامنے سے گزر کر اپنے گھر جایا کرتا تھا۔ آتے جاتے دن میں کئی بار ملاقات ہو جاتی تھی۔ گھر میں ہوتے تو اپنے باہر کے کمرے کا دروازہ کھول کر لکھتے پڑھتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی میں ان کے پاس کچھ دیر کے لیے رک جاتا۔ اس دور میں میں اپنی کتاب "اردو ادب اور اسلام" لکھ رہا تھا۔ گنڈیریا میں قیام کے دوران میں نے اپنی کتاب مکمل کی اور اس کی پہلی جلد ۱۹۶۹ء کے ابتدائی مہینوں میں چھپ کر لاہور سے آ بھی گئی۔ سب سے پہلے اس کتاب کو انیس صاحب ہی نے دیکھا۔ بہت خوش ہوئے، مبارک باد دی۔

اس زمانے میں ان کی بیگم حسانہ انیس مکمل طور پر ایک گھریلو خاتون تھیں۔ بڑی ہمدرد، ملنسار اور غم گسار۔ کبھی کبھی ہمارے یہاں بھی آتی تھیں۔ میری اہلیہ سے ان کے اچھے روابط ہو گئے

تھے۔ ۱۹۶۹ء کے آخر مہینوں میں میں نے میرپور سیکٹر ۱۳ میں ایک مکان خرید لیا اور وہاں منتقل ہو گیا۔ انیس صاحب میرے چھوڑے ہوئے مکان میں بحیثیت کرایہ دار منتقل ہو گئے، اس لیے کہ یہ مکان کچھ زیادہ کشادہ اور پُرسکون تھا۔

سقوطِ ڈھاکا کے بعد انیس صاحب مع اہل و عیال کراچی آ گئے۔ یہاں آنے کے بعد میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ حسانہ انیس ڈھاکا یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کر چکی تھیں، انھیں سرکاری کالج میں ملازمت مل گئی اور انیس صاحب پاکستان ٹی وی سے وابستہ ہو گئے۔ ایک عرصہ قبل یہیں سے ریٹائر ہوئے۔

حسانہ انیس آخر میں گورنمنٹ کالج اورنگی ٹاؤن کی پرنسپل ہو گئی تھیں۔ میں اپنی چھوٹی بیٹی حمیرا کو داخل کرانے وہاں لے گیا تو ان سے ملاقات ہو گئی۔ اس کے بعد بھی ایک دو بار ملاقات ہوئی۔ نئے کالج کی بنیادیں مضبوط کرنے کے سلسلے میں بہت مصروف رہا کرتی تھیں۔ گھر آنے کا وعدہ کیا لیکن نہ آ سکیں۔ اہلیہ نے ایک بار کالج جا کر ان سے ملاقات کی۔ اسی کالج سے حسانہ ۱۹۹۹ء میں ریٹائر ہوئیں۔

حسانہ انیس کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر ۲ رجولائی ۲۰۰۳ء کو انتقال کر گئیں۔ اللہ مغفرت فرمائے! سات بیٹے بیٹیوں کی ماں تھیں۔ سب بچوں کی تعلیم و تربیت میں پوری توجہ صرف کی اور دنیا سے سرخرو ہو کر اپنے مالکِ حقیقی کے حضور پہنچ گئیں۔

ع آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

❖❖

فرحت پروین ملک

(منفرد خاکہ نگار)

سوانحی خاکہ

نام: فرحت پروین ملک (بیگم پروفیسر نظیر صدیقی)

والد کا نام: پروفیسر ظفر حسن ملک (مرحوم)

تاریخ پیدائش: ۷/فروری ۱۹۳۲ء (صوبہ بہار۔ انڈیا)

تعلیم: انٹر آرٹس، ایڈن گرلس کالج، ڈھاکا

پہلی ہجرت: والدین کے ساتھ، تقسیم کے بعد، مشرقی پاکستان، کومیلا

دوسری ہجرت: نومبر ۱۹۶۹ء، کراچی۔ اسلام آباد

اولاد: ایک بیٹا، دو بیٹیاں

"دربارِ ادب"

فرحت پروین ملک ایک منفرد خاکہ نگار ہیں لیکن انھوں نے اپنے نامور شوہر پروفیسر نظیر صدیقی کی وفات (۲۰۰۱ء) کے بعد لکھنا شروع کیا اور وہ بھی احمد زین الدین (مدیر "روشنائی" کراچی) کے اصرار پر۔ ان کا پہلا خاکہ "آدھا مسلمان" "روشنائی" میں شائع ہوا اور اس ایک مضمون نے انھیں پوری دنیائے ادب سے روشناس کرا دیا۔ اچھے اچھے ادیب اور ادب شناس حیران

رہ گئے کہ ایک نئی لکھنے والی نے ایسا خاکہ کس طرح لکھ ڈالا۔ احمد زین الدین لکھتے ہیں:

''ان کے اچھوتے انداز اور منفرد طرزِ تحریر نے ابتدائی مضمون ''آدھا مسلمان'' سے ہی قارئین کو گرویدہ بنا لیا تھا۔ حتیٰ کہ صاحب الرائے اور مستند و معتبر ناقدین نے بھی ان مضامین کو بے حد سراہا۔''

(''دربارِ ادب۔'' عرضِ ناشر)

''آدھا مسلمان'' کے بعد فرحت صاحبہ نے متعدد خاکے لکھے اور ہر خاکے پر تحسین و آفرین کی صدا بلند ہوئی۔ ان خاکوں کا مجموعہ احمد زین الدین نے ''دربارِ ادب'' کے نام سے شائع کر دیا۔ ''دربارِ ادب'' بھی ایک خاکے کا نام ہے جو انھوں نے سلیم احمد پر لکھا تھا۔ اس کتاب میں چھ خاکے، دو مضامین، دو افسانے، چند خطوط اور ''خواب تماشا'' کے عنوان سے ان کی ۲۸ نثری نظمیں ہیں۔

ایک مضمون ''انجلا حیدری کون؟'' میں انھوں نے کچھ اپنے بارے میں لکھا ہے۔ چند اقتباسات دیکھیے:

''شادی کے بعد جب میں نے اپنی کچی پکی تحریریں دکھائیں تو آپ نے (نظیر صدیقی نے) فرمایا: 'لکھنا پڑھنا تمھارے بس کا کام نہیں۔ لکھنے پڑھنے والی لڑکیاں بہت مل جاتیں۔ کھانا پکانا سیکھو اور اچھی بیوی بننے کی کوشش کرو۔''

''قلم تختی جلا کر ساری زندگی مجازی خدا کے لیے بڑے جتن سے کھیر پکاتی رہی مگر میرے کام کچھ نہ آیا۔''

''گھر میں تنقیدی فضا نے میری خود اعتمادی کو بری طرح مجروح کیا۔ اچھی بیوی بننے کی کوشش میں پتہ نہیں میں کیا بن گئی یعنی 'کوئلہ بھئی نہ راکھ۔''

''دربارِ ادب'' میں چھ خاکے ہیں۔

۱۔ ''آدھا مسلمان'' (نظیر صدیقی مرحوم)

۲۔ ''تصویر'' (سرور بارہ بنکوی مرحوم)

۳۔ ''زوجہ صمد شاہین اور خاوند ممتاز شیریں'' (ممتاز شیریں مرحومہ)

۴۔ ''بیسویں صدی کا گوتم بدھ'' (ڈاکٹر اختر حمید خاں مرحوم)

۵۔ ''ایک دن ہم بھی بہت یاد کیے جائیں گے'' (پروفیسر اقبال عظیم مرحوم)

۶۔ ''دربارِ ادب'' (سلیم احمد مرحوم)

یہ سب خاکے شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قدرت نے فرحت پروین ملک کے قلم میں ایسا جادو بھر دیا ہے کہ جو پڑھتا ہے مسحور ہو جاتا ہے۔ ان کے خاکوں میں زندگی کے تجربات و مشاہدات کی رعنائیاں، انسانی دکھ درد کی گہرائیاں، جذبات و احساسات کی کرشمہ سازیاں، ادیبوں اور شاعروں کی لاابالیاں اور مصنفہ کی زندگی کی تلخیاں اس طرح گھل مل گئی ہیں کہ یہ خاکے مختلف رنگوں کے قوس و قزح بن گئے ہیں۔ جملوں اور فقروں کی بے ساختگی اور اندازِ بیان کی ندرت و انفرادیت ان پر مستزاد ہے۔ بقول غالبؔ

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

ان تمام خاکوں میں بھی (سوائے ایک خاکہ ''بیسویں صدی کا گوتم بدھ'' کے) نظیر صدیقی کی شخصیت نمایاں ہے اور بقول انور فرہاد یہ تمام خاکے انھیں کے گرد گھومتے ہیں۔ فرحت صاحبہ اپنے شریکِ حیات کے سلوک اور رویّوں سے بیزار اور شکوہ کناں نظر آتی ہیں لیکن ان کے دل میں ان کے لیے گہری محبت بھی ہے۔ یہ انسانی تعلقات کی عجیب کشمکش ہے جس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں۔

ان خاکوں سے چند اقتباسات دیکھیے:

''نظیر صدیقی اپنی مثال آپ تھے۔ دشمنوں کے دشمن۔ دوستوں کے دوست۔ کبھی کبھی

دوستوں کو بھی آئینہ دکھا دیتے تھے۔ اللہ کا حق تو کبھی ادا نہیں کیا مگر حقوق العباد کا خیال رکھا۔ مزاج میں فرض شناسی تھی۔ انھوں نے محبت کو بھی فرض بنالیا تھا (اور میں نے فرض کو محبت) سو گزارا ہو گیا۔"

("آدھا مسلمان")

"میری بدنصیبی رہی کہ انھیں خوش اور مطمئن کرنے کا ہر وظیفہ الٹا ہوتا رہا۔ ع محبت تو محبت سے بھی آسودہ نہیں ہوتی۔ بھلا ایسا مصرع کہنے والے کو آسودہ اور مطمئن کرنا میرے بس کا روگ نہیں تھا۔"

("آدھا مسلمان")

"اپنے اکلوتے بیٹے کے مستقبل کی فکر کی بجائے اپنے ادبی مستقبل کی فکر میں سرگرداں اور حال سے بے حال رہے۔"

("آدھا مسلمان")

"تمام عمر آدھی رات کو جاگنے والا آدھا مسلمان سورۂ فاتحہ، سورۂ اخلاص (مع ترجمہ) اور کلمہ پڑھ کر پورا مسلمان بن کر ہمیشہ کے لیے سو گیا۔ اللہ سے ان کا جھگڑا ختم ہو چکا تھا۔"

("آدھا مسلمان")

"ایک شام میری نئی نویلی ممانی ہمارے گھر تشریف لائیں۔ باہر کمرے میں چائے کا سامان دیکھ کر پوچھا، 'کوئی آیا تھا کیا؟' 'جی ہاں ابھی عطاء الرحمٰن جمیل اور سرور بارہ بنکوی اٹھ کر گئے ہیں'۔ میں نے انھیں بتایا۔ 'اچھا سرور بارہ بنکوی یہاں بھی آتے ہیں! بھئی تم ہمیں ان پیالیوں میں چائے مت دینا۔' آج کی افسانہ نگار شہناز پروین نے ایک ہی جملے میں اپنا علامتی افسانہ سنا دیا۔ میں سناٹے میں آگئی۔"

("تصویر")

"نظیر صاحب ہمیشہ حیرت میں مبتلا رہے۔ لوگ میرے خط کا جواب نہیں دیتے، حیرت

ہے! فلاں نے کتاب کی رسید نہیں دی، حیرت ہے! فلاں صاحب اسلام آباد آئے مجھ سے ملے بغیر چلے گئے، حیرت ہے! میں اتنا بیمار ہوں کوئی میری عیادت کو نہیں آیا، حیرت ہے! ایک دن مارے حیرت کے وہ دنیا چھوڑ گئے۔"

("زوجہ صمد شاہین اور خاوند ممتاز شیریں")

"شادی کو دو انسانوں کا ملاپ کہا جاتا ہے (ملاپ وغیرہ سب شاعری ہے) دراصل یہ دو انسانوں کا ٹکراؤ ہوتا ہے، زخمی سب ہوتے ہیں، کوئی کم، کوئی زیادہ، کچھ کہہ جاتے ہیں، کچھ سہہ جاتے ہیں۔

("بیسویں صدی کا گوتم بدھ")

مختصر یہ کہ "دربارِ ادب" ایک یادگار کتاب ہے۔ اس کتاب کی وجہ سے اس کی مصنفہ فرحت پروین ملک اردو ادب میں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

❖❖

پروفیسر شہناز پروین

(افسانہ نگار)

سوانحی خاکہ

نام: شہناز پروین

تاریخ پیدائش: ۱۷رنومبر ۱۹۴۷ء

مقام پیدائش: پٹنہ (بہار)

والد کا نام: ملک انوار الحق (مرحوم)

پہلی ہجرت: تقسیم کے بعد، والدین کے ساتھ، مشرقی پاکستان

تعلیم: ایم۔اے (اُردو)۔ ڈھاکا یونیورسٹی

ملازمت: درس وتدریس (سرکاری کالجوں میں)

شریکِ حیات کا نام: بدرالدین ملک

دوسری ہجرت: سقوطِ ڈھاکا کے بعد۔ کراچی

''آنکھ سمندر''

''آنکھ سمندر'' شہناز پروین کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے جو ۲۰۰۵ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ ۲۰۰۰ء میں پہلا مجموعہ ''سناٹا بولتا ہے'' کے نام سے شائع ہوا تھا جس میں ۱۳۲ افسانے تھے۔

صفحات ۲۲۶۔ اس کا دیباچہ ڈاکٹر حنیف فوق نے لکھا تھا۔ زیرِ نظر مجموعہ "آنکھ سمندر" ۱۸۴ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ۳۰ افسانے ہیں۔ شروع میں مصنفہ نے "میرا تخلیقی سفر" کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا ہے۔ کتاب میں چند مشہور نقادوں کی مختصر آرا بھی ہیں۔

شہناز پروین بچپن میں اپنے والدین کے ساتھ مشرقی پاکستان آ گئیں۔ ان کے والد پولیس افسر تھے۔ ان کی تقرری چاٹگام میں ہوئی۔ اس طرح شہناز پروین کا بچپن چاٹگام میں گزرا۔ ساتویں یا آٹھویں جماعت میں تھیں کہ ان کے والد کا تبادلہ ڈھاکا میں ہو گیا۔ لہٰذا شہناز پروین نے قمر النساء گرلز ہائی اسکول میں آٹھویں جماعت میں داخلہ لیا اور یہیں سے میٹرک پاس کر کے ایڈن گرلز کالج سے انٹر کیا۔ اس کے بعد ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی سے اردو میں بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے کیا۔ ان کی تقرری گورنمنٹ کالج میں بحیثیت لیکچرار ہو گئی، لیکن چند سال کے بعد ہی سقوطِ ڈھاکا کا المیہ پیش آ گیا۔ ان کی شادی غالباً ۱۹۶۸ء یا ۱۹۶۹ء میں ہو گئی تھی۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد شہناز پروین کراچی آ گئیں۔ یہاں سرکاری کالجوں میں ایک عرصے تک ملازمت کے بعد اب ریٹائر ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر حنیف فوق، شہناز پروین کی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"شہناز پروین افسانہ نگاروں کی اس نسل سے تعلق رکھتی ہیں جس کے سامنے افسانہ نگاروں کی روایات کا ایک بڑا سرمایہ موجود تھا اور اس سرمائے میں انسان دوستی اور مثبت اقدار کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی مگر نہ صرف باہر کی دنیا میں شکست و ریخت کا عمل جاری تھا، بلکہ خود فنی اظہار کے سانچے بھی ٹوٹ رہے تھے اور افسانہ نگار کی نظر ہی پرچھائیوں میں الجھی ہوئی نہیں تھی، اس کا باطنی نظام بھی درہم برہم ہو رہا تھا۔ ان حالات میں شہناز پروین نے زندگی کی اچھائیوں سے اپنا واسطہ رکھا ہے اور ٹوٹتے ہوئے انسانی رشتوں کے درمیان انسانیت کی تلاش کو فراموش نہیں کیا ہے۔"

("آنکھ سمندر")

اس میں شک نہیں کہ شہناز پروین کے نظریات بھی نفیس، حیات آمیز و حیات آموز اور قابلِ قدر ہیں اوران کے افسانے بھی۔ ان کے افسانوں کا ادبی وفنی معیار بھی بلندو پاکیزہ ہے۔ ان کے افسانوں میں کسی قسم کی عریانی وفحاشی نہیں۔ انداز بیاں نہایت واضح اور غیر مبہم ہے۔ وہ کوئی ناشائستہ لفظ بھی استعمال نہیں کرتیں۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ نوجوانوں کے ترک وطن کر کے غیر ممالک میں بس جانے کی وہ قائل نہیں۔ اس سلسلے میں ان کے بعض پُر اثر افسانے مثلاً ''گھر کا گلاب''، ''درد کا سفر'' اور ''بے زمیں بے آسماں'' اس مجموعے میں موجود ہیں۔ لیکن یہ بات بھی عجیب ہے کہ خود شہناز پروین کا شادی شدہ بیٹا اور بیٹی غیر ملک میں جا بسے ہیں۔

جمیل عثمان

(افسانہ نگار)

جمیل عثمان اپنی کتاب ''جلاوطن کہانیاں'' کی وجہ سے مشہور و معروف ہیں۔ اس افسانوی مجموعے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تمام افسانوں کا تعلق سقوطِ مشرقی پاکستان کے المیہ سے ہے۔ اس مجموعے کی بڑی پذیرائی ہوئی۔

جمیل عثمان کے حالاتِ زندگی سے ہم واقف نہیں، ان دنوں کتابوں میں مصنف کا سوانحی خاکہ بھی درج کر دیا جاتا ہے لیکن اس کتاب میں وہ بھی نہیں۔ بہرحال اتنا معلوم ہوسکا ہے کہ وہ کھلنا میں رہتے تھے۔ ان کے ایک افسانے سے اندازہ ہوا کہ سقوط کے وقت وہ انٹر کے طالب علم تھے۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد جمیل عثمان کراچی آ گئے۔ یہیں ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۲ء کے درمیان یہ کہانیاں لکھی گئیں اور مختلف رسالوں میں شائع ہوتی رہیں۔ کئی سال تک یہاں قیام کرنے کے بعد وہ امریکہ چلے گئے۔ ایک عرصے سے ان کا قیام امریکہ میں ہے۔

''جلاوطن کہانیاں''

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۹۷ء میں اور دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۰ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ کتاب گیارہ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ پیش لفظ یا تقریظیں ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، میرزا ادیب، بیگم آفتاب اقبال، منور ہاشمی اور نسیم سحر نے لکھی ہیں۔ صفحات ۱۴۴۔

جمیل عثمان اپنے دیباچہ "حکایتِ دل" میں لکھتے ہیں:

"یہ افسانے ایک نوجوان کے تجربات و مشاہدات ہیں جنھیں اس نے جیسا دیکھا اور محسوس کیا، بلاکم وکاست سپردِ قلم کر دیا۔ یہ واقعات شاید مورخ کی نظروں سے پوشیدہ رہتے۔ ان افسانوں کا محرک صرف ایک جذبہ ہے، پاکستان سے محبت...... بے انتہا محبت۔

تمام افسانوں کا پس منظر 'سقوطِ مشرقی پاکستان' ہے۔ اس لحاظ سے آپ انھیں 'سقوطِ ڈھاکا کے افسانے' بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ کہانیاں ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۲ء کے درمیانی عرصے میں مختلف جرائد ورسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

اکثر دوستوں نے تنقید کی کہ یہ کیا تم ہر وقت مشرقی پاکستان کو لے بیٹھے رہتے ہو؟ لیکن سچ پوچھیے تو یہ اتنا بڑا المیہ ہے کہ سارے پاکستانی اس پر ساری عمر بھی روتے رہیں تو کم ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ صرف روتے ہی نہ رہیں بلکہ اپنی غلطیوں سے سبق بھی سیکھیں، جو کہ افسوس ہم نے نہیں سیکھا۔"

("جلاوطن کہانیاں۔" ص: ۲۰۔۲۱)

"جلاوطن کہانیاں" کے بارے میں نسیم دُرّانی (مدیر "سیپ" کراچی) لکھتے ہیں:

"جلاوطن کہانیاں، ہماری قومی تاریخ کے المناک اور روح فرسا باب یعنی 'سقوطِ مشرقی پاکستان' کے حوالے سے لکھی گئی ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ یہ المیہ ہر پاکستانی کی روح کا ایسا زخم بن چکا ہے جو بظاہر نظر نہ آنے کے باوجود اندر اندر رستا رہتا ہے اور شاید ہمیشہ رستا رہے گا۔ جمیل عثمان نے بھی اس سانحۂ دل گداز کو اپنی روح کی گہرائیوں تک محسوس کیا اور واقعات و کردار کے حوالے سے ایک تصویر بنانے کی کوشش کی۔ ان کے یہاں عبارت آرائی کی بجائے سادہ بیانی، روانی اور سلاست ہے، مشاہدے کی قوت ہے اور اظہار کا سلیقہ بھی۔ یہ سادہ اور بیانیہ انداز کہانی کہنے کے فن کی اساس ہے۔

یہ سب کہانیاں خیال کی سطح پر اور موضوع کی مناسبت سے ایک تسلسل کا تاثر پیش کرتی ہیں، مگر ایک اجتماعی تباہی اور المیے میں چھوٹے چھوٹے انفرادی المیے اور عذاب، الگ الگ کہانیوں کی شکل میں، زنجیر کی کڑیوں کی طرح مربوط ہیں۔"

(فلیپ "جلاوطن کہانیاں")

جمیل عثمان کا دوسرا افسانوی مجموعہ "پری خانے کے مسافر" چند سال پہلے شائع ہو چکا ہے۔ حالیہ کارنامہ ان کا ڈراما "بساط" ہے جو ۳۳۶ صفحات اور اکیس ایکٹ پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں کتابیں میری نظر سے نہیں گزریں۔

❖❖

دیگر نثر نگار

مذکورہ بالا نثر نگاروں کے علاوہ بھی بہت سے نثر نگار سقوطِ ڈھاکا کے بعد کراچی اور پاکستان کے دوسرے شہروں میں قیام پذیر ہوئے۔ ان میں سے کچھ گوشہ نشیں رہے اور بعض نے ادبی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ان میں سے چند ممتاز شخصیتوں کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر اہلِ قلم کا تذکرہ "محفل جو اجڑ گئی" میں کیا جا چکا ہے۔

ڈاکٹر سیّد مظفر الدین ندوی

ڈاکٹر سیّد مظفر الدین ندوی (۱۹۰۰ء-۱۹۸۳ء) ایک بلند پایہ عالم، ماہر تعلیم اور محقق و مصنف تھے۔ ایک عرصے تک مغربی بنگال اور مشرقی بنگال (مشرقی پاکستان) کے کالجوں میں عربی، فارسی اور اُردو پڑھاتے رہے اور وائس پرنسپل اور پرنسپل کے فرائض بھی انجام دیے۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۷ء تک ڈھاکا یونیورسٹی سے بھی منسلک رہے۔ انھیں انگریزی تحریر و تقریر پر بھی قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے زیادہ تر انگریزی اور اُردو میں کتابیں لکھیں۔ ڈھاکے سے ان کی کئی انگریزی کتابیں اور ایک اُردو کتاب "اسلامی تعلیم و تربیت" شائع ہوئی۔ سقوطِ ڈھاکا سے پہلے ڈاکٹر صاحب کراچی آ گئے تھے۔ یہاں بھی تصنیف و تالیف کا کام جاری رہا۔ ۱۹۸۳ء میں کراچی میں وفات پائی۔ اللہ مغفرت فرمائے!

عبدالرؤف فاطمی

عبدالرؤف فاطمی قایدِ اعظم کالج، ڈھاکا کے پرنسپل کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے۔ وہ ایک دبنگ شخصیت کے انسان تھے۔ عمر کا بیشتر حصّہ کلکتہ اور ڈھاکا میں گزرا۔ کلکتہ یونیورسٹی سے تاریخ اور اُردو میں ایم۔اے کیا۔ شروع میں صحافت سے تعلق رہا۔ ۱۹۵۰ء میں ڈھاکا آئے اور درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ انھیں اُردو اور انگریزی تحریر و تقریر پر یکساں عبور حاصل تھا۔ اسلامی اور تاریخی موضوعات پر بہت سے مضامین لکھے۔

سقوطِ ڈھاکا کے بعد کراچی آگئے۔ یہاں بھی ان کی علمی اور ادبی سرگرمیاں جاری رہیں۔ کراچی آنے کے چند سال بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ اللہ مغفرت فرمائے۔

سیّد مصطفیٰ حسن

سیّد مصطفیٰ حسن مالک و مدیرِ اعلیٰ روزنامہ ''پاسبان'' ڈھاکا، ایک اچھے مضمون نگار بھی تھے۔ ۱۹۵۱ء میں انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے تاریخ میں ایم۔اے کیا اور اسی سال ڈھاکا چلے آئے۔ ۱۹۵۴ء میں ''پاسبان'' خرید لیا۔ ''پاسبان'' ۱۹۶۹ء تک نکلتا رہا۔ اس میں انھوں نے علمی، سیاسی اور تاریخی موضوعات پر بہت سے مضامین لکھے۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد مصطفیٰ حسن صاحب کراچی آگئے۔ یہاں ایک عرصے تک فالج زدہ حالت میں زندگی گزارنے کے بعد انتقال کر گئے۔ اللہ مغفرت فرمائے۔

کلیم اللہ فہمی

کلیم اللہ فہمی، سابق ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان، ایک اعلیٰ درجے کے مضمون نگار، افسانہ نگار، ڈراما نگار، مترجم، صحافی اور شاعر تھے۔ ان کی عمر کا بیشتر حصّہ کلکتہ اور ڈھاکے میں گزرا۔ انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے اسلامی تاریخ میں ایم۔اے کیا تھا۔ انھیں اُردو اور انگریزی کے علاوہ

بنگلہ زبان پر بھی دسترس حاصل تھی۔ انھوں نے بنگلہ، ہندی، مراٹھی اور انگریزی سے بے شمار افسانے اُردو میں ترجمہ کیے۔ بنگلہ زبان وادب سے متعلق بہت سی تقریریں ریڈیو پاکستان سے نشر کیں۔

چند سال قبل کراچی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اللہ مغفرت فرمائے!

حبیب انصاری

حبیب انصاری، سابق جنرل سکریٹری انجمن ترقیِ اُردو مشرقی پاکستان، ڈھاکا، ایک اچھے مضمون نگار، صحافی اور مقرر بھی تھے۔ ان کا تعلق فرنگی محل، لکھنؤ سے تھا۔ وہیں تعلیم وتربیت ہوئی اور صحافت سے وابستہ ہوگئے۔ غالباً ۱۹۴۹ء میں ڈھاکا آگئے۔ پہلے ریڈیو، ڈھاکا میں ملازمت کی۔ یہاں انھوں نے دو سو فیچر پروگرام لکھے۔ دو سال کے بعد ریڈیو سے الگ ہوگئے اور تجارت کرنے لگے اور اس میں بہت کامیاب رہے۔ تجارت کے ساتھ ادبی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ ایک عرصے تک ''انجمن ترقیِ اُردو'' کے سکریٹری جنرل رہے اور اس سلسلے میں اُردو زبان وادب کی بڑی خدمت کی۔ انجمن کی نئی عمارت تعمیر کی اور اس کے کتب خانے کو بہت فروغ دیا۔

سقوطِ ڈھاکا کے بعد حبیب انصاری کراچی آگئے۔

حافظ مقصود احمد اصلاحی

حافظ مقصود احمد اصلاحی (۱۹۳۰ء-۱۹۸۷ء) ایک ممتاز عالم، مصنف اور صحافی تھے۔ اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ان کا پورا گھرانا عالم وحافظ تھا۔ ''مدرسہ سرائے میر، اعظم گڑھ'' میں تعلیم حاصل کی جہاں انھیں علامہ امین احسن اصلاحی سے کسبِ فیض کا موقع ملا۔ ۱۹۵۰ء میں مشرقی پاکستان آگئے۔ چاٹگام میں قیام رہا۔ ان کی مضمون نگاری اور ادبی سرگرمیوں کا آغاز یہیں سے ہوا۔ روزنامہ ''جنگ'' اور روزنامہ ''مشرق'' میں مضامین لکھتے رہے۔ ریڈیو پاکستان، چاٹگام سے ان کی تقریریں بھی نشر ہوتی رہیں۔ کئی کتابچے لکھے مثلاً ''اسلام یا سوشلزم''، ''اسلامی ریاست کا خاکہ'' اور

"پاکستان کے خلاف سازشیں"۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد کراچی آ گئے۔ یہاں "نوائے وقت" میں ان کے مضامین چھپتے رہے۔ ۲۱ رجنوری ۱۹۸۷ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ اللہ مغفرت فرمائے!

شہزاد اختر

شہزاد اختر مشرقی پاکستان کے ممتاز افسانہ نگاروں میں تھے۔ نام ابوالفضل انوار اور قلمی نام شہزاد اختر ہے۔ غالباً ۱۹۵۰ء میں ڈھاکا آئے۔ تعلیم یہیں مکمل کی۔ ڈھاکا یونیورسٹی سے اُردو میں ایم۔ اے کیا۔ ڈھاکا ریڈیو میں ان کا تقرر ہوا۔ سقوطِ ڈھاکا سے چند سال پہلے ان کا تبادلہ اسلام آباد ہو گیا۔ وہیں سے ریٹائر ہوئے۔ قیام اب تک اسلام آباد میں ہے۔

شہزاد اختر کے افسانے زیادہ تر مشرقی پاکستان کی معاشرت اور اس کے مسائل سے متعلق ہوئے تھے۔ ان کا ایک افسانہ "جونک" بہت مشہور ہوا۔ اسلام آباد آ کر انھوں نے بہت کم لکھا۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "دیوانے کا خواب" زیرِ طبع ہے۔

منظور احمد

منظور احمد ایک منفرد مکتوب نگار اور مضمون نگار کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ان کا تعلق دہلی سے ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ڈھاکا آ گئے۔ ڈھاکے میں ملبوسات کا کاروبار کرتے تھے۔ انھیں ادبی محفلوں اور مشاعروں سے بڑی دلچسپی تھی تقریر بھی بڑی دلچسپ کرتے تھے۔

سقوطِ ڈھاکا کے بعد کراچی آ گئے۔ یہاں انھوں نے محصورینِ بنگلہ دیش سے متعلق مسلسل خطوط اور مضامین لکھے۔ اندازِ بیاں ایسا کہ "وہ کہیں اور سنا کرے کوئی"۔ ایک عرصے سے گوشہ نشیں ہیں۔

❖❖

اختتامیہ
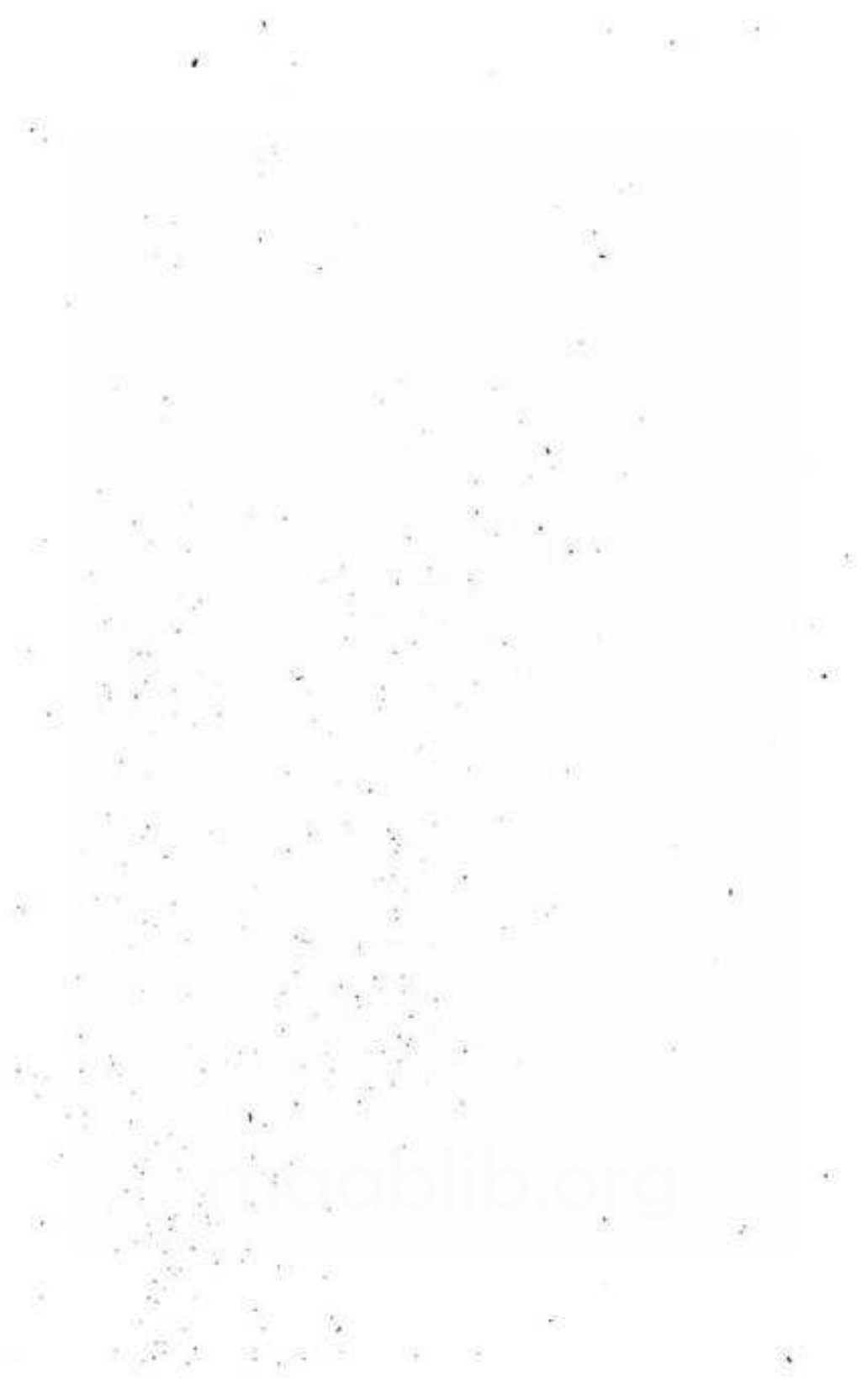
متاعِ درد

(شعری مجموعہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے حوالے سے)

اختر لکھنوی کے "دیدۂ تر" (۱۹۸۶ء) کے بعد میرا شعری مجموعہ "متاعِ درد" (مطبوعہ ۲۰۰۳ء) دوسرا مجموعہ ہے جو تمام تر سقوطِ مشرقی پاکستان کے حوالے سے ہے۔ یہ مجموعہ چونکہ زیادہ تر نظموں پر مشتمل ہے، اس لیے اس میں اس المیۂ عظیم کی ترجمانی یا عکاسی زیادہ وضاحت سے ہوئی ہے۔ یہ مجموعہ ۳۸ نظموں اور ۲۵ غزلوں پر مشتمل ہے۔ یہاں پروفیسر اظہر قادری اور شفیق احمد شفیق کی تقریظوں کے دو اقتباس درج کیے جاتے ہیں۔

پروفیسر اظہر قادری

"خود شاعر کے مطابق 'متاعِ درد' کی بیشتر غزلیں اور نظمیں ۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۵ء کے درمیان لکھی گئیں۔ اس لحاظ سے اس مجموعے میں اس عہد کی عبرت انگیز داستان نہایت موثر انداز سے رقم ہوئی ہے۔ اس حوالے سے 'متاعِ درد' ایک شعری مجموعہ ہی نہیں بلکہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اس کربناک عہد کی جھلکیاں صاف دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس مجموعے کی ایک بڑی بات یہ ہے کہ یہ اپنے عہد کی تاریخ ہی نہیں بلکہ اچھی شاعری کی مثال بھی ہے۔"

شفیق احمد شفیق

''پوری کتاب میں فکر اور فن بڑے دلآویز انداز میں ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہیں۔ بلا شک وشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کی غزلوں، نظموں اور شعروں سے نہ صرف المیہ مشرقی پاکستان کی عکاسی ہوتی ہے بلکہ خود پروفیسر ہارون الرشید کی شاعرانہ فعالیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ کتاب اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ان کے اندر بے پناہ تخلیقی صلاحیت موجود ہے۔ لفظوں کے دروبست اور نشست وبرخاست کے رموز سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ایسے قیامت خیز موضوع کو بیان کرتے وقت ان کے لہجے میں اشتعال کا شائبہ تک نہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس قسم کے مشتعل موضوعات کو شعری پیکر میں ڈھالتے وقت قلم کار خود کو قابو میں نہیں رکھ پاتا اور جذباتیت اور سطحیت کا شکار ہو کر فن کو مجروح کر دیتا ہے۔ قابلِ تعریف ہیں پروفیسر ہارون الرشید کہ انھوں نے فکر و فن میں توازن رکھتے ہوئے کامیاب شاعری کا مظاہر کیا ہے اور حقائق کو جمال و کمال کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔''

عمادالرحمٰن شکیل کی رائے

عمادالرحمٰن شکیل (مشہور و ممتاز شاعر عطاءالرحمٰن جمیل کے چھوٹے بھائی جو خود بھی وسیع مطالعہ شاعر اور صاحبِ نظر نقاد ہیں) مصنف کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''متاعِ درد کو پڑھ کر مجھے ملٹن (Milton) کی 'Paradise Lost' یاد آئی۔ کاش اس کتاب کی نظموں کا انگریزی ترجمہ شائع ہو جاتا، تاکہ مغربی ممالک کے لوگ بھی پڑھ سکتے۔ غزل کا ترجمہ ممکن نہیں، کیونکہ غزل دل کی آواز ہے اور آواز کا ترجمہ نہیں ہو سکتا، کتاب کے متعلق یہ عرض ہے کہ:

وہیں لگی ہے جو نازک مقام تھے دل کے

چند نظمیں اور غزلیں

''متاعِ درد'' میں سب نظمیں مختصر ہیں۔ ذیل میں گیارہ نظمیں اور تین غزلیں پیش کی جاتی ہیں تاکہ اس المیۂ عظیم کی کسی قدر عکاسی ہو جائے۔

۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء

ذرا دیکھو تو دن تاریک اتنا ہو گیا کیسے؟
ٹپکتے دیدۂ ملّت سے ہیں کیوں خون کے قطرے
ہوئی طاغوتیوں کی فتح کیسے حق پرستوں پر
قلعہ اسلام کا مسمار آخر ہو گیا کیسے؟
جدھر بھی دیکھیے ہے رقص میں ابلیس کا لشکر
کہاں گم ہو گئے نغمے محبت کے اخوت کے
یہ کشت و خون، یہ غارت گری، یہ شور و ہنگامہ
لرزتی ہے زمیں ساری قیامت آ گئی جیسے
کسے الزام دوں، کس کو سناؤں میں فغاں اپنی
الٰہی ہو گیا کیسے یہ میرا جسم دو ٹکڑے

سانتاہار

(سانتاہار شمالی بنگال کا ایک چھوٹا شہر تھا جس کی آبادی تقریباً پچاس ہزار تھی۔ یہ پوری آبادی مہاجروں پر مشتمل تھی جن میں اکثریت ریلوے ملازموں کی تھی۔ یہاں مارچ ۱۹۷۱ء میں قتلِ عام کر کے پوری آبادی کو ختم کر دیا گیا)

شہر میں اس قدر سکوت ہے کیوں؟
کتنے سنسان ہیں یہ راہ گزر
کتنے ویراں ہیں کوچہ و بازار
رونقیں کیا ہوئیں مکانوں کی
گم کہاں ہو گئے مکیں سارے
کوئی بچہ بھی اب نہیں روتا
ماں کوئی لوریاں نہیں دیتی
لڑکیاں گیت اب نہیں گاتیں
نوجواں شور اب نہیں کرتے
مدرسے کیوں پڑے ہیں بند سبھی
کوئی ڈھونڈے کہاں گئے آخر
پڑھنے والے پڑھانے والے سب
کارخانوں میں ایسا سناٹا!
ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا
مسجدوں میں اذاں نہیں ہوتی
کوئی آتا نہیں مصلّی بھی
محفلِ شعر ہے نہ بزمِ ادب
قہقہے، چہچہے نہ اب گپ شپ
راستوں پہ یہ خون کے دھبے
صحن۔ مسجد میں خون کے چھینٹے
کوئی بتلائے ماجرا کیا ہے؟

ڈھاکا سینٹرل جیل

(ڈھاکا سینٹرل جیل میں ڈھائی ہزار قیدیوں کی گنجائش تھی۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد میر پور اور محمد پور سے دس ہزار سے زیادہ مہاجر نوجوانوں کو گرفتار کر کے وہاں بند کر دیا گیا۔ راقم بھی اس جمِ غفیر میں شامل تھا)

ہے قید خانے میں یہ جشن کا سماں کیسا؟
کہاں سے آئے ہیں یہ دس ہزار دیوانے؟
ذرا بتاؤ تو ان قیدیوں کا جرم ہے کیا؟
"یہ ارضِ پاک کے شیدا ہیں، جرم کیا کم ہے
مقابلے میں صف آرا ہیں، جرم کیا کم ہے
عدو ہمارے جو ہیں، ان کا دم یہ بھرتے ہیں
دفاعِ ارضِ وطن میں جہاد کرتے ہیں
ہمارے باغی جواں در بدر ہوئے سارے
مخالفت میں یہ ان کی بھی پیش پیش رہے
یہ قومیت کے تصور پہ وار کرتے رہے
یہ جرم وہ ہے جسے بار بار کرتے رہے
ہم اپنے 'دیش' کو اب ان سے پاک کر دیں گے
ہم ان کی دامنِ ہستی کو چاک کر دیں گے"

مولوی فرید احمد

(مولوی فرید احمد نظامِ اسلام پارٹی کے رہنما تھے۔ وہ قومی اسمبلی کے ممبر اور مرکزی وزیر بھی رہ چکے تھے۔ وہ نظامِ اسلام کے پُر جوش داعی اور محبِ وطن پاکستانی تھے۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد انھیں صرف قتل ہی نہیں کیا گیا بلکہ ان کے جسم کے ٹکڑے کر دیے گئے۔ اللہ ان کی روح پر بے شمار رحمتیں نازل کرے۔ آمین)

مبارک ہو تمھیں ایسی سعادت
عطا مولا نے کی تم کو شہادت
مجاہد تھے یقیناً دین کے تم
زمینِ پاک سے تھی تم کو اُلفت
وفا داری تھی ایماں کا تقاضا
وطن سے کس طرح کرتے بغاوت
مقابل تم جو غداروں کے آئے
انھیں بھی ہو گئی تم سے عداوت
وطن کے واسطے جان اپنی دے دی
مبارک ہو فرید احمد شہادت!

منزلِ ویراں

جانے کس منزلِ ویراں پہ مجھے لائی حیات
نہ کہیں نکہتِ گل
نہ کہیں حسنِ چمن
ایک صحرائے عظیم
دور تک ریگ ہی ریگ
گم ہوئے سرو و سمن، کھو گیا میرا چمن
لٹ گیا دل کا جہاں
ہائے یہ شورشِ جہاں

التجائے آذر

دست و بازو مرے شل ہو گئے اے بارِ الٰہ!

کتنے بُت میں نے تراشے ہیں تری دنیا میں
کتنے اصنامِ خیالی کو دیے میں نے وجود
میں نے انسان کو بخشے ہیں ہزاروں معبود
میری فن کاری سے فرعون بنا ربِّ عظیم
اور نمرود کے پیکر نے کہا "میں ہوں خدا"
ہر نئے دور کو اک تازہ خدا میں نے دیا
نسل کے بُت بھی دیے اور وطن کے بُت بھی
رنگ و خوں کو بُتِ طنّاز بنایا میں نے
میں نے اصنام بنائے ہیں انا کے اکثر
میں نے ڈھالے ہیں بہت حرص و ہوس کے پیکر
پھر بھی انسان کو رہتی ہے نئے بُت کی تلاش
اب نہیں مجھ میں نئے بُت کے بنانے کی سکت

میری امداد کو پھر بھیج براہیم کوئی!

آج کی رات

آج کی رات تو پھر نیند نہیں آئے گی

پے بہ پے آج تری یاد کے جھونکے آئے
آج پھر دل کو ملا سوزِ تمنا کا پیام
دستِ ساقیِ شبِ تار میں ہے درد کا جام

تیری اک ایک ادا رقص کرے گی شب بھر
چشمِ بے تاب کو نظارے کی دعوت دے گی
اور پھر میرا دلِ زار تڑپ اٹھے گا

اے مغنی مرے تو چھیڑ دے اب تارِ حیات
آج کی رات کوئی درد بھرا گیت سُنا!
آج کی رات اٹھا دے رُخِ نغمہ سے نقاب

آج کی رات بہت درد کے ساماں ہیں بہم
بسترِ خواب بنا کانٹوں کا بستر ہمدم!
کروٹیں لیتے ہوئے رات گزر جائے گی
آج کی رات تو پھر نیند نہیں آئے گی

ارضِ پاک کے نام

اے نگارِ آرزو تیرے لیے
کیسے کیسے ظلم دنیا کے سہے
کاروانِ رنگ و بو لوٹا گیا
سارے ارمانوں کے گلشن جل گئے
بے کسی، بے چارگی، آزردگی
تیری چاہت کے ملے کیا کیا صلے

آج بھی الفت میں تیری جانِ جاں!
نغمۂ جذب و جنوں گاتے ہیں ہم
یاد رگ رگ میں سمائی ہے تری
دل کی دھڑکن میں تجھے پاتے ہیں ہم
تجھ پہ قرباں ہیں ہزاروں جنتیں
تیری عظمت کی قسم کھاتے ہیں ہم

سوزشِ غم

بستیاں شوق کی ہوئیں ویراں
اے مرے دل بتا کہ جاؤں کہاں؟
اب نہ ہمدم نہ ہم زباں کوئی
میزباں ہے نہ میہماں کوئی
ایک دل وہ بھی بے قرار و حزیں
اب تو کوئی بھی غم گسار نہیں
منزلِ شوق کا پتا نہ نشاں!
لے کے جاؤں کہاں یہ سوزِ نہاں؟
دل کو پہلو میں لے کے سو جاؤں
غم کی پہنائیوں میں کھو جاؤں

سسکی

رات کی بے کراں خموشی میں
کسی کی سسکی کی یہ صدا آئی
کس کے سینے کا درد جاگ اٹھا
کس کے زخموں نے لی ہے انگڑائی

آہ جاتی ہے کس کی سوئے فلک
کارواں راہ میں لٹا کس کا؟
یا پٹکتا ہے سر کوئی بے بس
آشیاں سامنے جلا کس کا؟

یا ہوا کی یہ نوحہ خوانی ہے
یا چھلکتا ہے درد کا ساگر؟
یا سسکتی ہے روح دھرتی کی
قلبِ انساں کی پائمالی پر

الوداع اے شہرِ ڈھاکا!

الوداع اے شہرِ ڈھاکا، میرے غم کے رازداں
ثبت ہے سینے پہ تیرے خاک و خوں کی داستاں
کھا گئی کس ظالمِ بد بخت کی تجھ کو نظر؟
تو کہ تھا گہوارۂ عیش و طرب، امن و اماں

تو لٹاتا تھا کبھی مہر و محبت کے گہر!
تیری گلیاں بھی دمکتی تھیں مثالِ کہکشاں!
بے نواؤں پر نوازش، بے سہاروں پر کرم
یاد ہے اب تک مجھے وہ تیری طرزِ دل ستاں
کس طرح اس بزم کو دل بھول سکتا ہے مرا
"شعر ڈھلتے تھے جہاں، نغمے بکھرتے تھے جہاں"
یاد آئیں گے ترے اسکول، کالج، جامعہ
کتنے اچھے دن گزارے میں نے جن کے درمیاں
ایک دنیا درد کی لے کر تری محفل سے اب
جا رہا ہے تیرا ہاروںؔ بے نوا و خستہ جاں

غزل

اپنے بچھڑے ہوؤں کو میں ڈھونڈوں کہاں
اب تو بڑھنے لگا میرا دردِ نہاں
شہر سارا کا سارا ہی ویران ہے
قتل کرتا ہے یوں بھی کوئی میری جاں!
میری غارت گری ان کے ہاتھوں ہوئی
دل نے سمجھا تھا اپنا جنھیں رازداں
بزمِ عیش و طرب پھر سجائی گئی!
وہ مٹا کر ہمیں ہیں بہت شادماں
شوق کی راہ میں کیسی منزل ہے یہ
حُسن بھی بدگماں، عشق بھی بد گماں

نسل کے بُت تراشے گئے کو بہ کو
عام ہونے لگا شیوۂ آذراں
پھر خدائی کا دعویٰ ہے نمرود کو
پھر ہے عزمِ براہیمؑ کا امتحاں

ظلم ایسا کبھی ہوا تو نہ تھا
قافلہ یوں کبھی لُٹا تو نہ تھا
چوٹ ایسی کبھی لگی تو نہ تھی
درد ایسا کبھی ملا تو نہ تھا
آج رنگیں ہے صحنِ مسجد بھی
خون ایسا کبھی بہا تو نہ تھا
لوگ ایسے نہیں تھے مہر بہ لب
ہونٹ ایسا کبھی سِلا تو نہ تھا
مرگِ انبوہ بھی ہے قابلِ دید
جشن ایسا کبھی ہوا تو نہ تھا
ایسی صرصر کبھی چلی تو نہ تھی
نخلِ امید یوں جلا تو نہ تھا
رات کی بے کراں خموشی میں
ایسا نالہ کبھی سُنا تو نہ تھا

میں ایک شاخِ بُریدہ چمن میں جلتا ہوں
غریبِ شہر ہوں اپنے وطن میں جلتا ہوں

ملا ہے درد غزالوں کے دیس میں آ کر
دیارِ شوق، سوادِ ختن میں جلتا ہوں
جلا رہی ہیں پھواریں یہ باد و باراں کی
ہجوم لالہ و سرو و سمن میں جلتا ہوں
ابھی ہزار مراحل ہیں شوق کے باقی
ابھی تو منزلِ رنج و محن میں جلتا ہوں
بجھے تو کیسے بجھے دل کی آگ اے ہاروںؔ
میانِ موجۂ گنگ و جمن میں جلتا ہوں

بستیاں شوق کی لٹ گئیں، مٹ گئیں، زندگی کا نشاں دور تک اب نہیں
ایسا آیا تھا اک سیلِ ظلم و ستم، ولولے دل کے سارے بہا لے گیا
میں ہوں ہاروںؔ اک شاعرِ بے نوا، مجھ کو بغض و عداوت سے کیا واسطہ
جس نے لوٹا مری آرزو کا چمن، جاتے جاتے وہ میری دُعا لے گیا

❖❖

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میری تمام سرگزشت

خاندان

میری داستانِ حیات میں پدرم سلطان بود کہنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ سو پشت سے پیشۂ آبا مزدوری اور محنت کشی تھا۔ میرے دادا روشن علی مرحوم کلکتہ کے ایک جوٹ مل میں مزدوری کرتے تھے۔ وہ ان پڑھ لیکن راست باز اور بلند کردار انسان تھے۔ ان کے بارے میں بچپن سے دو باتیں سنتا آیا ہوں۔ انھوں نے اپنی داڑھی پر کبھی استرا نہیں چلایا اور ہوٹل، بیکری یا باہر کی کوئی چیز کبھی نہیں کھائی۔ میرے والد غلام حسین مرحوم ایمبرائیڈری کے کاریگر تھے اور کچھ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اپنی خوش اخلاقی اور ملنساری کی وجہ سے اپنے علاقے میں بہت مقبول تھے۔ میرے نانا محمود حسین مرحوم کوئلے کا کاروبار کرتے تھے اور نسبتاً خوش حال تھے۔ میری والدہ قمر النساء مرحومہ ان کی اکلوتی بیٹی تھیں۔

میرے دادا اور دادی (جسیمہ بی بی مرحومہ) غازی پور (یوپی) کے تھے اور میرے نانا اور نانی (مریم بی بی مرحومہ) آرہ (بہار) کے تھے۔ ان دونوں خاندانوں نے کلکتے میں مستقل رہائش اختیار کر لی تھی۔ (اس طرح مشرقی یوپی اور بہار کے ہزاروں خاندانوں نے کلکتے کو اپنا مسکن بنا لیا تھا)۔ میرے والد اور والدہ کی پیدائش بھی کلکتے کی تھی۔

میرے دادا نوجوانی میں کلکتہ آئے۔ وہ غیر شادی شدہ تھے۔ انھوں نے یہاں غازی پور کی ایک بیوہ خاتون سے شادی کی جن کی ایک بیٹی بھی تھی۔ یہی میری دادی تھیں۔ میرے دادا نے سوتیلی بیٹی کی پرورش و کفالت بھی اپنی بیٹیوں کی طرح کی۔ یہی ہماری بڑی پھوپھی تھیں۔ میرے والد بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان کے بڑے بھائی بچپن میں فوت ہو چکے تھے۔ تین بڑی بہنیں تھیں، جو شادی شدہ اور صاحبِ اولاد تھیں۔ میری بڑی پھوپھی بیا گڑھ (چوبیس پرگنہ) میں

رہتی تھیں۔

میرے والد کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی بیوی چند سال کے بعد انتقال کر گئیں۔ ایک بیٹی تھی، اس کا بھی بچپن میں انتقال ہو گیا۔ میری والدہ سے ان کی دوسری شادی ہوئی۔

ہمارے نانا کا خاندان بہت بڑا تھا۔ ان کے تین بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ ان سب کا خاندان اسی علاقے (مانک تلہ) میں آباد تھا۔

والدہ کا انتقال

میری والدہ، میرے والد سے عمر میں چودہ پندرہ سال چھوٹی تھیں۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ ان کی پرورش بڑے ناز و نعم میں ہوئی تھی۔ وہ اس دور کی عام لڑکیوں کی طرح ان پڑھ نہ تھیں۔ ان کی تعلیم گھر پر ہوئی تھی۔ انھیں مذہبی کتابیں پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ لکھنا بھی جانتی تھیں۔ انھیں قرآن پاک کی تلاوت سے خاص شغف تھا۔ جب بھی موقع ملتا تلاوت کرتی رہتی تھیں۔ وہ نوجوانی ہی میں گٹھیا کے مرض میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا انھیں اکثر بیمار ہی دیکھا۔ غالباً ۱۹۴۵ء میں تقریباً ۳۰ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اللہ مغفرت فرمائے اور ان کی روح پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔ آمین۔

پیدائش اور ابتدائی تعلیم

میری پیدائش ۳ر جولائی ۱۹۳۷ء کو (میٹرک سرٹیفکیٹ کے مطابق) بمقام کلکتہ ہوئی۔ پانچ چھ سال کی عمر میں میں نے اسکول جانا شروع کیا۔ میری ابتدائی تعلیم میرے محلے (لالہ بگان، مانک تلہ) کے کارپوریشن پرائمری اسکول میں ہوئی۔ یہاں تیسری جماعت تک مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ اسکول ایک بڑی دو منزلہ عمارت میں قائم تھا۔ اس کے ایک حصے میں لڑکے پڑھتے تھے اور دوسرے حصے میں لڑکیاں۔ دونوں حصوں کا ٹیچنگ اسٹاف بھی الگ تھا اور آنے جانے کا گیٹ بھی۔ لڑکیوں کے سیکشن میں خواتین استانیاں پڑھاتی تھیں۔ بے بی کلاس سے تیسری جماعت تک چار

کلاسیں تھیں۔ ایک ہیڈ ماسٹر کے علاوہ تین ٹیچر تھے۔ ایک ''بابا'' تھے جو گھنٹی بجایا کرتے تھے۔ اسکول کا وقت صبح آٹھ بجے سے دوپہر بارہ بجے تک تھا۔

دسمبر ۱۹۴۶ء میں تیسری جماعت پاس کرنے کے بعد میں اس اسکول سے فارغ ہو گیا۔ یہ برطانوی حکومت کا آخری دور تھا۔ میں تینوں جماعتوں میں اوّل آتا رہا۔

''مومن ہائی اسکول'' (نارکل ڈانگا) کلکتہ

جنوری ۱۹۴۷ء میں چوتھی جماعت میں میرا داخلہ ''مومن ہائی اسکول'' میں ہو گیا۔ یہ اسکول ہمارے محلّے سے قریب ترین اسکول تھا جو تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھا۔ چوتھی جماعت میں پڑھتے ہوئے دو تین مہینے گزرے تھے کہ کلکتہ میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے اور ہمارا اسکول جانا منقطع ہو گیا۔ ہمارے محلّے سے اور بھی دو چار بچے اسکول جاتے تھے۔ انھوں نے بھی اسکول جانا چھوڑ دیا۔

میں نے اپنے محلّے کے غلام حسین ماسٹر سے ٹیوشن پڑھنا شروع کر دیا۔ ماسٹر صاحب نن میٹرک تھے اور قریبی محلّے کے پرائمری اسکول میں پڑھاتے تھے۔

میں نے ایک سال میں دو سال کا کورس پورا کر کے ۱۹۴۸ء میں دوبارہ ''مومن ہائی اسکول'' میں چھٹی جماعت میں داخلہ لیا۔ یہیں سے میں نے چھٹی اور ساتویں جماعت پاس کی اور جنوری ۱۹۵۰ء میں آٹھویں جماعت میں پہنچا ہی تھا کہ کلکتہ میں دوبارہ فسادات شروع ہو گئے اور سلسلۂ تعلیم منقطع ہو گیا۔

اس اسکول کی تعلیم اور اس کے بعض اساتذہ نے میرے سلسلۂ تعلیم میں ایک خاص کردار ادا کیا۔ چند اساتذہ کا ذکر کرتا ہوں۔

۱۔ محمد اسحٰق صاحب۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر، جو کلکتہ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔اے تھے۔

۲۔ اصفہانی صاحب۔ پورا نام مجھے یاد نہیں۔ اسکول میں اسی نام سے مشہور تھے۔ بی۔اے

پاس اور مالدار آدمی تھے۔ بغیر کسی تنخواہ کے صرف غریب مسلمان طلبا کی تعلیمی ترقی کے خیال سے اس اسکول سے وابستہ ہوگئے تھے۔ وہ اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر تھے۔ گورے چٹے خوب صورت بارعب آدمی تھے۔ ڈسپلن کی سختی سے پابندی کرواتے تھے۔ لڑکے ان سے بہت ڈرتے تھے۔

۳۔ عبداللہ صاحب۔ انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے فارسی میں آنرز اور ایم۔اے کیا تھا۔ دبلے پتلے، بہت سنجیدہ جوان آدمی تھے۔ علمی اور ادبی ذوق رکھتے تھے۔ شاعر بھی تھے۔ ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے۔ طلبا ان سے بہت متاثر تھے۔ (بعد میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے اسکول سیکشن کے ہیڈ ماسٹر ہوئے)۔

۴۔ شہاب الدین صاحب۔ انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے فارسی میں آنرز کیا تھا۔ ہمیں فارسی پڑھاتے تھے۔ بعد میں اسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہوئے۔

۵۔ حامد صاحب۔ بی۔اے پاس تھے۔ ہمیں تاریخ پڑھاتے تھے۔ بعد میں ڈھاکا آگئے اور کاروبار کرنے لگے تھے۔

۶۔ مولوی عبدالرشید۔ فاضل دیوبند، ہیڈ مولوی تھے۔ ہمیں دینیات پڑھاتے تھے۔ سفید داڑھی تھی۔ پڑھانے کا انداز بہت دلچسپ تھا۔

۷۔ صدیق صاحب۔ غالباً میٹرک پاس تھے۔ چھٹی جماعت تک حساب پڑھاتے تھے۔ ہر وقت ہاتھ میں چھڑی رہتی تھی۔ مارتے کم دھمکاتے زیادہ تھے۔ بچے انھیں "سنگ کا تگ" کہتے تھے۔

اس اسکول کے قریبی ساتھیوں میں منظور احمد، منظور حسین، عبدالاحد، سجاد حسین، غلام حسین وغیرہ تھے۔ بہت سے ساتھیوں کے نام اب یاد نہیں۔

فسادات اور ہجرت

جنوری ۱۹۵۰ء میں (جب میں آٹھویں جماعت میں پہنچا تھا) کلکتے میں ہندو مسلم فسادات شروع ہوگئے۔ اپنا علاقہ اور گھر بار چھوڑ کر کولوٹولہ (زکریا اسٹریٹ) پناہ لینی پڑی۔ لاکھوں

لوگ بے گھر ہو گئے۔ نتیجتاً ہجرت کا مرحلہ پیش آ گیا۔ میری بڑی بہن (زرینہ بیگم مرحومہ) کی شادی دو ہفتہ قبل ہی ہوئی تھی، رخصتی باقی تھی۔ والد مرحوم نے انھیں ان کے سسرال والوں (جو پارک سرکس میں رہتے تھے) کے حوالے کیا اور مجھے اور میرے چھوٹے بھائی (محمد رفیق مرحوم) کو ساتھ لے کر ۱۹۵۰ء کے وسط میں ڈھاکا آ گئے۔ اس وقت میری عمر چودہ سال کے قریب تھی۔

بچپن کی کچھ یادیں

☆ اللہ کا شکر ہے کہ جس مکان میں ہم بھائی بہنوں (دو بھائی، دو بہنیں۔ چھوٹی بہن خدیجہ کا چار پانچ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا) کی پرورش ہوئی، وہ ہمارا اپنا مکان تھا۔ یہ مکان نیم پختہ (جسے کلکتہ میں کھولا باڑی کہتے تھے) تھا، جو چھ کمروں پر مشتمل تھا۔ اندر کے حصے میں چار کمرے اور باہر کی طرف دو کمرے۔ دو کمروں میں ہم رہتے تھے اور چار کمرے کرایہ پر تھے۔ بعد میں باہر کا ایک کمرہ بیٹھک کے طور پر استعمال ہونے لگا تھا۔ کمروں کا کرایہ پانچ روپیہ سے دس روپیہ تک تھا۔

☆ میرے والد ایمبر ائیڈری کا کام کرتے تھے۔ کمائی بہت معمولی تھی، اس لیے گھر میں کچھ زیادہ خوش حالی نہ تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کے آخر میں جب بنگال میں قحط پڑا تو میرے والد کا کام تقریباً ختم ہو گیا اور وہ ایک فیکٹری میں کام کرنے لگے۔ ۱۹۴۷ء سے کپڑے کا معمولی کاروبار کرنے لگے۔

☆ ہمارے نانا کا ہماری پیدائش سے پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ ہماری نانی نے دوسرا نکاح کر لیا تھا۔ ہم اپنے سوتیلے نانا ہی کو اپنا نانا سمجھتے تھے۔ ہماری والدہ، نانی کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ وہ جب ہمارے یہاں آتیں تو کھانے کا بہت سا سامان لے کر آتی تھیں۔ وہ دن ہم بھائی بہنوں کے لیے عید کا دن ہو جاتا تھا۔ میری والدہ کے انتقال (۱۹۴۵ء) کے تقریباً تین سال کے بعد غالباً ۱۹۴۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اللہ مغفرت فرمائے!

☆ ہماری پیدائش سے پہلے ہمارے دادا کی وفات ہو چکی تھی۔ ہماری دادی کا انتقال ۱۹۴۶ء میں ہندو مسلم فساد کے دوران ہوا۔ ضعیفی کی وجہ سے ان کی کمر جھک گئی تھی۔ اللہ مغفرت فرمائے!

☆ ہوش سنبھالنے کے بعد (پانچ چھ سال کی عمر سے) جہاں تک مجھے یاد ہے میں ہمیشہ بہت سویرے (اکثر فجر کی اذان سے پہلے) اٹھ جاتا تھا۔ جب کہ گھر کے سب لوگ سوئے رہتے تھے۔ یہ میری فطری عادت اب تک برقرار ہے۔

☆ میں آٹھ نو سال کی عمر میں نماز کا پابند ہو گیا تھا۔ اسی عمر میں کبھی کبھی میں فجر کی اذان سے پہلے مسجد پہنچ جاتا تھا۔ کالج میں پڑھنے کے زمانے میں نماز کی پابندی برقرار نہ رہی (اللہ معاف کرے!)۔ دس سال کی عمر سے میں رمضان کے روزے بھی رکھنے لگا تھا۔

☆ میں بچپن میں بچوں کو جمع کر کے میلاد بھی پڑھا کرتا تھا اور چندہ کر کے مٹھائی تقسیم کرتا تھا۔ جب کچھ بڑا ہوا تو محلّے کے مشہور میلاد خواں مولوی منصور کے بیٹے مولوی سرور کے ساتھ میلاد پڑھنے جایا کرتا تھا۔ اس دور میں چند نعتیں بھی یاد کر لی تھیں، انھیں ترنم سے پڑھا کرتا تھا۔ رمضان کے مہینے میں بچوں کی ٹولی بنا کر رمضان کے قصیدے بھی پڑھتا تھا۔

☆ میں چوتھی جماعت میں تھا کہ اپنے ہم عمر بچوں کو جو مجھ سے نیچی کلاسوں میں تھے، پڑھانے لگا تھا۔ ہمارے مکان کے باہر کے ایک کمرے کو ہمارے والد نے ہم دونوں بھائیوں کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ ہمارے محلّے کے ماسٹر غلام حسین (یہ میرے والد کے ہم عمر بھی تھے اور ہم نام) ہمیں ٹیوشن پڑھاتے تھے۔ وہ ایک پرائمری اسکول کے ٹیچر تھے اور دور دور تک ٹیوشن پڑھانے جاتے تھے۔ ہم دونوں بھائیوں کے ساتھ آٹھ دس بچے بھی پڑھنے آجاتے تھے۔ ماسٹر صاحب نے مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ تم میرے آنے سے پہلے سب بچوں کو پڑھا دیا کرو۔ وہ دیر سے آتے اور سب بچوں کو چھٹی دے کر مجھے پڑھاتے۔

☆ اسی زمانے میں مجھے کتابیں لکھنے کا شوق بھی ہو گیا تھا۔ اردو کا قاعدہ اور اردو کی پہلی کتاب اپنے طور پر لکھی۔ اس زمانے میں میرا سب سے دلچسپ مشغلہ اخباروں اور رسالوں سے تصویریں کاٹ کر انھیں گتّے کے فریم میں لگانا تھا۔

☆ مجھے کھیل کود سے زیادہ رغبت نہ تھی۔ ہمارے گھر کے قریب ایک بڑا میدان تھا جس میں

شام کو (عصر اور مغرب کے درمیان) بچے فٹ بال کھیلتے تھے۔ میں بھی کبھی کبھی کھیل میں شامل ہو جاتا تھا۔ لیکن بڑے لڑکے مجھے کھیل سے نکال دیتے اور کہتے کہ اسے کھیلنا نہیں آتا۔ لہٰذا میں صرف کھیل دیکھنے پر اکتفا کرتا تھا۔ کبھی کبھی بڑوں کی ٹیم بھی کھیلنے آجاتی تھی۔ ان کا کھیل میں دلچسپی سے دیکھتا تھا۔

☆ اسکول میں سالانہ اسپورٹس ہوتا تھا لیکن میں نے کبھی اس میں حصہ نہیں لیا۔

☆ مجھے اسکول کی لائبریری سے کہانیوں کی کتابیں لاکر پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ہفتے میں تین کتابیں پڑھنے کو ملتی تھیں، میں ایک دو دن میں ان کتابوں کو ختم کرڈالتا تھا۔

☆ ہمارا اسکول (مومن ہائی اسکول) ہمارے گھر سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھا۔ ہم ہر روز پیدل اسکول جاتے اور آتے تھے۔ اسکول کا وقت صبح دس بجے سے چار بجے تک تھا ہمارے محلے سے کئی لڑکے ہمارے ساتھ اسکول جاتے تھے۔ لڑکیوں کا کوئی اسکول ہمارے علاقے میں نہ تھا۔ لڑکیاں عموماً پرائمری اسکول میں پڑھنے کے بعد گھر بیٹھ جاتی تھیں۔ ہمارے محلے میں کوئی شخص انٹر یا میٹرک پاس نہیں تھا۔ صرف دو گریجویٹ تھے۔ چار پانچ کلاس پڑھے ہوئے لوگوں کی بھی بڑی اہمیت تھی اور انھیں اچھی نوکری مل جاتی تھی۔

☆ اس پورے علاقے کے لوگ بھوجپوری زبان بولتے تھے۔ میں چار، پانچ سال کی عمر تک اردو نہیں بول سکتا تھا۔

☆ محلے کی عورتیں بنیے کی دکان سے یا محلے کے ہوٹل اور مٹھائی کی دکان سے چیزیں اکثر مجھ سے منگواتی تھیں۔ بعض مجھ سے خط بھی لکھواتی تھیں۔ نیاز، فاتحہ بھی مجھ سے دلواتی تھیں۔

☆ میرے والد اکثر اتوار کے دن ہم دونوں بھائیوں کو لے کر صاحب بگان، مُرغی بگان اور آس پاس کے دوسرے محلوں میں رشتہ داروں سے ملنے یا زکریا اسٹریٹ، دھرم تلہ اور ایڈن گارڈن وغیرہ گھومنے پھرنے لے جاتے تھے۔ کبھی کبھار چوبیس پرگنہ کے علاقوں کھردا اور ٹیٹا گڑھ وغیرہ اپنے رشتہ داروں کے یہاں لے جاتے۔ دو تین بار فلم دکھانے بھی لے گئے۔

☆ میں اپنی جماعت کے چھوٹے لڑکوں میں تھا اور سالانہ امتحان میں اکثر اوّل آتا تھا۔

ڈھاکا

اپریل ۱۹۵۰ء میں بحری جہاز سے ہم دونوں بھائی اپنے والد کے ساتھ چاٹگام پہنچے۔ وہاں ایک رشتہ دار کے یہاں ایک ماہ قیام کیا اور مئی کے آخر میں ڈھاکا آ گئے۔ یہاں ہمارے والد صاحب ایک رشتہ دار (ہماری پھوپھی زاد بہن اور بہنوئی) کے یہاں ہم دونوں بھائیوں کو چھوڑ کر کلکتہ چلے گئے۔ (اس وقت پاسپورٹ وغیرہ کی پابندی نہ تھی)۔

ڈھاکا میں میں خود کو بہت تنہا محسوس کرنے لگا۔ اسکول چھوٹ چکا تھا۔ سب ساتھی اور دوست چھوٹ چکے تھے۔ ہمارا قیام اکرام پور میں تھا۔ اس کے قریب ہی ستراپور بازار اور صدر گھاٹ تھا۔ کلکتہ کے مقابلے میں ڈھاکا ایک بے رونق قصبہ نظر آتا تھا۔ میں مکان کے چبوترے پر خاموش اور اداس بیٹھا رہتا تھا۔ شام کو اکثر صدر گھاٹ چلا جاتا تھا اور بوڑھی گنگا میں کشتیوں کو آتے جاتے دیکھتا رہتا تھا۔ بہن بہنوئی کے گھر کا ماحول بھی مجھے گھٹا گھٹا سا لگتا تھا۔ یہ چند مہینے میں نے بڑی بے بسی اور کرب میں گزارے۔ مجھے سب سے زیادہ غم اپنی تعلیم کے منقطع ہو جانے کا تھا۔ چھوٹا بھائی بھی اداس اداس رہتا تھا۔

میرے والد نومبر یا دسمبر ۱۹۵۰ء میں ڈھاکا واپس آ گئے اور نواب پور روڈ کی ایک گلی میں کرائے کا مکان لے کر ہم دونوں بھائیوں کے ساتھ منتقل ہو گئے۔ ہمارے ساتھ ایک بیوہ پھوپھی بھی تھیں۔

جنوری ۱۹۵۱ء میں میرے والد نے ہم دونوں بھائیوں کا داخلہ ''انجمن بوائز ہائی اسکول'' (گنڈیریا) ڈھاکا میں کروادیا، میرا داخلہ نویں جماعت میں اور چھوٹے بھائی کا داخلہ ساتویں جماعت میں ہوا۔

اسی سال کے آخر میں نواب پور کی گلی والے مکان سے ہم لوگ قریب ہی کے ایک محلّے جوگی نگر منتقل ہو گئے۔ اس مکان میں ہم لوگ تقریباً دس سال تک رہے۔

انجمن بوائز ہائی اسکول، ڈھاکا

انجمن بوائز ہائی اسکول سے میں نے ۱۹۵۳ء میں میٹرک پاس کیا۔

یہ اسکول ایک بڑے دو منزلہ عمارت میں قائم تھا۔ صرف اوپر کے حصے میں کلاسیں ہوتی تھیں۔ اس عمارت کی دوسری طرف گرلز ہائی اسکول تھا۔ یہ اسکول ''انجمن مفید الاسلام'' کی طرف سے قائم کیا گیا تھا۔ اسکول کی عمارت بڑی پرانی اور خستہ حال تھی۔ انتظامی معاملات بھی درست نہ تھے۔

اس اسکول کے اساتذہ میں حسب ذیل قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ محمد اسحٰق صاحب۔ مومن ہائی اسکول کلکتہ میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ ۱۹۵۰ء میں ڈھاکا آگئے اور اس اسکول میں ہیڈ ماسٹر مقرر کیے گئے۔ ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے۔

۲۔ عبدالودود صاحب۔ اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر، بی۔اے تھے، پرانے ٹیچروں میں تھے۔ انگریزی پڑھاتے تھے۔ پان بہت کھاتے تھے۔

۳۔ ظہیر اللہ صاحب۔ بی۔اے پاس پرانے ٹیچر تھے ہمیں تاریخ پڑھاتے تھے۔ (ڈاکٹر مظفر الدین ندوی کے بڑے بھائی تھے)۔ سگریٹ بہت پیتے تھے۔

۴۔ مولوی عبدالرشید۔ فاضلِ اُردو تھے۔ انھیں اردو قواعد پر بڑا عبور تھا۔ ہمیں اردو پڑھاتے تھے۔ بعد میں ان کا تقرر نواب پور گورنمنٹ ہائی اسکول میں ہو گیا تھا۔ یہاں انھوں نے پروفیسر نظیر صدیقی کے اشتراک سے اردو قواعد کی اک کتاب بھی لکھی تھی جو ڈھاکا کے اسکولوں میں رائج تھی۔

۵۔ مولوی محمد عثمان شمسی۔ ہمیں اُردو پڑھاتے تھے۔ بعد میں ان کا تقرر رامنی ٹولہ گورنمنٹ ہائی اسکول میں ہو گیا۔

۶۔ حافظ علیم الدین۔ ہمیں فارسی پڑھاتے تھے۔

۷۔ التفات حسین۔ نوجوان بی۔ ایس۔ سی پاس ٹیچر تھے۔ غالباً حساب پڑھاتے تھے۔ بعد میں کسی سرکاری محکمے میں ملازمت کرلی۔

اس اسکول کے قریبی ساتھیوں میں محمد حفیظ، اظہار الحق مرحوم، علیم الدین مرحوم، محمد وسیع عالم، منور حسین وغیرہ تھے۔ بہت سے نام میں بھول گیا ہوں۔

والد کی وفات

میرے والد صاحب ڈھاکا آنے کے بعد اپنے بچپن کے دوست نور محمد صاحب کے ایمبرائیڈری کے کارخانے میں کام کرنے لگے تھے۔ یہاں وہ ہاضمے کی خرابی کے مستقل مریض بن گئے تھے، لیکن اسی حالت میں کام کاج بھی کرتے رہے۔ ۱۳ رجون ۱۹۵۲ء کو کئی ماہ تک بستر علالت پر رہنے کے بعد انتقال کر گئے۔ اللہ مغفرت فرمائے اور ان کی روح پر اپنی رحمتیں نازل کرے! آمین۔

والد کی وفات کے بعد کارزار حیات میں میں تنہا رہ گیا۔ چھوٹے بھائی کی ذمہ داری بھی مجھ پر آ گئی۔ بڑی بے بسی اور کسمپرسی کا عالم تھا۔ پھوپھی نے لیکن ساتھ نہ چھوڑا۔ ان کی تین بیٹیاں شادی شدہ اور اپنے اپنے گھروں میں خوش حال تھیں۔ ان کا انتقال ایک عرصے کے بعد ۱۹۷۳ء میں ہوا۔ اللہ مغفرت فرمائے!

والد کی وفات کے وقت میں دسویں جماعت میں تھا۔ رشتہ داروں نے میری ڈھارس بندھائی اور مجھے تعلیم جاری رکھنے کا حوصلہ دیا۔ بہر حال میں اسکول جانے لگا اور مارچ ۱۹۵۳ء میں میٹرک کا امتحان دینے کے بعد میں اسکول سے فارغ ہو گیا۔

میٹرک کا امتحان دینے کے بعد میں نے میٹرک کے کورس میں شامل انگریزی ناول (دی ویکار آف ویکفیلڈ) کا مکمل ترجمہ کر ڈالا اور کمرشیل کالج میں داخلہ لے کر ٹائپنگ بھی سیکھ لی کہ شاید ملازمت میں کام آئے لیکن اس کی نوبت نہ آئی۔

انٹر میں داخلہ اور میری بیماری

میٹرک پاس کرنے کے بعد میں نے سینٹ گریگوری کالج، ڈھاکا کے نائٹ سیکشن میں

انٹر آرٹس میں داخلہ لیا لیکن ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے کہ گوناگوں پریشانیوں اور تفکرات کی وجہ سے میں سخت بیمار پڑ گیا اور کئی ماہ تک بستر پر پڑا رہا۔ اس طرح ایک سال کے لیے تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

مجھے دراصل ٹی بی ہو گئی تھی جو تیسرے اسٹیج تک پہنچ چکی تھی۔ مجھے کئی سال تک مسلسل اپنا علاج کرانا پڑا، چار پانچ سال کے علاج کے بعد اللہ کا شکر ہے کہ مجھے اس جان لیوا بیماری سے مکمل طور پر شفا حاصل ہوئی۔ اس بیماری کے دوران میں اپنا سب کام کاج کرتا اور تعلیم بھی حاصل کرتا رہا۔ اس زمانے میں میرے بعض رشتہ داروں نے دامے، درمے، سخنے میری مدد بھی کی۔ اللہ ان سب کو جزائے خیر سے نوازے!

سر سلیم اللہ امپیریل انٹرمیجیٹ کالج، ڈھاکا

۱۹۵۴ء میں میں نے سر سلیم اللہ امپیریل انٹرمیجیٹ کالج (نائٹ) میں داخلہ لیا۔ وہیں سے میں نے ۱۹۵۶ء میں انٹر آرٹس کا امتحان سیکنڈ ڈویژن سے پاس کیا۔

یہ کالج نواب آف ڈھاکا سر سلیم اللہ (جو مسلم لیگ کے بانیوں میں تھے) کے نام پر تھا اور ایک بڑی عمارت میں قائم تھا۔ اوپر کے حصے میں کالج تھا اور نیچے ہائی اسکول۔ یہ نائٹ کالج تھا اور عموماً ملازمت کرنے والے طلبا اس میں داخلہ لیتے تھے۔

اس کالج کے پرنسپل، وائس پرنسپل اور اکثر اساتذہ ہندو تھے۔ حسبِ ذیل اساتذہ قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ پروفیسر نرائن بابو۔ یہ بڑے متعصب پروفیسر تھے۔ تاریخ میں ایم۔اے تھے۔ ہمیں اسلامی تاریخ پڑھاتے تھے۔ لیکچر کے دوران مسلمانوں پر طنز بھی کرتے جاتے تھے۔

۲۔ پروفیسر گوپال۔ یہ ہمیں معاشیات پڑھاتے تھے اور بڑے خوش مزاج تھے۔

۳۔ پروفیسر پانڈے۔ لمبے چوڑے ادھیڑ عمر آدمی تھے۔ صبح کو ڈھاکا ہائی کورٹ میں وکالت کرتے تھے اور رات کو پڑھاتے تھے۔ یہ ہمارے انگریزی کے پروفیسر تھے۔ انھوں نے کورس میں

شامل انگریزی ناولوں اور ڈراموں کے نوٹس بھی لکھے تھے جن سے طلبا استفادہ کرتے تھے۔

۴۔ پروفیسر بجنوؔ جعفری۔ ہمارے اردو کے استاد تھے۔ اردو اور عربی میں ایم۔اے تھے۔ چھوٹے قد کے خوب صورت اور ادھیڑ عمر آدمی تھے۔ مزاج میں نرمی تھی، شاعر بھی تھے۔

اسکول میں ملازمت

۱۹۵۵ء میں ''آئیڈیل پرائمری اسکول'' میں بحیثیت ٹیچر میرا تقرر ہو گیا۔ یہ اسکول ڈھاکا کے پرائمری اسکولوں میں سب سے زیادہ اہم اور مشہور تھا۔ اس میں اردو اور بنگلہ دونوں سیکشن تھے اور بچے اور بچیاں دونوں پڑھتے تھے۔ یہ اسکول ڈھاکا سکریٹریٹ کے سامنے شگون باغیچہ (بستی کا نام) میں واقع تھا۔ دور دور سے بچے اور بچیاں یہاں پڑھنے آتے تھے۔

یہ عجیب بات ہے کہ مستقبل میں گلوکارہ کی حیثیت سے شہرت پانے والی دو بچیاں اسی اسکول میں پڑھتی تھیں۔ مُنّی بیگم اردو سیکشن میں اور شہناز بیگم بنگلہ سیکشن میں۔ شہناز بیگم نے اسی دور میں اسکول کی تقریبات میں گانا شروع کر دیا تھا۔

یہ اسکول میرے حالات کو سدھارنے اور حصولِ تعلیم میں بڑا معاون ثابت ہوا۔ اسی اسکول میں پڑھاتے ہوئے ا□⊙ں نے انٹر، بی۔اے اور ایم۔اے کے امتحانات پاس کیے اور ۱۹۶۱ء میں یہاں سے نکل کر جگن ناتھ کالج میں بحیثیت لیکچرار پہنچ گیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں اسکول کے بچوں اور بچیوں میں بہت مقبول تھا۔ سات سال کی ملازمت میں نے اس اسکول میں بڑی نیک نامی سے مکمل کی۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر (جو بنگالی تھے) کے بقول میں اسکول کا بہترین ٹیچر تھا۔

جگن ناتھ کالج، ڈھاکا

۱۹۵۶ء میں انٹر پاس کرنے کے بعد میں نے جگن ناتھ کالج نائٹ سیکشن میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۸ء میں اسی کالج سے بی۔اے پاس کیا۔

یہ کالج ''جگن ناتھ'' نامی کسی ہندو راجا کا قائم کردہ تھا۔ اس کی عمارت بڑی شاندار اور

احاطہ بہت وسیع تھا۔ یہ کالج غالباً مشرقی پاکستان کا سب سے بڑا کالج تھا۔ یہاں طلبا کئی ہزار اور اساتذہ کئی سو تھے۔ ذیل میں چند اہم اساتذہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ پروفیسر عباس مشہدی۔ (ایم۔اے اردو، ایل ایل بی) ہمیں اردو پڑھاتے تھے۔ بعد میں ڈھاکا ہائیکورٹ میں وکالت کرنے لگے۔

۲۔ پروفیسر معز الدین (ایم۔اے اردو، ایم۔اے فارسی)۔ اردو پڑھاتے تھے۔ بعد میں ڈھاکا یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد وہیں شعبۂ اردو و فارسی سے منسلک ہوگئے۔ ایک بار وہ ایک یا دو ماہ کے لیے چھٹی پر چلے گئے تو ان کی جگہ پروفیسر نظیر صدیقی نے پڑھایا۔

۳۔ پروفیسر اظہر قادری (ایم۔اے اردو)۔ اُردو پڑھاتے تھے۔

۴۔ پروفیسر بھدرو بابو (ایم۔اے انگلش)۔ ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے۔ ''بھدرو'' کے معنی ''شریف'' ہوتے ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں ایک شریف انسان تھے۔ کالج کے پرانے لیکچروں میں تھے۔

۵۔ پروفیسر عبدالمتین (ایم۔اے انگریزی)۔ انگریزی ڈراما پڑھاتے تھے۔ انھیں ڈراموں میں کام کرنے کا شوق بھی تھا۔ ڈھاکا برٹش کونسل کے کئی ڈراموں میں کردار ادا کیے۔

دوسرے پروفیسروں کے نام یاد نہیں۔ اس کالج کے ساتھیوں میں سے اب کسی کا نام بھی یاد نہیں رہا۔

میری مصروفیات اور ادبی سرگرمیاں

۱۹۵۸ء میں، میں نے جگن ناتھ کالج، ڈھاکا سے بی۔اے پاس کیا۔ اس دوران (میٹرک سے بی۔اے تک) میری صحت مسلسل خراب رہی۔ اس کے باوجود میا□ اسکول میں پڑھاتا بھی رہا۔ ٹیوشن بھی کرتا رہا۔ اپنے چھوٹے بھائی کے تعلیمی اور دیگر اخراجات بھی پورے کرتا رہا۔ نائٹ کالجوں میں تعلیم بھی حاصل کرتا رہا۔ اس چکی کی مشقت کے ساتھ مشقِ سخن بھی جاری رہی۔ اخباروں اور رسالوں (خاص طور پر بچوں کے رسالوں) میں میری نظمیں اور کہانیاں بھی چھپتی

رہیں۔ علمی اور ادبی کتابوں کا مطالعہ بھی جاری رہا۔ مجھے خود بھی حیرت ہوتی ہے کہ اپنی کمزور صحت کے باوجود اتنے سارے کام کیسے کرتا رہا۔

افسوس ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۸ء تک میں نے جو کچھ لکھا وہ سب ضائع ہو گئے۔ میں اس دور کا کلام محفوظ نہ رکھ سکا۔

ڈھاکا یونیورسٹی

۱۹۵۸ء میں، میں نے ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں داخلہ لیا۔ یونیورسٹی کے دل کشا علمی ماحول اور شعبۂ اردو و فارسی کے خوش گوار تعلیمی فضا نے میرے قلب و ذہن پر بڑے اچھے اور دور رس اثرات مرتب کیے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی، ڈاکٹر ظفر الہدیٰ، ڈاکٹر حنیف فوق اور پروفیسر فیض احمد چودھری جیسے نامور اور قابل اساتذہ سے حصول فیض کا موقع ملا۔ ۱۹۶۰ء میں ایم۔ اے کرنے کے بعد ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۳ء تک میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے شعبۂ اردو و فارسی سے منسلک رہا۔ میرا موضوع "۱۸۵۷ء کے بعد اردو شاعری کے میلانات" تھا۔ ڈاکٹر شادانی میرے گائیڈ تھے۔ لیکن بعض وجوہ سے میں یہ کام مکمل نہ کر سکا۔

• یونیورسٹی کے اساتذہ اور ساتھی طلبا و طالبات کو میں کبھی نہ بھول سکا۔

ادبی نشو و نما

میٹرک پاس کرنے کے بعد سے ایم۔ اے تک (۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۰ء تک) میرا اہم تعلیمی دور تھا۔ اسی دور میں میری ادبی نشو و نما بھی ہوئی۔ اس دور میں ڈھاکا کی ادبی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ (تفصیل کے لیے میری کتاب "محفل جو اجڑ گئی" دیکھی جا سکتی ہے)۔ آئے دن مشاعرے، مذاکرے اور ادبی نشستیں ہوتی رہتی تھیں۔ وحشت، شادانی، تمنا عمادی اور آصف بنارسی جیسے اساتذہ موجود تھے۔ ان کے تلامذہ کی ایک بڑی تعداد تھی۔ یو۔ پی، بہار اور کلکتہ کے چیدہ چیدہ اہلِ قلم کا اجتماع تھا اور روز بروز اس میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور یہ محفل ان کے نور سے جگمگا رہی تھی۔

اردو اخبار اور رسالوں میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ امن و امان کا دور تھا۔ چیزیں ارزاں تھیں۔ کم آمدنی والے بھی اطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس پُر سکون اور خوش گوار ماحول میں میری ادبی نشوونما ہوئی۔

سیاسی دلچسپیاں

اس دور میں کچھ سیاسی دلچسپیاں بھی پیدا ہوئیں۔ ڈھاکا کے تاریخی پلٹن میدان میں جتنے سیاسی جلسے ہوئے، میں ان میں شریک ہوتا اور قائدین کی تقریریں بڑے شوق سے سنتا۔ وہیں میں نے پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خاں، خواجہ ناظم الدین۔ آغا خاں سوئم، ملک فیروز خاں نون، نورالامین، حسین شہید سہروردی، (مولانا) بھاشانی، سردار عبدالرب نشتر، خان عبدالقیوم خان، سید قاسم رضوی، سید ابوالاعلیٰ مودودی، احتشام الحق تھانوی، ظفر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع، فضل القادر چودھری، ابو حسین سرکار اور عطاء الرحمن خاں وغیرہ کی تقریریں سنیں۔ میں بنگلہ زبان میں کی گئی تقریریں بھی اچھی طرح سمجھ لیتا تھا۔ میں اس زمانے میں جماعتِ اسلامی اور امیر جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی سے بہت متاثر تھا۔

مطالعہ

مجھے بچپن سے مطالعے کا بہت شوق تھا۔ شروع میں بچوں کی کہانیوں کی کتابیں اسکول لائبریری سے لا کر پڑھتا تھا۔ نویں، دسویں جماعت میں تھا تو ناول، افسانے اور اخبار و رسائل پڑھنے لگا تھا۔ اس زمانے میں انجمن ترقی اردو کی لائبریری نواب پور روڈ کی ایک پرانی عمارت کی اوپری منزل میں تھی۔ اختر لکھنوی لائبریرین تھے۔ میں وہاں جا کر گھنٹوں اخبار اور رسالے پڑھا کرتا تھا۔

کالج کی طالب علمی کے زمانے میں مذہبی اور سنجیدہ کتابیں بھی پڑھنے لگا۔ اس دور میں جماعتِ اسلامی کے کارکن بڑے مخلص اور دین دار ہوتے تھے۔ ان سے امیر جماعت سید ابوالاعلیٰ

مودودی کی کتابیں پڑھنے کو ملتی رہیں۔ دینی کتابوں کے علاوہ شعری اور افسانوی مجموعے اور ناول بکثرت پڑھے۔ نسیم حجازی کے ناول میں بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ لیکن ابن صفی کے جاسوسی ناول (''جاسوسی دنیا'' اور ''عمران سیریز'') پڑھنے میں جو لطف ملتا تھا وہ بیان سے باہر ہے۔ ابن صفی کے دونوں سیریز کے دو ناول ہر ماہ مارکیٹ میں آجاتے تھے۔ یہی ناول ہیں جو میں خرید کر پڑھتا تھا۔

تمام اہم ادبی رسالے جو کراچی اور لاہور سے شائع ہوتے تھے، پڑھتا رہا۔ بعد میں ''نقوش'' بھی پابندی سے خریدنے لگا تھا۔ بچوں کے بعض رسالے بھی ہر ماہ خریدتا اور ان میں میری نظمیں اور کہانیاں بھی شائع ہوتی تھیں۔

ڈھاکے کی لائبریریوں سے میں نے بھرپور استفادہ کیا۔ انجمن ترقی اردو کی لائبریری میرے لیے بڑی کارآمد ثابت ہوئی۔ وہاں میں بیٹھ کر گھنٹوں اخبارات اور رسائل کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ بعد میں ڈھاکا یونیورسٹی لائبریری، سینٹرل پبلک لائبریری، پاکستان کلچرل سینٹر لائبریری، برٹش انفارمیشن سینٹر لائبریری، امریکن لائبریری اور ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری سے استفادہ کرتا رہا۔

کالج کی ملازمت کے دوران میں ہر ماہ متعدد کتابیں اور رسالے خریدنے لگا تھا۔ ۱۹۷۱ء تک میری ایک ذاتی لائبریری وجود میں آگئی تھی جس میں کئی سو کتابیں تھیں۔ رسائل اس کے علاوہ تھے۔ ''نقوش'' کے تمام اہم نمبر میرے پاس موجود تھے۔

کالجوں میں درس وتدریس

۱۹۶۱ء میں ''ہولی کراس کالج'' (جس میں دولت مند اور اونچے گھرانوں کی لڑکیاں پڑھتی تھیں، ہوسٹل بھی تھا) اور جگن ناتھ کالج (نائٹ سیکشن) میں مجھے جز وقتی ملازمت مل گئی۔ کچھ عرصہ تولارام کالج، نرائن گنج اور سینٹرل ویمن کالج، ڈھاکا میں بھی پڑھایا۔ یہ سب ملازمتیں جز وقتی تھیں۔

۱۹۶۳ء میں پروفیسر ارشد کاکوی کا انتقال ہوگیا۔ ان کی جگہ جگن ناتھ کالج (ڈے سیکشن) میں مجھے مستقل ملازمت مل گئی۔ (اس کے بعد ہولی کراس کالج کی جز وقتی ملازمت چھوڑ دی)۔

۱۹۶۸ء میں حکومت نے جگن ناتھ کالج کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اس طرح میں بغیر کسی خواہش کے سرکاری ملازم ہو گیا۔

شادی

۲۷ راکتوبر ۱۹۶۳ء کو (جس دن جنرل ایوب خاں کا پانچواں یومِ انقلاب منایا جا رہا تھا) میری شادی عزیز احمد جعفری مرحوم کی صاحب زادی ثریا بیگم سے ہوئی۔ اہلیہ سے کبھی مزاج و خیال میں ہم آہنگی اور موافقت پیدا نہ ہو سکی۔ پھر بھی نباہ ہو گئی۔ (اب تو زندگی کی شام ہو چکی ہے۔ کسی وقت بھی کوچ کا نقارہ بج جائے گا۔)

تصنیف و تالیف

۱۹۶۴ء میں، میں نے اپنی کتاب "اردو ادب اور اسلام" لکھنے کا آغاز کیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ جائزہ ڈیڑھ دو سو صفحات میں مکمل ہو جائے گا لیکن بڑھتے بڑھتے ۹۰۰ صفحات ہو گئے۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب تھی جس میں پورے اردو ادب کا جائزہ اسلام کی روشنی میں لیا گیا تھا۔ اس کتاب کی تحریر میں چار سال لگ گئے۔ اسلامک پبلی کیشنز لمیٹیڈ، لاہور نے اس کتاب کو دو جلدوں میں شائع کیا۔ پہلی جلد دسمبر ۱۹۶۸ء میں اور دوسری جلد ۱۹۷۰ء کے آغاز میں شائع ہوئی۔

ناول نگاری

اس دوران میں نے ایک اصلاحی ناول "اپنے لہو کی آگ میں" لکھا، جسے ۱۹۷۰ء میں شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور نے شائع کیا۔

اس ناول کی اشاعت کے بعد میں نے دو مختلف موضوعات پر دو ناول لکھنا شروع کیے۔ دونوں ناولوں کا تقریباً آدھا حصہ ہی لکھا گیا تھا کہ ۱۹۷۱ء کے ہنگامے شروع ہو گئے اور یہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔

بیچ سے سلسلۂ رنج و الم توڑ دیا
تیرے عاشق نے جوانی ہی میں دم توڑ دیا
(آصف بنارسی)

تنقیدی مضامین

''اُردو ادب اور اسلام'' سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۱ء تک میرے تنقیدی مضامین ماہنامہ ''فاران'' کراچی (مدیر: ماہر القادری مرحوم)، ماہنامہ ''جامِ نو'' کراچی (مدیر: مظہر خیری مرحوم) اور ماہنامہ ''سیارہ'' لاہور (مدیر نعیم صدیقی مرحوم) میں مسلسل شائع ہوتے رہے۔ ماہر القادری مجھ پر بہت مہربان ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی کوئی عنوان دے کر اور فرمائش کر کے مجھ سے مضمون لکھواتے تھے۔ ''سیارہ'' لاہور میں میری نظمیں بھی شائع ہوتی رہیں۔

سقوطِ ڈھاکا اور دوسری ہجرت

زندگی پُرسکون انداز میں گزر رہی تھی اور لکھنے پڑھنے کا کام بھرپور انداز میں جاری تھا کہ ۱۹۷۱ء کے ہنگامے شروع ہو گئے جو ۱۶؍دسمبر ۱۹۷۱ء کو سقوطِ ڈھاکا کی صورت میں انجام پذیر ہوئے۔ (تفصیلی روداد کتاب کے مقدمے میں پیش کی جا چکی ہے)۔ اس انقلاب نے میری زندگی کے تمام تار و پود بکھیر کر رکھ دیے۔ کئی سال تک دربدری اور کسمپرسی کا عالم رہا اور آخر کار دوسری ہجرت کے مرحلے سے گزرنا پڑا۔ (اس دور میں جو نظمیں میں نے لکھی تھیں ان کا مجموعہ ''متاعِ درد'' کے نام سے کراچی سے شائع ہوا۔)

الحرا کالج برائے خواتین، کراچی

''الحرا کالج برائے خواتین'' کراچی میں گیارہ سال تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ کالج کی لائبریری میں دینی کتب کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ اس سے خوب استفادہ کیا اور اپنی بعض تصانیف کے لیے مواد بھی جمع کیے۔ میں کالج کی انتظامیہ اور خاص طور پر قیصر جمیل صاحب (سکریٹری ادارہ) کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے لکھنے پڑھنے کے مواقع فراہم کیے۔

اولاد

اللہ نے مجھے پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں عطا کیں۔ میری تنگ دستی اور بے سروسامانی کی وجہ

سے بڑے بچوں کی تعلیم و تربیت بہت متاثر ہوئی۔ بہر حال ان کی شادی کے مراحل بھی آ گئے۔ دونوں بڑے بیٹوں عابد رشید اور خالد رشید کی شادی ہوئی۔ ان سے چھوٹی تین بیٹیوں نوشابہ رشید، ثمینہ رشید اور صائمہ رشید کی شادی کے فرض سے بمشکل سبک دوش ہوا۔ شادی کے بعد بھی چین نہ ملا۔ ان کے معاملات و مسائل نے دل و جگر کا خون کر دیا۔

چوتھا بیٹا شاہد رشید ۶ سال تک بیمار رہنے کے بعد ۲۰۰۵ء میں ہمیں داغ مفارقت دے گیا۔ اللہ مغفرت فرمائے۔ اس لڑکے کی طویل بیماری نے مجھے بلڈ پریشر کا مستقل مریض بنا دیا۔

تیسرے بیٹے زاہد رشید نے اسلامک اسٹڈیز میں ایم۔اے کیا۔ گزشتہ کئی سالوں سے اسکول میں پڑھا رہا ہے۔ اس لڑکے کو لکھنے پڑھنے کا بھی شوق ہے۔ اس کے تبصرے، مضامین اور افسانے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اب یہ لڑکا اُردو میں بھی ایم۔اے کر رہا ہے۔ اس سے چھوٹی بیٹی حمیرا رشید نے بی۔اے کیا ہے۔ سب سے چھوٹے بیٹے ساجد رشید نے معاشیات میں ایم۔اے کیا ہے۔ اب ملازمت کی تلاش میں ہے۔ اللہ اسے کامیاب کرے!

ایک دیرینہ آرزو کی تکمیل

اللہ تعالیٰ کا بے پایاں شکر ہے کہ اس نے اپنے اس عاجز و ناتواں بندے کو ان آخری ایام میں فکرِ معاش سے آزاد کر دیا ہے۔ گزشتہ چودہ پندرہ سال سے میرا کام سوائے لکھنے پڑھنے کے اور کچھ نہیں۔ کتابیں متواتر شائع ہو رہی ہیں۔ یہ میری زندگی کی دیرینہ آرزو تھی جسے مولائے کریم نے پورا کر دیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اسی طرح لکھتے پڑھتے ایمان اور عافیت کے ساتھ اس دنیا سے اٹھا لے!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَ تُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔

آمین۔!

ہارون الرشید

۳۱ر اکتوبر ۲۰۱۱ء

مصنف کی مطبوعہ کتابیں

۱۔اردو ادب اور اسلام (جلد اوّل)	۱۹۶۸ء	اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور
۲۔اردو ادب اور اسلام (جلد دوم)	۱۹۷۰ء	اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور
۳۔اپنے لہو کی آگ میں (ناول)	۱۹۷۰ء	شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور
۴۔طوبیٰ (حمد، نعت، منقبت)	۱۹۹۵ء	ہارون اکیڈمی، کراچی
۵۔محفل جو اجڑ گئی (تاریخ و تذکرہ)	۲۰۰۲ء	زین پبلی کیشنز، کراچی
۶۔متاعِ درد (شعری مجموعہ)	۲۰۰۳ء	حلقۂ آہنگِ نو، کراچی
۷۔ملّتِ واحدہ	۲۰۰۵ء	میڈیا گرافکس، کراچی
۸۔نیاز فتح پوری کے مذہبی افکار	۲۰۰۵ء	میڈیا گرافکس، کراچی
۹۔اُردو کا دینی ادب	۲۰۰۶ء	میڈیا گرافکس، کراچی
۱۰۔اُردو کا دینی ادب (دوسرا ایڈیشن)	۲۰۱۰ء	الرحمن پبلشنگ ٹرسٹ، کراچی
۱۱۔نقوش سارے (کلیات)	۲۰۰۸ء	میڈیا گرافکس، کراچی
۱۲۔اُردو کا جدید نثری ادب	۲۰۰۹ء	میڈیا گرافکس، کراچی
۱۳۔تحقیق و اجتہاد (مضامین)	۲۰۰۹ء	الرحمن پبلشنگ ٹرسٹ، کراچی
۱۴۔جدید اُردو شاعری۔تاریخ و تنقید	۲۰۱۰ء	میڈیا گرافکس، کراچی
۱۵۔محبتِ صحابہ کرامؓ	۲۰۱۰ء	الرحمن پبلشنگ ٹرسٹ، کراچی
۱۶۔دین و دانش (مضامین)	۲۰۱۰ء	الرحمن پبلشنگ ٹرسٹ، کراچی
۱۷۔اُردو کا قدیم ادب	۲۰۱۱ء	میڈیا گرافکس، کراچی
۱۸۔دو ہجرتوں کے اہلِ قلم	۲۰۱۲ء	میڈیا گرافکس

غیر مطبوعہ کتابیں

۱۔نوائے مشرق (سابق مشرقی پاکستان کے ان اہلِ قلم کا تفصیلی تذکرہ جو وہیں سپردِ خاک ہوئے)

۲۔شعروادب (تنقیدی مضامین)

۳۔غلام احمد پرویز کے افکار و نظریات (بے لاگ جائزہ)

۴۔ہمارا معاشرہ اور اسلامی شریعت

۵۔آواز دے کے دیکھ لو! (شعری مجموعہ)

پروفیسر ہارون الرشید

تاریخ پیدائش: ۳؍جولائی ۱۹۳۷ء

تعلیم: ایم۔اے (اُردو)

پیشہ: درس و تدریس

ہارون صاحب سے جو لوگ واقف ہیں، جو ان سے مل چکے ہیں اور ملتے رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کی شخصیت کتنی نرم، متین اور دلآویز ہے۔ آپ کو وہ مرعوب نہیں کریں گے۔ آپ ان سے متاثر ہوں گے۔ ان کی کھلنساہٹ سے بعض لوگ مرعوب ہی ہو جائیں تو بات دوسری ہے لیکن متاثر غالباً ہر شخص ہوگا۔

پروفیسر فروغ احمد

پروفیسر ہارون الرشید بازار ادب کی ہماہمی اور گہما گہمی سے دور ایک گوشے میں بیٹھ کر پرورشِ لوح و قلم میں مصروف ہیں۔ وہ یہ خدمت عبادت کی طرح انجام دے رہے ہیں۔ شہرت کے قائل اور تعلقات عامہ کے عامل ان سے واقف نہیں۔ جو لوگ ان سے واقف ہیں وہ ان کے ادبی کام کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

وہ زندگی اور ادب کے بارے میں ایک خاص نظریہ رکھتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنی نگارشات میں نظریاتی استقامت کے ساتھ ساتھ فنی لوازم اور جمالیاتی اقدار کا بھی بدرجۂ اتم خیال رکھا ہے۔

پروفیسر علی حیدر ملک

پروفیسر ہارون الرشید کثیر الجہات قلم کار ہیں۔ لیکن ان کی اصل پہچان ان کے وہ تحقیقی، نظری اور تجزیاتی مطالعے ہیں جو گفتگو اور تحریر کا حوالہ بنتے ہیں۔ مثلاً "اردو کا دینی ادب"، "محفل جو اجڑ گئی"، "نیاز فتح پوری کے مذہبی افکار" اور "اردو ادب اور اسلام"۔ ان وقیع کتابوں میں ان کی تحقیق، محنت، زاویہ نظر اور تخلیقی جوہر کے عناصر پوری طرح اجاگر ہوتے ہیں اور جن سے قلب و ذہن کو روشنی ملتی ہے۔

پروفیسر ہارون الرشید آج کے عام رواج کے مطابق تعلقات عامہ کے داؤ پیچ پر یقین نہیں رکھتے، نہ شہرت کے حصول کے لیے کسی جائز یا ناجائز ذرائع کو بروئے کار لاتے ہیں۔ وہ اپنی عزلت نشینی میں سنجیدگی سے کام کرتے رہنے پر یقین رکھتے ہیں اور اپنی تحریروں کی قبولیت سے روحانی اطمینان و انبساط حاصل کرتے ہیں۔

اے خیام

پروفیسر ہارون الرشید نعل در آتش محقق اور نقاد ہیں۔ ان کی تحریریں ادبی محاسن سے مزین اور ان کے گہرے مطالعے کی غماز ہیں۔

پروفیسر صاحب کی یہ کتابیں عالمانہ شان اور اعلیٰ قدر و قیمت کی حامل ہیں۔ اس نوعیت کا کام اردو میں کمیاب ہے۔ اس کے لیے پتہ مارنا پڑتا ہے۔ مجموعی طور پر پروفیسر ہارون الرشید کا ادبی و تحقیقی کام ہمارے ادب کا یادگار سرمایہ ہے اور اردو ادب کے ہر قاری کے لیے ان کتب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

ڈاکٹر اسد فیض

پروفیسر صاحب ایک اچھے ادیب و شاعر ہی نہیں ایک مخلص اور نیک انسان بھی ہیں۔ ان کا ایک خاص نظریۂ زیست ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنے افکار و خیالات کسی پر زبردستی نہیں تھوپتے۔ خاص طور پر وہ لکھتے وقت تمام تر تعصبات سے بالاتر ہوتے ہیں۔

انور فرہاد